

VERS



روح کلام غائب

المعروف بہ

تفسیر کلام غائب

یعنی مرزا اسد اللہ خاں غائب کے اردو دیوان کی تفسیر
مصنفہ مرزا عزیز بیگ لکھنؤ مرزا سہارن پوری شاگرد حضرت زان بہار پوری اشد تلامذہ مرزا غا

جن سہی

مرزا ظفر بیگ صاحب بہار پوری

نظارۂ اجماعی قرین بدایہ طبع ہوا



(محمد احمید الدین پرنٹر)

۶۱۹ ۳۵

فی جلد دوم

ایک ہزار جلد

پوچھتے ہیں وہ کہ ”غالب کون ہے“، کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلا دیں کیا نہ



فہم الدولہ دبیر الماک مرزا اسد اللہ خان غالب دہلوی

M.A.LIBRARY, A.M.U.



U16627

URDU SECTION

CHECKED-2002



مقدمہ

۸۹۱۵۲۳۱
۱۶۶۲۶

GHALIB COLLECTION

ہمارے مولوی نظام الدین حسین صاحب نظامی بدایونی ہیں۔

میرے دوست مرزا محمد ظفر بیگ صاحب جن کے حسن سہمی سے روح کلام غالب طبع ہو کر آج شائقین کے پیش نظر آئی مجھ سے مصر ہوئے کہ میں اس کا مقدمہ لکھوں۔ غالباً ان کا یہ اصرار اس بنا پر تھا کہ مجھے کلام غالب سے دلی لگاؤ رہا اور اس کے فدائی ہونے کا فخر حاصل ہے۔ میری گونا گوں مصروفیتیں کچھ عرصہ تک مرزا صاحب کی تعمیل ارشاد میں مانع ہیں جب تقاضا صحت سے بڑھا تو کچھ وقت اس کے لیے بھی نکالا۔ میں نے اس مقدمہ میں اختصار کو مد نظر رکھا ہے تاکہ ناظرین آسانی سے اس کے مطالعہ کے لیے وقت دے سکیں ورنہ کلام غالب کا موضوع اس قدر دلچسپ اور وسیع ہے کہ اس پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے

اے نواب محبوب جنگ سرد اس مسودہ صاحب بی۔ اے آکسن کی تحریک سے سب سے پہلے شہسہ میں ہیں نے آ۔ دو دیوان غالب متواثرات اعلیٰ کے ساتھ نظامی پریس ہاؤس سے شائع کیا۔ اس کے بعد شہسہ میں سلسلہ آصفیہ کی پہلی کوسی کے طور پر شریعہ ایڈیشن شائع ہوا۔ میری پیشہ تعلیم یافتہ طبقہ میں اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کے پانچ ایڈیشن اس وقت تک نکل چکے ہیں۔ (نظامی)

CHECKED-2002

غالب غزل کا بادشاہ تھا اس نے اس صنف سخن کی ماہیت کو خوب سمجھا ہو۔ غزل کی تعریف مختصراً یہ ہو کہ اس میں جتنے مضامین ہوں وہ داخلی ہوں اور ان کا درجہ اس قدر بلند ہو کہ ان سے انسان کی فطرت اور اس کی عظمت ہویدا ہو سکے اور اس کی وسعت اور اک کا پتہ چل سکے حقیقت ہو کہ جملہ اصناف سخن میں غزل گوئی جتنی آسان ہر اتنی ہی دشوار ہو اگر غزل غزل ہو تو اس کو بوتان نظم کا ایسا قلعہ کہنا چاہیے جس کی روشیں غیر مسلسل اور نامرہبط ہونے کے باوجود بے حد دل کش اور روح افزا ہیں جس طرح آسمان پر چپکے ہوئے تاروں کی بے ترتیبی ان کی نوراً فریبیوں کو جلا دے دیتی ہو اسی طرح ایک بہترین غزل کے منتشر اشعار اس کے حسن کو دوبالا کر دیتے ہیں اور بالہنہ نامرہبطی و بے نظم کی جگہ پیدا لے لے لے کا مصداق بن جاتے ہیں، ظاہر ہو کہ ہر شعر نئی تخیل کا حامل ہوتا ہو اور ہر تخیل میں نئی نئی نکتہ آفرینیاں ہوتی ہیں، کہیں فلسفہ اخلاق و تصوف کے گونا گوں رموز عالم حیرت و استعجاب طاری کر دیتے ہیں تو کہیں جذبات حسن و محبت کی بوقلمونی مسحور و بے خود بنا دیتی ہو غالب کے دیوان کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے ہر ایک ایک شعر اس معیار پر پورا اترے گا۔ یہ ہی وجہ ہو کہ غالب کا کلام جب پڑھیے نیا لطف آتا ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب کے کلام میں اکثر اشعار شرح طلب ہیں اسی لئے اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں جن میں طرح طرح کی موثر گفیاں کی گئی ہیں۔ یہ بحث ہمارے موضوع سخن سے خارج ہو کہ یہ مثنوی و حواشی اپنے مقاصد میں کہاں تک کامیاب ثابت ہوئے

لیکن یہ امر مسلمہ ہو کہ غالب کے سوا زبان اُردو کے کسی اور شاعر کے کلام کو یہ شہرت اور اہمیت اب تک نصیب نہیں ہوئی۔ اور نہ صرف اس لحاظ سے بلکہ دیگر خصوصیات شعری کی بنا پر آج ہمیں یہ فخر حاصل ہو کہ ہم دنیا کی دیگر مشہور زبانوں کے نامور اور عالمگیر شہرت رکھنے والے شعرا کے مقابل غالب کو پیش کر سکتے ہیں چنانچہ گزشتہ بہت سالہ زمانہ میں اس کے کلام کی خوبیوں کو جس بلند آہنگی کے ساتھ سراہا گیا ہو اور اس کی مدحت طرازی کی گئی ہو اس کے ثبوت کے لیے ان ضخیم شرحوں کے علاوہ ملک کے نامور مصوّر چٹائی کا دیدہ زیب ”مرقع“ اور دیگر قسم قسم کے خوبصورت اور نظر فریب ایڈیشن موجود ہیں۔

کلام غالب کی قدر و منزلت کی یہ عالی شان عمارت جس کا سنگ بنیاد مولانا حالی مرحوم نے اُنیسویں صدی کے آخر میں ”یادگار غالب“ لکھ کر رکھا تھا آج ”روح کلام غالب“ کی اشاعت سے پایہ تکمیل کو پہنچ رہی ہو کسی شاعر کے پیئے یہ بات کچھ کم قابل فخر نہیں کہ دیگر شعرا اس کی دو چار چیدہ غزلوں کے اشعار پر مصرعہ لگائیں اور ان کی تفسیر کر کے اپنے کلام میں شامل کر لیں لیکن اردو کیا فارسی میں بھی کوئی مشہور سامشہور شاعر غالباً ایسا نہیں ہوا جس کے پورے دیوان کی تفسیر کی گئی ہو۔ کلام غالب کی قدر افزائی میں یہ ہی ایک کمی تھی جس کو ”روح کلام غالب“ (جو غالب کی تمام غزلوں کی تفسیر ہو) بدرجہ اتم پورا کرے گی اور اس لحاظ سے غالب کے توصیفی لٹریچر میں اس کو ایک قابل قدر اور شاندار ادبی اضافہ شمار کرنا چاہیے۔

اُردو ادب میں تفسین کا رواج دراصل فارسی کا اتباع ہوا۔ دو میں فارسی غزلوں کی بھی تفسین کی جاتی ہے اکثر شعر و خواہی غزل کی بھی تفسین کرتے ہیں تفسین دو قسم کی ہوتی ہے مثلث اور مخمس مثلث میں اول مصرعہ تفسین کا ہوتا ہے اور دو مصرعہ اول غزل کے جس کی تفسین کی جائے۔ مخمس پانچ مصرعوں سے مراد ہے جس میں تین مصرعہ تفسین کے ہوتے ہیں اور دو اول غزل کے اب زیادہ تر مخمس کا رواج ہے۔ مرزا عزیز بیگ مرحوم مصنف (روح کلام غالب) نے بھی مخمس ہی کو پسند کیا ہے یعنی غالب کے قصائد وغیرہ چھوڑ کر ہر غزل کے اشعار پر تین مصرعہ اپنے چسپاں کیے ہیں۔

تفسین کی صرف یہ ہی خوبی نہیں کہ اس کے مصرعے اصل مصرعوں سے دست گریاں ہو جائیں بلکہ ان سے اصل شعر کے معانی اور مطالب کو خواہ وہ کتنے ہی دقیق اور لائیل ہوں اس لطافت کے ساتھ نمایاں کر دیا جائے کہ پوری تفسین ایک ہی دل دو ماغ کی شاعرانہ کاوشوں کا نتیجہ معلوم ہو۔ روح کلام غالب میں یہ تمام محاسن پوری طور پر نظر آتے ہیں لیکن چونکہ اول سے آخر تک ہر غزل کی تفسین کی گئی ہے اس لیے اگر کہیں کہیں یکساں دور قلم نسبتاً نہ پایا جائے تو انشاؤ کا معلوم کی بنا پر نظر انداز کرنے کے قابل ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مصنف نے پورے دیوان کی تفسین کرنے میں اپنی پوری قوت شاعری صرف کر کے کلام غالب کی شراب کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔ اس کی ادنیٰ خصوصیت یہ ہے کہ مشکل ترین اشعار کے معانی

اور مطالب اس درجہ واضح ہو جاتے ہیں کہ کسی شرح کو دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی اس لحاظ سے روح کلام غالب کو دیوان غالب کی تمام مشروحوں پر فوقیت حاصل ہو اور اس کا اندازہ صرف اتنی بات سے ہو سکتا ہو کہ غالب کے جن مشکل اشعار کی شرح میں دیگر شاعرین نے نثریں صفحے کے صفحے سیاہ کر دیئے ہیں ان کو مصنف روح کلام غالب نے نظم کے صرف تین مصرعوں میں اس فصاحت و بلاغت کے ساتھ لکھ دیا ہو کہ ہم اس کے شاعرانہ کمال کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور بے ساختہ زبان سے نکل جاتا ہو ع

آفتاب آمد دلیل آفتاب

غالب اس کی توجیہ یہ ہو سکتی ہو کہ غالب اور مرزا موعوم دونوں فطری شاعر تھے۔ مرزا موعوم خود بھی ایک وردمند دل رکھتے تھے اور معلوم ہوتا ہو کہ انھوں نے غالب کی سیرت اور ماحول کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ مختصر یہ ہو کہ جو درد غالب کے کلام میں ہو اسی کی کسک مرزا کی طبیعت میں بھی موجود تھی۔ خواجہ حافظ نے خوب فرمایا ہو۔

بنال لبیل اگر با منت میر بار است کہ ماد و عاشق نہاریم و کارمازار است
جب ڈر و در سیدہ چوٹ کھائے ہوئے دل ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو اپنی داستان غم سناتا ہو تو سُننے والوں پر ایک کیفیت کا عالم طاری ہوتا ہو یہی حالت اس تضمین کے مطالعہ سے ناظرین کے دلوں پر پیدا ہوتی ہو۔ فرماتے ہیں :-

ذرا اس بے زبان دل کی طہسُن کچھ اپنی قدروانی کا گلہ سُسن
پیسل بے بہا کہتا ہو کیا سُسن سُسن اور غارت گر جنسِ فاسُن
شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا

اس اپنی آرزو پر مر مٹا ہوں کہ نصبِ لعینِ چشمِ سرمہ سا ہوں
ہمہ تن شوقِ نظارہ ہوا ہوں نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں
تغا فلہائے تمکین آزا کیا

ترا خیال و تصورِ جوں کو ہو مجھو اسی سے نامِ نویسی کا شغل ہو مرغوب
مجھے اُمیدِ کرم اور تجھ سے ہو کیا خواہ یہ جانتا ہوں کہ تو اور پانچ مکتوب
مگر ستمِ زدہ ہوں فوجِ غمِ فرسا کا

کیا خوب شرح کی ہو

جنوں مانع ہو اُستاد کا احساں اُٹھانے سے فراغت پا چکا روزِ ازل پڑھنے پڑھانے سے
رہا انکارِ عقلِ کل کو غیرِ لا بتانے سے فنا تعلیمِ درسِ پنجویں ہوں اس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستان پر

ایک مقطع کی تفسیر ملاحظہ ہو جس میں غالب نے بوڑھاپے کا رونا رویا ہو
کہیئے مرزا کا حال کیا غالب بے طرح ضحک ہو گیا غالب

ہو یہ پیری بھی کیا بلا غالب مضمحل ہو گئے توئی غالب

وہ عناصر میں اعتدال کہاں

غالب کے ایک شعر کی جس میں توحید کا فلسفہ کوٹ کوٹ کر پھرا ہوا تضمین کے تین مصرعوں میں یہی

شرح کی گئی ہو جس سے شاعر کا مافی الضمیر صاف سمجھ میں آ جاتا ہو لکھتے ہیں

ہیں موجد، خدا، شرک ہو دل سے مفقود ہم معتبر ہیں نہ کہے کے نہ کہہ مجبور

رو بقبلہ ہیں تو صرف ایک جہت ہو مقصود ہو پے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود

قبلہ کو اہل نظر قبلہ نہا کہتے ہیں

غالب نے ایک شعر میں معشوق کے وصال کا ذکر کر کے عاشق کی خوش نصیبی انوکھے طرز سے

ثابت کی ہو جس میں زلفوں کی پریشانی کو شب وصال میں لطف کا سبب بنا کر کیا ہو۔

اور اسی طرح رات کی اور زلفوں کی سیاہی کی مناسبت مزہ دے گئی ہو تضمین بیکار لے رہی ہیں

چار چاند لگا دیئے ہیں کہتے ہیں۔

بزم میں جو ہمیشہ تیرا اور راتیں اس کی ہیں صبح نظارہ میں کروٹیا ہو تیں اس کی مایں

اس سے بھی وہ خوش نصیب ہے ہو تیں اس کی ہیں نیند اس کی ہو دماغ اس کا ہو راتیں اس کی ہیں

تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشان ہو گئیں

ایک شرح طالب شعر کی منظوم شرح ذیل کی تضمین میں ملاحظہ ہو۔

ہنسی یاروں نے کیا کی ایک نصیحت مجھ کو فرمائی
 نہ اب ہوش و حشر ہو نہ فطرت ناشکیبائی
 سکوں سا ہو گیا دل کو گیا سامان رسوائی
 نکو ہوش مانع بے ربطی شور جنوں آئی
 ہوا ہو خندہ احباب بخیہ حبیب و دامن ہیں

جب غالب دہلی سے لکھنؤ کے سفر کے لیے اس امید پر نکلے کہ نواب اودھ کی بارگاہ سے
 کچھ امداد لیکر نجات اشرف اور حرم محترم کی زیارت سے بہرہ اندوز ہوں گے تو راستہ میں ایک
 غزل لکھ کر ان جذبات کا اظہار کیا اس غزل کے دو شعروں کی تفسیر قابل ملاحظہ ہو کس خوبی سے
 واقعات کی تصویر کھینچی ہو

عقل حیران ہو کس وجہ سے چھوڑی دہلی
 کچھ تو ہو جس لیے طو کی ہو مسافت اتنی
 یک بیک چھوڑ دی کیوں لغت راحت گھر کی
 لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلت یعنی

ہوں بیرونِ تاشا سو وہ کم ہو ہم کو

جب چلے گھر سے تو تھیں دل میں ہاں دہلی
 بیٹھ رہنا ہیں اور ترک سفر ہو اک قہر
 قصہ ہو دور کا مانع جو نہ ہو گردش دہر
 قطع سلسلہ شوق نہیں ہو یہ شہر

غزم سیرِ نجات و طوفِ حرم ہو ہم کو

غالب نے اکثر موقعوں پر اپنے دقیق مطالب کی طرف اشارہ کر کے یہ ظاہر کیا ہو کہ وہ کچھ کہتے
 ہیں عوام اس کو نہیں سمجھتے اور یہ ان کی فہم کا قصور ہو۔ اس مطلب کے ایک شعر کی تفسیر ملاحظہ ہو

کیا خوب کہا ہو

میری بخموری بہشت قیل و قال ہو مطلب کو میرے پائے کوئی کیا مجال ہو
کہتا ہوں سب کچھ اور زبان میری لال ہو گر خامشی سے فائق اخلا سے حال ہو
خوشن ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہو

غالب کے دیوان میں جہاں مشکل اشعار ہیں وہاں ایسے شعر بھی ہیں جو پہلے متعین کا حکم
رکھتے ہیں اسی غزل کے ایک شعر کی تفسیر منوہ کے طور پر بلا حلفہ ہو جس میں تفسیر کی
زبان بھی مرزا غالب کی زبان سے مل گئی ہو۔

نالہ و آہ میں دھرا کیا ہو حاصلِ گریہ و بکا کیا ہو
اس تڑپے سے مدھا کیا ہو دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہو

آخر اس درد کی واکیا ہو

سطور بالا میں تقریباً غالب کے ہر قسم کے اشعار کی تفسیر کے منوہ نے پیش کر دیئے ہیں تاکہ
ماظرین 'روح کلام غالب' کی خوبیوں کا صحیح طور پر اندازہ کر سکیں اور ان کو معلوم ہو سکے کہ
مرزا عزیز بیگ مرحوم نے غزل کے تنگ میدان کو خمس بٹاکر وسعت و وسعہ میں کہاں تک
کا میابی حاصل کی ہو اور غالب کی اس آرزو کو کہ ان کے بیان کی وسعت کے لئے تنگنا سے
غزل سے زیادہ وسیع میدان درکار ہو کس حد تک پورا کیا ہو غالب کے اسی مضمون کے شعر

کی تضمین میں نہایت موزوں اسلوب اختیار کیا ہے۔ فرماتے ہیں :-

سخن میں چاہیے کوئی جدید طرزِ عمل کہ طبع تیز کا کچھ حوصلہ تو جامے نکل
نہ کیوں ہو جو تغزل ہیں ہر کے جی نکل بقدرِ شوق نہیں طرفِ تنگنائے غزل

کچھ اور چاہیے وسعت کے بیان کیلئے

مرزا مرحوم کی تضمین کے مطلق اس قدر لکھنے کے بعد ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ دوسرے شاعروں نے جو غالب کی بعض غزلوں کے خمسے کیے ہیں ان کے مقابلہ میں مرزا مرحوم کی تضمین کا کیا درجہ ہے۔ مثال کے طور پر میر ہمدانی مجروح دہلوی کے خمسون کو جو غالب کے ارشادِ علامہ میں سے تھے مرزا مرحوم کے خمسون کے بالمقابل درج کرتے ہیں۔ مبصر اور ناقد ان کو پڑھ کر خود رائے قائم کریں۔

مرزا

یوں تو میرا علاج کیا نہ ہوا
کم مرض ہی مگر ذرا نہ ہوا

مجھ پر احساں طبیب کا نہ ہوا

درومٹ کشش دوا نہ ہوا

میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

مجروح

کامِ نوبت سے کچھ روانہ ہوا

درِ حاجت کسی پہ روانہ ہوا

کیا حقیقت کہوں کہ کیا نہ ہوا

درومٹ کشش دوا نہ ہوا

میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

مجرع

وے خدا رحم ان حبیبوں کو
 کہ جلا میں نہ بد نصیبوں کو
 رنج دیتے ہو ہم غریبوں کو
 جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
 اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا
 کیوں عبث جا کے اپنا سر نکالیں
 نافع احسان کیوں کسی کا اٹھائیں
 اُس سے جب آرزوئے دل ہی نہیں
 ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
 وہ ہی جب خیر آزمانہ ہوا
 رکھتا لذت بھری دہان حبیب
 شب مصری کو وہ کہاں ہی نصیب
 کیا کہوں بات ہو عجیب غریب
 کتنے شیریں ہیں تیرے لبے رقیب

مرزا

ہو گئے رسوا تمہیں کہا مانو
 بات بڑھ جائے گی بہت یوں تو
 چل کے سن لو اک جو سُنتے ہو
 جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
 اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا
 اور تجھ سا حسین کہاں سے لائیں
 حسرتِ دل کی داد کس سے پائیں
 کس کے ہاتھوں سے زخمِ دل پرکھائیں
 ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
 تو ہی جب خیر آزمانہ ہوا
 سخن تلخ کب ہوا ان کے قریب
 ان سے باتیں سُننے کیس کے نصیب
 ہی حلاوت ہی کچھ سخن میں عجیب
 کتنے شیریں ہیں تیرے لبے قریب

مجرع

گالیاں کھا کے بے مزانہ ہوا
 فکر کی قسمت آزمائے کی
 یعنی نہیں شوخ کو بلائے کی
 یہ سنو بات دل جلانے کی
 ہو خیر گرم اُن کے آنے کی
 آج ہی گھر میں بوزیا نہ ہوا

جب سے عقل و تہمت آئی تھی
 تیرے ہی وہ پوجہ سائی تھی

وہ دم عاجزی سنوائی تھی
 کیا وہ نمرود کی خدائی تھی

بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

اُس کی بخشش نے کی ذرا نہ کمی

کچھ تلافی پہ ہم سے پہ نہ سکی

کیا بڑی بات ہم نے کی اسی

مرزا

گالیاں کھا کے بے مزانہ ہوا
 جب ہمیں دُھن تھی اُن کے لانے کی
 استطاعت تھی گھر سجانے کی
 اب جو بدلی ہو انہ مانے کی
 ہو خیر گرم اُن کے آنے کی
 آج ہی گھر میں بوزیا نہ ہوا

جان طاعت ہی میں کھپائی تھی
 کچھ خودی تھی نہ خود نمائی تھی

سر تھا سجدہ تھا جہ سائی تھی
 کیا وہ نمرود کی خدائی تھی

بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

قابل فخر کیا ہو بات اپنی

عین احساں ہو اس کی خوشنویسی

ہم نے اس پر نثار کیا شو کی

مجرّح

جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اُن کے جب بحرِ کار بہتے ہیں

ہم تو مجروحِ غرق رہتے ہیں

آپ کیوں طعنِ طعنے بہتے ہیں

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں

آج غالبِ غزل سمرانہ ہوا

ایضاً

لا تقنطو نوید ہی ام الکتاب میں

زاہد گناہِ غلو ہیں ہاں کس حساب میں

ہر عرض یہ جنابِ تقدسِ مآب میں

کل کے لیے کہ آج نہ خستِ شرب میں

یہ سو رن ہو ساقی کوثر کے باب میں

مرزا

جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

مثلِ مرزاِ مصرودہ رہتے ہیں

جی میں گھٹ گھٹ کے پھوٹا بہتے ہیں

سب غمِ انتظا رہتے ہیں

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں

آج غالبِ غزل سمرانہ ہوا

ایضاً

جامِ سب کو رکھ نہ بچا کر حساب میں

شال نہ کر ہجو کی کوشکے حساب میں

وہاں کچھ کمی نہیں کہ ہو تو خطِ مآب میں

کل کے لیے کہ آج نہ خستِ شرب میں

یہ سو رن ہو ساقی کوثر کے باب میں

مجرع

گو آرزو سے دید میں میں بے قرار ہوں
 ہرگز وہ یاں نہ آئیں گے میں کو طلب کے د
 پر کچھ تو شغل چاہیے بیکار کیوں ہوں
 قاصد کے آئے تے خط اکا اور لکھ کھوں
 میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں
 شاوی و غم کو عشق میں اکا ربطات ہو
 اس میں کبھی حیات ہو گا ہے مات ہو
 ہو طرہ حال اور نئی واردات ہو
 میں اور خط وصل خدا ساز بات ہو
 جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
 حکم خدا میں گولب چون و چرا ہو بند
 مالک ہو وہ حقیر کرے خواہ سر بلند
 پرول تو اس خیال سے رہتا ہو ٹکڑے
 ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند

مرزا

لکھ تو دیا انھیں کہ مرا حال ہیوں
 ہوں سے آرزو سے تسلی نہرا جنوں
 آگاہ اُن کی عادت خواہے خوب
 قاصد کے آئے تے خط اکا اور لکھ رکھوں
 میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں
 وہ آج میرے گھر جو چلے آئے مست ہو
 شکر خدا کہ ہو گئے قسطے تمام طو
 جاتے ہوئے وصال کا وعدہ بھی گئے
 میں اور خط وصل خدا ساز بات ہو
 جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
 یا تو ملائکہ سے بھی تھا مرتبہ بلند
 ہم سانس نہیں ہو یا کوئی اخبار مستمند
 پہونچا رہا ہو ہر تنفس میں گزند
 ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند

لے اتنا دل کی ماکوت سے بدل کر اس کو محبت و واردات اور بات کا ہم قافیہ کرنا ضروری معلمی ہو معلوم نہیں یہ غلطی کہاں سے شروع ہوئی؟

مجرع

گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں
 ہمدردِ واقف نے بتِ خانہ خراب کے
 اوسان کھو دیئے دل بے صبر و تاب کے
 اتنا رہم سمجھ گئے ان کے عتاب کے
 ہر نیواری چڑھتی ہوئی اندر نقاب کے
 ہر اک شکن پڑی ہوئی طرف نقاب میں
 اہلِ نظر سمجھتے ہیں عالم کا کیا وجود
 ہر اُس کی ذات پاک سے ہر چیز کی بُد
 ہر ایک کو نہیں خبرِ نیستی و بود
 ہو غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہو
 ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
 میں لاکھ جاں سے اپنی قدا اُس پہ ہوں گے
 میری اذیتوں سے خوشی ہو وہ فتنہ گر
 ہر یارِ میرا دشمنِ اُرہم کس قدر

مرزا

گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں
 بے پردہ کچھ اثر ہیں نمایاں عتاب کے
 لیکن ہیں چپ خیال سے شرمِ حجاب کے
 اتنا ربات بات میں ہیں پیچ و تاب کے
 ہر تیوسی چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
 ہر اک شکن پڑی ہوئی طرف نقاب میں
 اشیا کی ہر تصویرِ مشابہت سب نمود
 دیکھا جو غور سے تو خیالی ہیں سب جود
 ہستی کے واہے کی بدولت ہر سہت بُد
 ہو غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہو
 ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
 کیا کہیے ہوتی تھی شبِ غم کس طرح بسر
 اختر شمار یوں ہی میں ہو جاتی تھی سحر
 تو اُس ستم پہ اور نیا چشمِ شوق پر

مُجَرَّح

"تا پھر نہ انتظار میں نیند اُسے عمر بھر
 آنے کا عہد کر گئے اُسے جو خواب میں
 رکھتے ہیں گو نہاں وہ جالِ نظارہ سوز
 بھانپاں زیب ہوتا فراہم گدہ روز
 نگہ سکھ سے تا درست ہے روئے لفر و ز
 آرایشِ جال سے فایغ نہیں ہنوز
 پیش نظر ہی آئینہِ دایم نقاب میں
 تاجونہ اس کو میرے اٹھانے میں تہم
 محفل میں اس کی ہم نے رکھی سے کام
 یاں تو صفتِ نعال میں کھاسدِ مقام
 مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا دو بچام
 ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
 کہ شوخیاں جتا کے ملا ناٹکا کا
 کہ شرمناک ہو کے پھر ناٹکا کا

مُزِا

"تا پھر نہ انتظار میں نیند اُسے عمر بھر
 آنے کا عہد کر گئے اُسے جو خواب میں
 گو خود نما نہیں ہو وہ پرورش میں ہنوز
 نظارگی نہیں کوئی اس کا کہیں ہنوز
 جو محوِ ناز خود بھی وہ ناز آفریں ہنوز
 آرایشِ جال سے فایغ نہیں ہنوز
 پیش نظر ہی آئینہِ دایم نقاب میں
 رہتے تھے ہم ہمالہ جہاں اُن سے خاص عام
 اٹھتا تھا ایسی بزم سے میں ورتشہ کام
 پیشے میں تاج مجھ کو نہ ہو کس طرح کلام
 مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دو بچام
 ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
 آتا ہی یوں تو اُن کو تراناٹکا کا
 نظریں بچا کے سب کی ملا ناٹکا کا

مجرع

انما زولہری سے جھکانا نکلا ہوا
 لاکھوں لگاؤ ایک پُجرا نکلا ہوا
 لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں
 جب تک کہ پھیر خاضقہ ہی کا نہ جائے
 بنتا نہیں ہی کام کوئی لاکھ گر بنا سے
 اس بات کا یقین کنی کس طرح سے لائے
 وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
 جس سحر سے سفینہ رواں ہوا لہر میں
 مقدور تک سنی میں ناں دست پاہلا سے
 پر کیا کریں وہی جب تک کی بر نہ آئے
 یہ حال ہو تو خاک محبت کا لطف آئے
 وہ نالہ دل میں جس کجاں جگہ نہ پائے
 جس نالہ سے شکاف پڑے آفتاب میں
 ملک عدم کے دیکھیے عازم پہ کیا بنے

مرزا

آفت ہی آف مگر نہ اٹھانا نکلا ہوا
 لاکھوں لگاؤ ایک پُجرا نکلا ہوا
 لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں
 جادو وہ چیز ہو کہ جو اس کمال میں لائے
 مشکل مشکل امر کو آسان کر دکھائے
 لیکن مجھے ہی تو یہ فوسس ہوا سے
 وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
 جس سحر سے سفینہ رواں ہوا لہر میں
 وہ نالہ جو کہ عرش معسلے کو بھی لائے
 وہ نالہ جو زمین کو بھی لرزے میں لائے
 وہ نالہ اور کان تک شوح کے بجائے
 وہ نالہ دل میں جس کجاں جگہ نہ پائے
 جس نالہ سے شکاف پڑے آفتاب میں
 کہتے ہیں صاف صاف یہ الہا زچاں کے

مجرع

اس رویش بہشت میں شیبہ نماز کے
 پر جس میں بس ہی اپنا نہ ہو میں کیا کہے
 رو میں جو خوش عمر کہاں بچھے تھے
 دیا تھ باگ پر ہو نہ پاپے رکاب میں
 مجروح کو اس امر سے ہی خوب آگہی
 اب وہ نہیں کہ باوہ پرستی جو پہلے تھی
 بالکل ہی ترک ہو یہ ممکن نہیں ابھی
 غالب چٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
 پیتا ہوں وزیر و شیبہ ماہتاب میں

مرزا

لینا نہیں عدم سے اذہم کہیں آتے
 بے اختیار ہوں کہیں مجھ کو گرا نہ دے
 رو میں ہی خوش عمر کہاں دیکھے تھے
 دیا تھ باگ پر ہو نہ پاپے رکاب میں
 تھے یار ہم پیالہ ہمارے سبھی کبھی
 دیکھنا نہ ہم نے ہوش میں آ کر کبھی کبھی
 وہ دن کہاں کہ شغل سے فرصت تھی کبھی
 غالب چٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
 پیتا ہوں وزیر و شیبہ ماہتاب میں

نوٹ: جس مصنف کے کلام کا مطالعہ کیا جائے اس کے حالات زندگی کا جاننا بھی خالی از دہی نہیں
 نہیں ہوتا۔ مرزا محمد ظفر بیگ نے جو مصنف مرعوم کے علم زاد پدر ہیں مرزا کے ذاتی اور خانہ دانی صحیح
 حالات اور ان کا نوٹو بہم پہنچایا ہے۔ نوٹو ناظرین نے مشروع میں ملاحظہ فرمایا ہو حالات بطور ضمیمہ
 آئندہ صفحات میں پڑھیں

خاکسنا نظامی بدایونی

۳۳ راج ۳۵

حالات مصنف

(از مرزا ظفر بیگ صاحب بہارن پوری)

خاندانی حالات آپ کے جد امجد مرزا بختیار مرحوم چغتائی مقام تیمور علاقہ روسی ترکستان کے قدیم باشندے تھے چھٹی پشت میں آپ کا سلسلہ نسب مرزا فرید

چغتائی سے جو حضرت امیر تیمور صاحب قرآن گورگانی کے تاجور جلس تھے ملتا ہے مرزا بختیار مرحوم اٹھارہویں صدی کے آخر میں اپنے چند خاندانی جھگڑوں سے پریشان ہو کر دہلی تشریف لائے

اس زمانہ میں دہلی میں شاہ عالم بادشاہ کی حکومت قائم تھی ملک میں ہر طرف قریب قریب مرہٹوں کا زور تھا اور حکومت بھی ہر طرح پران کے زیر اثر تھی مرزا بختیار مرحوم شاہ عالم

کے حضور میں پیش ہوئے شاہ عالم نے مرزا مرحوم کے خاندانی حالات کی بنا پر بہت قدر دانی فرمائی اور ان کو اپنی خدمت میں معتمد خاص کے عہدہ پر سرفراز فرمایا لیکن مرزا چونکہ فن سپاہ گری

میں کمال و سنگاوار کشتے تھے اس وجہ سے کچھ دنوں کے بعد مرزا مرحوم کا فوجی حکم میں کسی معزز عہدہ پر تقرر کر دیا گیا مرزا مرحوم نے اپنی حسن لیاقت سے تھوڑے ہی عرصہ میں سیالائی

کا درجہ حاصل کر لیا۔ مرزا مرحوم کی اس ترقی کے باعث ایک مرتبہ فوجی افسر کو رشک پیدا ہو گیا اور دونوں کے باہم جنگ ہو گئی۔

اتفاقاً ایک رزمرا مرحوم اور مرثیہ سردار میں کچھ لفظی تکرار ہو گئی جس کی وجہ سے مرزا مرحوم کو اس قدر طیش آیا کہ فوراً تلوار نکال کر مرثیہ سردار کا کام تمام کر دیا مرثیہ سردار کے قتل ہونے سے تمام مرثیہ فوج میں ہیجان پیدا ہو گیا اور وہ سب کے سب مرزا مرحوم کے قتل کے درپہ ہو گئے شدہ شدہ یہ معاملہ شاہ عالم بادشاہ کے روبرو پیش ہوا مرثیہ فوج کے سردار نے مرزا کی شرکایت کے دفتر کھول دیئے شاہ عالم بادشاہ نے مرثیوں کے غصہ کو فرو گتے کی غرض سے دفع الوقتی کے لیے مرزا مرحوم کو نظر بند کرنے کا حکم دیا اور اصل معاملہ کا فیصلہ کسی دوسرے وقت پر ملتوی فرمایا خیال کیا جاتا ہو کہ بادشاہ سلامت کی نیت یہ تھی کہ مرزا مرحوم کو کسی حیلہ سے اُن کے وطن پہنچا دیا جائے مرزا مرحوم ایم نظر بندی میں تسبیح و تہلیل میں مشغول رہتے تھے اسی حالت میں تین ماہ کے بعد ایک روز علی الصبح نماز سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ دفعتاً کلیجہ میں درد پیدا ہوا اور دو تین گھنٹہ کے بعد مرزا مرحوم نے شاہی قیدی سے نہیں بلکہ قیدیات ہی نجات پائی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ ساجدون مرزا مرحوم کی وفات پر ان کا تمام اثاث البیت ضبط کر لیا گیا مرزا مرحوم کی اہلیہ محترمہ اپنے دو جمنیہ بن بچوں کریم مرزا و جمیم مرزا کو لیکر سہارنپور تشریف لے آئیں چونکہ مرزا مرحوم کی اہلیہ نہایت تعلیم یافتہ خاتون تھیں اس لیے اہالیان سہارنپور نے اُن کی نہایت ست کی اور انھوں نے ایک زمانہ مدرسہ قائم کیا جس میں علاوہ قرآن پاک کی تعلیم کے دیگر خلاقی

کتاب ہائے فارسی کی بھی عمدہ تعلیم دی جاتی تھی یہ مدرسہ بہت عرصہ تک سہارنپور میں جاری رہا کچھ عرصہ کے بعد کریم مرزا اور رحیم مرزا بھی اپنی ملکتی تعلیم سے فارغ ہو کر جوان ہوئے کریم مرزا محکمہ پولیس میں اور رحیم مرزا تحصیل سہارنپور میں نائب ناظر مقرر ہوئے۔ رحیم مرزا بیس سال کی عمر میں پانچ سال ملازمت کرنے کے بعد دفعتاً بحار ضلع ہمدانہ ۱۸۳۵ء میں لاوا۔ فوت ہوئے کریم مرزا نے محکمہ پولیس میں خاطر خواہ ترقی کی اور بہت عرصہ تک ضلع سہارنپور فتحپور اور بلند شہر میں معزز عہدوں پر کام کیا ۱۸۵۷ء میں بلند شہر سے چھ ماہ کی رخصت لیکر تشریف لائے اور اسی زمانہ میں آپ کا انتقال سہارنپور میں ہو گیا آپ نے اپنی وفات کے بعد تین لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑی تھی سب سے بڑے صاحبزادے مرزا محمد شفیع بیگ تھے جو عرصہ دراز تک ضلع سہارن پور کے مختلف تھاغوں میں کووال رہے ایام ملازمت میں تین جج کیے اور ۱۸۷۷ء میں تھاغہ داری کے عہدہ سے نشن پائی چھ سال تک نشن پاکر ۱۸۷۷ء میں انتقال فرمایا مرزا حکیم بیگ صاحب منجھلے صاحبزادے تھے آپ نے ۱۸۷۷ء میں امتحان متنازعہ داری پاس کیا آپ کا کام نہایت اعلیٰ پایہ پر رہا اور بہت بڑے کامیاب مختار کار شاہد ہوئے حکام ضلع آپ کی خاص طور پر عزت کرتے تھے آپ کا انتقال ۱۸۹۱ء میں ہوا آپ نے اپنی وفات کے بعد کافی جائداد زرعی و سکنی چھوڑی جو اب تک آپ کے بیٹوں کے پاس موجود ہے۔ مرزا وزیر بیگ صاحب سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے آپ ۱۸۷۷ء میں محکمہ پولیس میں

ملازم ہوئے اور بہت تھوڑے عرصہ میں ترقی پا کر تھانہ داری کے عہدہ پر پہنچے بہت عرصہ تک ضلع سہارنپور میں مختلف مقامات پر تھانہ دار رہے آپ نہایت قوی اور جہیم تھے اب تک ضلع سہارن پور میں آپ کی طاقت کے کرشمہ بیان کیے جاتے ہیں آپ نے سلسلہ عزم میں انتقال فرمایا۔

مرزا عزیز بیگ صاحب مرحوم المتخلص بہ مرزا سہانپوری مرزا وزیر بیگ کی تاریخ پیدائش صاحب مرحوم کے خلف الرشید تھے آپ ۱۸۶۵ء میں بمقام سہارنپور پیدا ہوئے۔

تعلیم تلذذ قرآن پاک وغیرہ کی تعلیم ختم ہونے پر آپ نشی مولوی حبیب الدین صاحب مرحوم المتخلص بہ سوزاں کے زمرہ تلامذہ میں داخل ہوئے نشی صاحب فن شاعری میں حضرت مرزا غالب مرحوم و معقول کے خاص شاگرد تھے ایک مدت دراز تک غالب مرحوم کی خدمت میں دہلی رہے اور غالب مرحوم کے انتقال پر سہارنپور تشریف لائے جیسا کہ سوزاں صاحب مرحوم نے ایک غزل کے مقطع میں فرمایا ہے۔

غالب کا کام تھا سو وہ سوزاں گزر گئے دہلی میں اب بناب کا کیا کام رہ گیا

مرزا عزیز بیگ صاحب کو ادا ل عمری سے ہی شعر و سخن میں خاصی بچھی تھی اُس پر قابل استاد کی توجہ ذہن کی رسائی تھوڑے ہی عرصہ میں فارسی اور اردو کی غزلیں تصنیف فرمانے لگے

منشی صاحب مرحوم اپنے ہونہار شاگرد کی تیزی طبع دیکھ کر ان کی تعلیم میں سچے کوشش فرماتے تھے۔ چند ہی سال میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ آپ کو فارسی زبان میں کامل دستگاہی عربی میں بھی خاصی لیاقت پیدا کر لی تھی۔

شاعری | مرزا مرحوم ایک اعلیٰ ادیب اور شاعر تھے آپ ایک ایسے مخصوص رنگ کے مالک تھے جو اکثر ان کے ہمعصر شعرا کی ابتدائی روش سے قطعاً جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کی شاعری آپ کی اُستادانہ حیثیت کی بین دلیل ہو ضلع سہارنپور اور دیگر اضلاع میں آپ کے بہت شاگرد موجود ہیں آپ کا طریق اصلاح قابل تحسین تھا اپنے ہر شاگرد کے کلام میں ان کے مذاق اور علم کے موافق ایسی اصلاح فرماتے تھے کہ جس کا جواب شکل ہو شعاع میں چند اجاب کے عصر سے حضرت مرزا غالب مرحوم و مغفور کے دیوان کی تفہیم لکھی۔ شروع کی۔ ماہ اپریل ۱۹۱۱ء عیسوی میں اس اہم کام کو بحسن و بجاہ اتمام کو پہونچا تا اسی عرصہ میں آپ کو در وقت لیلج کا دورہ پڑنے لگا اور اسی مرض میں چھ ماہ بعد ماہ اکتوبر ۱۹۱۲ء کے اخیر مہینہ میں ۵۵ سال چھ ماہ کی عمر میں رحلت فرمائی تالیخ وصال۔ روح مرزا نسبت بہت بچی اللہ وانا علیہ راجون۔ آپ نے اپنی وفات پر دو لڑکیاں چھوڑیں۔

وزیریہ معاش و | آپ نے ۱۸۷۸ء میں امتحان مختار کا ری پاس کیا مگر شعرو سخن کا اس درجہ طرز معاشرت شوق تھا کہ کچھ ہی کے کاروبار کو محض ضرورتاً انجام دیا کرتے تھے اور ہفتہ میں

صرف ایک دو مرتبہ کچھ ہی تشریف لے جاتے اور جو کچھ وہاں سے یافت ہوتی اُس کو اپنے طرفیں لاتے۔ جب تک وہ روپیہ صرف نہ ہو جاتا اُس وقت تک کچھ ہی تشریف لے جاتے آپ کی قانونی قابلیت بھی قابل تعریف تھی اکثر طلباء آپ سے قانون بھی پڑھتے تھے۔

شادی مرزا کی شادی سنہ ۱۸۹۲ء میں آپ کے عم اکبر مرزا کا بیگ صاحب مرحوم کی دختر نیک اختر سے ہوئی آپ کی اہلیہ محترمہ بھی علاوہ قرآنی تعلیم کے اردو اور فارسی میں کافی سیاق رکھتی تھیں امور خانہ داری اور حسن انتظام میں لائق تعریف تھیں اس وجہ سے شہر کے محترمہ و ساء وغیرہ کی لڑکیاں بغرض حصول علم اُن کے پاس آتیں آپ کا انتقال سنہ ۱۹۰۷ء میں ہوا مرزا مرحوم اس حادثہ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ جلسہ شعر و سخن اور دیگر دنیوی مشاغل کو ترک کر دیا ہر چند اعزاء و اقربائے مرزا مرحوم کی توجہ عقد ثانی کی طرف دلائی مگر مرزا مرحوم نے ایک نہ سنی اور آخر دم تک اپنی اہلیہ مرحومہ کی یاد لیے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے اُس زمانہ میں ایک نہایت پُر و غزل لکھی تھی جس کے مطلع سے ولی حزن و مال کا اندازہ ہو سکتا ہو شعر

یاد ہیں وہ دن کہ ہم تھے اور زمانے کے مزے یاد آتے ہیں قفس میں آشیانے کے مزے
مذہب | مرزا مرحوم بہ اعتبار مذہب نہایت وسیع الخیال تھے اعتقاداً مذہب حنفی کے

پیر و اور صوم و صلوة کے پابند تھے اگرچہ آپ کے پاس بسا اوقات مختلف مذاہب کے اشخاص کا مجمع رہتا تھا مگر آج تک کبھی ایسا دیکھنے میں نہیں آیا کہ کسی صاحب کے مذہبی معاملات پر بحث یا گفتگو مرزا مرحوم نے کی ہو یا دوسرے مذاہب پر کبھی نقیضانہ زبان طعن کھولی ہو ابتداً مرزا کو اپنے اور شوقین طبع دوستوں کے اصرار پر محض قص و سرود میں شریک ہونے سے احتراز نہ تھا مگر یہ سلسلہ سن ۱۲۹۷ء میں بالکل ترک کر دیا تھا اور سلسلہ نقشبندیہ میں حضرت مولانا الحاج مولوی جلیل احمد صاحب مہاجر کی مدرسہ اول مدرسہ مظاہر علوم مہارن پور سے بیعت کی چنانچہ اس واقعہ کو مرزا مرحوم نے اپنی ایک نعتیہ غزل کے مطلع میں اس طرح پر واضح کیا

شعر

بہت کچھ صحبتِ ندان میں کھیا وقتِ عہدِ مرا
بس اب تو کچھ دلوں خدمت کرد اللہ والوں کی

اخلاق آپ کا اخلاق نہایت وسیع تھا ہر خاص و عام سے نہایت خندہ پیشانی اور تواضع سے پیش آتے تھے۔ آپ کی نشستگاہ میں احباب اور تلامذہ کا جلسہ رہتا تھا مگر ان کے جلسے میں کبھی کسی کی یہ مجال نہ ہوتی تھی کہ کسی کی غیبت یا بدگویی کرے۔ آپ نہایت کم سخن اور متین تھے بلا ضرورت کسی سے زیادہ گفتگو نہیں کرتے تھے۔



مرزا عزیز بیگ مرزا وفات سنہ ۱۹۲۰ ع

فہرست غزلیات تھیں شد

ممبر صفحہ	نمبر غزل	تعداد اشعار	مصرع اولیٰ ہر غزل	کیفیت
۱	۱	۸	نقش فریادی ہو کس کی شوخی تحریر کا	الف (۲۹)
۲	۲	۵	دل مرا سوزِ تہاں سے بے جا باہل گیا	
۳	۳	۶	عشق ہر رنگ رقیبِ سرو سا ماں نکلا	
۴	۴	۷	دھکی میں مر گیا جو نہ بابا نہ بدھا	
۵	۵	۷	دہر میں نقش وفا و جبرِ شلی نہ ہوا	
۶	۶	۱۲	ستائش گم ہو نہ اداں قدر جس باغِ رضواں کا	
۹	۷	۷	محرم نہیں ہی تو ہی نوا ہائے راز کا	
۱۱	۸	۹	برہم شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا	
۱۲	۹	۱۵	شب کہ برق سوزِ دل سے زہرہ ابراب تھا	
۱۵	۱۰	۹	بس کہ دُشوار ہی ہر کام کا آساں ہونا	
۱۶	۱۱	۷	دوست غمخواری میں میری سہی فرمائیں گے کیا	
۱۹	۱۲	۱۱	یہ نہ بھتی ہمارے قسمت کہ وصال یار ہوتا	
۲۱	۱۳	۱۳	ہوس کو ہو نشا ط کا رکب کیا	
۲۳	۱۴	۹	درِ خورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سانہ ہوا	
۲۶	۱۵	۸	پسے نذرِ کرم تحفہ ہو شرم نارسائی کا	

نمبر صفحہ	نمبر غزل	تلاوہ شمار	مصحح ادنیٰ ہر غزل	کیفیت
۲۸	۱۶	۹	گر نہ اندوہ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا	
۳۰	۱۷	۱۰	درد منت کش دوانہ ہوا	
۳۲	۱۸	۸	گلہ ہو شوق کو دل میں بھی تگی جاگا	
۳۳	۱۹	۳	جب بہ تقریب سفر پارنے محل باندھا	
۳۴	۲۰	۷	نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا	
۳۵	۲۱	۸	وہ مری چین چین سے غم نہاں سمجھا	
۳۷	۲۲	۱۱	پھر تجھے دین تریا د آیا	
۳۹	۲۳	۱۲	ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا	
۴۲	۲۴	۷	تو دوست کسی کا بھی ستم گر نہ ہوا تھا	
۴۳	۲۵	۸	عرض نیا ز عشق کے قابل نہیں رہا	
۴۵	۲۶	۸	ذکر اس پر پوش کا اور پھر بیاں اپنا	
۴۶	۲۷	۷	جو رے باز آئے پر باز آئیں کیا	
۴۸	۲۸	۱۰	عشرتِ قطرہ ہو دریا میں فنا ہو جانا	
۵۰	۲۹	۹	کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا	
۵۲	۳۰	۱۲	پھر ہوا وقت کہ ہوا بال کشا موجِ شراب	ب (۱)
۵۵	۳۱	۱۱	آبرِ خط سے ہوا ہو سرد جو باز آروست	ت (۱)
۵۷	۳۲	۹	حسنِ ثمرے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد	و (۱)
۵۹	۳۳	۱۰	بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر درو دیوار	ر (۶)

نمبر صفحہ	نمبر غزل	تعداد اشعار	مصرعہ اولیٰ ہر غزل	کیفیت
۶۱	۳۳	۹	گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر	
۶۳	۳۵	۱۲	کیوں جل گیا نہ تابِ رخ یار و بچہ کر	
۶۶	۳۶	۸	لہر زتا ہو مراد دل ز محبت مہر و رخشاں پر	
۶۷	۳۷	۱۱	ہو نہیں کہ ہر اک ان کے اشارے میں نشانِ ار	
۷۰	۳۸	۱۰	لازم تھا کہ دیکھو میرا رستہ کوئی دن اور	
۷۲	۳۹	۵	حریفِ مطلب مشکل نہیں فسونِ نیاز	ز (۳)
۷۳	۴۰	۳	کیونکہ اس بت سے رکھوں جان عزیز	
۷۴	۴۱	۱۰	ننگِ نغمہ ہوں نہ پروہ ساز	
۷۶	۴۲	۸	زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک	ک (۲)
۷۷	۴۳	۷	آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک	
۷۹	۴۴	۹	ہو کس قدر ہلک فریبِ وفا سے گل	ل (۱)
۸۱	۴۵	۸	وہ فراق اور وہ وصال کہاں	ن (۲۲)
۸۳	۴۶	۱۱	ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں	
۸۵	۴۷	۹	کی و فہم نے تو غیر اس کو جھاکتے ہیں	
۸۷	۴۸	۱۱	آبرو کیا خاک اُس گل کی گلشن میں نہیں	
۸۹	۴۹	۵	ہم سے کھل جاؤ بوقتِ میری ایک دن	
۹۰	۵۰	۱۳	ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں	
۹۲	۵۱	۷	ماخِ دشتِ نوردی کوئی تدبیر نہیں	

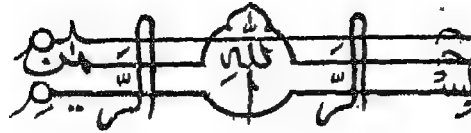
نمبر صفحہ	نمبر غزل	تعداد اشعار	مصحح اولیٰ ہر غزل	کیفیت
۹۳	۵۲	۶	جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں	
۹۶	۵۳	۱۳	ملتی ہو جوئے یار سے نارالہباب میں	
۹۸	۵۴	۱۱	کل کے لیے کر آج نہ خست شراب میں	
۱۰۱	۵۵	۱۰	جیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیوں گبر کیس	
۱۰۳	۵۶	۹	ذکر میرا یہ بدی بھی اُسے غلط نہ نہیں	
۱۰۵	۵۷	۹	نالہ جھوٹا طلب ای ستم ایجاد نہیں	
۱۰۶	۵۸	۷	نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتبار نہیں	
۱۰۸	۵۹	۸	تیرے تو سن کو عبا باندھتے ہیں	
۱۱۰	۶۰	۸	داہم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں	
۱۱۱	۶۱	۱۳	سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں	
۱۱۳	۶۲	۱۰	دیوانگی سے دوش پڑتا رہی نہیں	
۱۱۶	۶۳	۹	نہیں جو نہ خم کوئی بجھنے کے در فور سے تن میں	
۱۱۸	۶۴	۷	مرے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں	
۱۲۰	۶۵	۹	دل ہی تو ہو نہ سنگ و خشت اسے بھر نہ آئے کیوں	
۱۲۱	۶۶	۱۰	غیر داناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں	
۱۲۳	۶۷	۹	دارتہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو	و
۱۲۶	۶۸	۱۲	نفس میں ہیں گرا چھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو	(۷)
۱۲۸	۶۹	۸	دی ساوگی سے جان پڑوں کہ وہ کن کے پافو	

نمبر صفحہ	نمبر غزل	تعارف اشعار	مصحف اولے ہر غزل	کیفیت
۱۳۰	۷۰	۱۱	واں ہونچکر جو عشق آتا پی ہاں ہم ہو ہم کو	ی (۶۳)
۱۳۲	۷۱	۷	تم جانا تو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو	
۱۳۳	۷۲	۹	کسی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو	
۱۳۵	۷۳	۱۳	کسی کو دے کے دل کوئی نواسخ فغاں کہیں ہو	
۱۳۸	۷۴	۱۱	مبصر کے زیر سایہ خرابات چاہیے	
۱۴۰	۷۵	۷	بساط عجز میں تھا ایک لک قطرہ خوں وہ بھی	
۱۴۲	۷۶	۷	غم دنیا سے گز پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی	
۱۴۳	۷۷	۸	کیا تنگ ہم تم زدگاں کا جہان ہو	
۱۴۵	۷۸	۱۲	درو سے تھک کو ہو میرے بے قراری ہانے ہانے	
۱۴۷	۷۹	۶	سرسنگی میں عالم ہستی سے یاس ہو	
۱۴۹	۸۰	۷	گر خاشی سے فائدہ اخلاصے حال ہو	
۱۵۰	۸۱	۹	عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی ہے	
۱۵۲	۸۲	۹	اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کئے	
۱۵۳	۸۳	۷	رفقا پر عمر قطع رہ اضطراب ہو	
۱۵۵	۸۴	۱۰	دیکھنا قیمت کہ آپ اپنے پر شک جائے ہو	
۱۵۷	۸۵	۷	سادگی پر اس کی مر جانے کی حسرت دلی میں ہو	
۱۵۹	۸۶	۸	دل سے تری نگاہ جسکے تاک ترگی	
۱۶۱	۸۷	۷	تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے	

نمبر صفحہ	نمبر غزل	تعداد اشعار	مصرع اول ہر غزل	کیسیت
۱۶۲	۸۸	۶	کوئی دن گر زندگانی اور ہو	
۱۶۳	۸۹	۱۰	کوئی اُمید پر نہیں آتی	
۱۶۵	۹۰	۱۱	دلِ ناداں مجھے ہوا کیا ہو	
۱۶۸	۹۱	۹	کہتے تو ہو تم سب کہ بہتِ غالیہ مواتے	
۱۶۰	۹۲	۱۴	پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہو	
۱۶۳	۹۳	۱۰	بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم بچے	
۱۶۵	۹۳	۱۳	ظلمت کن میں میرے شبِ غم کا بوش ہو	
۱۶۶	۹۵	۷	نہ ہونی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی	
۱۶۹	۹۶	۷	عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے	
۱۸۰	۹۷	۱۳	شکوہ کے نام سے بے مہر تھا ہوتا ہو	
۱۸۳	۹۸	۱۰	ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہو	
۱۸۵	۹۹	۷	اگر مری جان کو قرار نہیں ہو	
۱۸۷	۱۰۰	۳	ہجومِ غم سے یا ناک سرنگونی مجھ کو حاصل ہو	
۱۸۷	۱۰۱	۱۱	جس ہر دم سے تو ناز سے گفتار میں آوے	
۱۸۹	۱۰۲	۱۰	حسنِ مہِ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہو	
۱۹۲	۱۰۳	۸	غیر لیں محفل میں بوسے جام کے	
۱۹۳	۱۰۴	۷	پھر اس انداز سے بہار آتی	
۱۹۵	۱۰۵	۹	کب وہ سننا ہی کہانی میری	

نمبر صفحہ	نمبر غزل	تعداد اشعار	مصرع اولیٰ ہر غزل	کیفیت
۱۹۷	۱۰۶	۵	جس زخم کی پہن ہو تدبیرِ رفو کی	
۱۹۸	۱۰۷	۹	چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے	
۲۰۰	۱۰۸	۱۰	ہر قدم دوری منزل ہی نمایاں مجھ سے	
۲۰۲	۱۰۹	۹	مکتہ چیں ہو غمِ دل اُس کو سناے نہ بیٹے	
۲۰۳	۱۱۰	۵	وہ آکے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے	
۲۰۵	۱۱۱	۶	پیش سے میری وقتِ کشمکش ہر تارِ بسترِ او	
۲۰۶	۱۱۲	۲	خطرِ او رشتہ اُفتِ لگ گزرن نہ ہو جائے	
۲۰۷	۱۱۳	۷	فریاد کی کوئی ٹو نہیں ہو	
۲۰۸	۱۱۴	۳	ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے	
۲۰۹	۱۱۵	۹	دیا ہو دل اگر اس کو بسترِ او کیا کہیے	
۲۱۱	۱۱۶	۸	دیکھ کر درِ پرِ غمِ گرمِ دامنِ افشانی مجھے	
۲۱۲	۱۱۷	۵	یا دہو شادی میں بھی ہنگامہ برباد مجھے	
۲۱۳	۱۱۸	۱۰	جنورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہو	
۲۱۵	۱۱۹	۸	کبھی تیک کی بھی اُس کے جی میں گرا جائے ہو مجھ سے	
۲۱۷	۱۲۰	۱۳	باز بچہ اطفال ہو دنیا مرے آگے	
۲۲۰	۱۲۱	۱۱	کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے	
۲۲۲	۱۲۲	۷	روئے سے اور عشق میں بیاک ہو گئے	
۲۲۳	۱۲۳	۱۰	ابنِ ہریم ہوا کرے کوئی	

کیفیت	مصرع اولے ہر غزل	تعداد اشعار	نمبر غزل	نمبر صفحہ
	بہت سی غم گیتی ستراب کمر کیا ہو	۷	۱۲۴	۲۲۶
	ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے	۹	۱۲۵	۲۲۷
	مستی بذوقِ عقلیت ساقی ہلاک ہو	۳	۱۲۶	۲۲۹
	جس چاشیم شانہ کیش زلفیا پار ہو	۱۰	۱۲۷	۲۳۰
	آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے	۷	۱۲۸	۲۳۲
	جب تک دہان زخم نہ پلید کرے کوئی	۱۲	۱۲۹	۲۳۳
	شبہم بہ گل لالہ نہ خالی ز ادا ہو	۱۲	۱۳۰	۲۳۶
	منظور بھی یہ شکل تجلی کو نور کی	۹	۱۳۱	۲۳۸
	غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہو	۹	۱۳۲	۲۴۰
	مدت ہوئی ہو یار کو مہاں کیئے ہوئے	۱۷	۱۳۳	۲۴۲
	نوید امن ہی بیدار دوست جاں کے لیے	۱۳	۱۳۴	۲۴۵
	میں ہوں مشتاق چٹا چھ پر چٹا اور سی	۹	۱۳۵	۲۴۸
	آپ نے مستیِ مصر کہا ہو تو سہی	۷	۱۳۶	۲۵۰



ادیت الف

کیا یہ منشا نزل میں کاتبِ تقدیر کا ① ذرہ ذرہ ہو فنا اک روز اس تعمیر کا
 رنگ جھلکایا ہو کیوں ہر چیز میں تغیر کا نقش فریادی ہو کس کی شوخی تحریر کا
 کاغذی ہو سپر ہن ہر پیکر تصویر کا
 درد و غم کرتے ہیں جو کچھ روح فرسائی پہنچے حسرتیں کرتی ہیں جو ہنگامہ آرائی پہنچے
 توڑتی ہو دل کو کیونکر ناشکیبائی پہنچے کاؤ کا سخت جانی ہائے تنہائی پہنچے
 صبح کرنا شام کا لانا ہو جو سے شیر کا
 آرزوئے قتل کو لب پر نہ لانا چاہیے ہاں مگر در پردہ تدبیر و تقاضا چاہیے
 کھنچے خود آئے اثر قاتل پر اتنا چاہیے جذبہ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے
 سینہ شمشیر سے بہا ہوا دم شمشیر کا

کوئی کم بایہ اگر برسوں طبیعت کو لڑائے
غیر ممکن ہو کوئی نکتہ مرے نکتوں سے پائے
لاکھ سامع کان اپنے میری باتوں پر جائے
آگہی دامن شنیدن جس قدر چاہے بچھائے

مُدعا عفا، ہو اپنے عالمِ تفسیر کا

جوشِ وحشت جب تجھے تھمتے نہیں دیتا ذرا
پھر ہو مرزا سلسلہ بیکارِ قید و بند کا
ہیں مرے نزدیک یہ طوق و رسن تو چیز کیا
بسکہ ہوں غالبِ اسیری میں بھی آتشِ نیرِ پا

میرے آتش دیدہ ہو حلقہ مری زنجیر کا



⑤

کیا بتاؤں آتشِ اُلفت میں کیا کیا جل گیا
ساز و سامانِ اپنی ہستی کا سراپا جل گیا
جسم بالکل پھٹک گیا ہو اور کلیجہ جل گیا
دل مرا سو نہ نہاں سے بے محابا جل گیا

آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

مجھ کو دعویٰ ہو بلا دیتی ترا دل ہر صدا
لیکن اب یہ بے اثر ہو میں کجا اور تو کجا
نالہ ہو سکتا ہو اپنی حد امکان تک رسا
میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافلِ بڑا

میری آوازِ آتشیں سے بالِ عفا جل گیا

خیر سمجھو آتشِ غم دل میں جب تک ہو نہاں
ورنہ پھر چھوٹے گی کیا دینا ہیں یہ برقی تپاں
ذکر سے اس کے زبانِ شمع ہوتی ہو زباں
عرض کیجے جو ہر اندیشہ کی گرمی کہاں

کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحر اہل گیا

دیکھنے کو اب بھی ہے سرو چراغاں جسم زار دل کی ہستی پر ہے لیکن داغ کا دار و مدار
اب تو اک ظلمت کے سینہ ہے گوہرِ داغدار دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار

اس چراغاں کا کروں کیا کار فرماہل گیا

ہر فراق ہنشیناں پر طبیعت مشتعل کر دیا سوز و گداز دل نے ہر تر مضمحل
کوئی دل بھی تو نظر آتا نہیں بے غش و غل میں ہوں اور افسردگی کی آمد و غالب کے گل
دیکھ کر طر نہ تپاک اہل بونیاہل گیا

(۳)

پنجہ دیو جنوں دشمن و اماں نکلا اس سے بچ کر نہ کوئی تار گریباں نکلا
تنگ بلبوس تن عاشق حیراں نکلا عشق ہر رنگ رقیب سرو ساماں نکلا
قیس تصویر کے پرے میں بھی عیاں نکلا

دل میں ٹھہری نہ سناں کوئی گھڑی بھی یارب کس بلا کی اسے حال ہے روانی یارب
حسرت بوسہ سو فار نہ نکلی یارب زخم نے داؤدندی تنگی دل کی یارب

تیر بھی سینہ سہل سے پرافتناں نکلا

کون ہے جس کو ہے جمیبتِ خاطر حاصل کوئی آشفہ کوئی منتشر وں میں داخل

گھر ہو یا ہو کوئی شوریں سروں کی منزل بوئے گل نالہ دل دو در چراغ محفل

جو تری بزم سے نکلا سو پہریشاں نکلا

خوب لوٹے ہیں مرے دل میں تھی نعمت و کس کی تقدیر کہ یوں ہاتھ لگے دولت درد

کیوں نہ ہوتی مجھے ہر دم طلب کثرت درد دل حسرت زدہ تھا ماندہ لذت درد

کام یاروں کا بقدر لب ونداں نکلا

مدتوں دل کو رہی لذت آزار پسند تھارگ جاں کو دم خجیر خوشوار پسند

اب بقا اپنی نہیں ہی نہیں زہار پسند ہو تو آموزہ فنا ہمت دُشوار پسند

سخت مشکل ہو کہ یہ کام بھی آساں نکلا

قطرہ اشک جو آنکھوں سے بہا یا غالب رشک دریا اُسے مرگاں نے بنایا غالب

تار مرزائے پھرائیوں کا لگا یا غالب دل میں پھر گرہ یہ نے اک شور اٹھایا غالب

آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

کہتا ہو کون عشق میں فرما دے مرد تھا ہاں تھا جو کچھ تو قیس بیاباں نور و تھا

وہ کیا جو اک ضعیفہ کے حلے میں مرد تھا دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا

عشق نبرد پیشہ طبل گار مرد تھا

کچھ وقفہ حیات جو مجھ کو عطا ہوا تھا اس میں بھی فنا کا تصور بندھا ہوا
 گویا وطن میں تھا ویرِ غربت کھلا ہوا تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا
 اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

تحصیلِ درس ہر وفا کر چکا تھا میں الفت کے امتحان سے فارغ ہوا تھا میں
 بے ہری زمانہ سے نا آشنا تھا میں تا لیسنِ فتنہاے وفا کر رہا تھا میں
 مجموعہ خیال ابھی نہ رونہ دیتھا

سینہ کہ ایک نکتہٴ مشق جنوں ہو اب جو داغ ہو کہ زخمِ ہر وہ لالہ گوں ہو اب
 حالت ہر ایک عینو کی زار و زیوں ہو اب دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے نوحں ہو اب
 اس رہ گزریں جلوِ گل آگے گرد دیتھا

یاروں نے دل لگانے کو سمجھا ہر دل لگی حالانکہ آفتیں ہیں ہمیشہ نئی نئی
 ممکن نہیں نجاتِ طے غم سے جیتے جی جانی ہو کوئی کشمکش اندر و عشق کی
 دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

حاصلِ غرض ہوئی نہ مرے قہر و ہند سے تھا نہ عاکہ گھر میں یہ وحشی پڑا رہے
 چھوڑی نہ اپنی خود دل آوارہ گرد نے احباب چارہ جوئی و حشمت نکر سکے
 زنداں میں بھی خیالِ بیا بیاں نور دیتھا

مڑزا یہ رستمِ ظلم و ستم کیا یہاں کی ہے مٹی خراب بلبِل ہندوستان کی ہو
 شاکی جو اس زمانہ نافروداں کی ہے یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہو
 حقِ منفرت کرے عجب آزاد مروت کا



⑤ وعدہ پورا کبھی اُس شوخ کا کوئی نہ ہوا قصہ کوتاہ وفا عہد وفا بھی نہ ہوا
 فیض کچھ ہستی موہوم سے اس کی ہوا دہریں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا
 یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا

سب غلط ہو کہ زبرد وہی ہوگا اعلیٰ جس کا نظارہ کرے مارِ سیہ کو اندھا
 کس طرح کہیے کہ پتھر میں اثر یہ ہوگا سبزہ خط سے ترا کا کل سرکش نہ دبا
 یہ زمرہ بھی حریف دم افنی نہ ہوا

اس سے مایوس ہوا ہوں کہ جہاں چھوٹوں جیتے جی دامِ غم ہو شراب سے چھوٹوں
 غیر ممکن ہو کہ میں سرج و بلا سے چھوٹوں میں نے چاہا تھا کہ اندوہ و فاس سے چھوٹوں
 وہ رستم گر مرے مرنے پہ بھی رضی نہ ہوا

ہم جو اس بزم میں کتر ہیں تو کتر ہی ہیں کم ہیں زہاد سے رندوں کے برابر ہی ہیں
 آئینہ اپنا مکدر ہو مکدر ہی ہے دل گزر گاہ خیال می و ساغر ہی ہے

گر نفس جاوہر منزل تقویٰ نہ ہوا

ہو پتے تھے ترے لانے میں جو مصروف بھی مجھ کو ممنون بنانے کو تھے احباب سبھی
کھل گئی ان کی غرض تو نے بھی ٹالا ہی تھی ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کہ بھی

گوشِ منت کش گلبانگِ قسلی نہ ہوا

کس سے دل کھول کے کچھ شکوہ کلفت کیجے کون ہو کس سے بیانِ غم و حسرت کیجے
کس دعا کے لیے اُمیدِ اجابت کیجے کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے

ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سو وہ بھی نہ ہوا

ذکر کرتا تھا مسیحا کا جو سب سے غالب تنگ مرزا تھا غم و رنج و تپ سے غالب
منتظرِ مرگ کا تھا دیکھیے کب سے غالب مر گیا صدمہ کینِ جنش لب سے غالب

نا توانی سے حریف دم عیسیٰ نہ ہوا



(۶)

نہ کچھ مرغوب آنکھوں کو، نہ نظارہ گلستاں کا نہ سودا سر میں ہو حسن و جمالِ حور و غلاماں کا

ہمارا دل ہو وارفتہ بہارِ بزمِ جاناں کا ستائش گہر ہو زارِ اس قدر جس باغِ رضواں کا

وہ اک گلہ سہ ہو ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

لیا کرتا ہو کامِ ابرو سے ظالم تیغِ بڑاں کا شمار آساں نہیں جو روحِ جہانے چشمِ فٹاں کا

مگر اس پر بھی دل تسبیح خواں ہو نامِ جانان کا
بیاں کیا کیجیے بیدار کا و شہائے مرگاں کا

کہ ہر اک قطرہ خوں دانہ ہو تسبیحِ مرجاں کا

بہت کچھ سہی و کوشش کی کہ وکوں دیکھنا لوں
لبوں تک بھی نہ آنے دوں کبھی سینے سے نالوں کو

مدد دی صورتِ فیہ خرس دندان نے نالوں کو
نہ آئی سلوت قابل بھی مانع میرے نالوں کو

لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

خدا نا خواستہ داغ جگر اپنا جو جل اُٹھے
زبان شمع پیدا ہوا بھی ہر اک بنِ موسے

ابھی دیکھے کہاں ہیں تم نے شعلے سوز باطن کے
دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت مانے نے

مرا ہر داغِ دل اک تخم ہو سرو چرخاں کا

نظر آنے لگے چاروں طرف لاکھوں حسین تجھے
درو دیوار تیرے عکس رخ سے جگمگا اُٹھے

ہوئے آثار ظاہر یک بیک حدت میں کثرت کے
کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے

کرے جو پر تو خورشیدِ عالم شبنمستاں کا

بظاہر کتنی محکم خانہ تن کی بنا رکھی
مگر خود سعیِ صانع و جہ اسبابِ فنا رکھی

بنے گی صاعقہ اک دن یہی صانع کی دل گرمی
مری تعمیر میں مضمر ہو اک صورتِ خرابی کی

ہیوئے برقِ خرمن کا ہو خونِ گرم دھتال کا

دم ہیجان و حسرت پاؤں میں ہوتا ہو اک چکر
مری آہوں سے بن بن کر گولے اُٹھتے ہیں دن بھر

یہ نوبتِ سخن کی پہنچی کہ چٹکائے ن ہو صحرا پر
اگاہی گھر میں ہر سو بہرہ ویرانی تماشا کر
مدار اکٹھے دئے پر گھاس کے ہی میرے دریاں کا

مرے جل بجھنے کی دنیا کو ناعاقِ جستجو ہیں
جگر کی آگ کا اظہار کم نظروں کی خوشی ہیں
نہ شکوے ہیں لبِ سوزِ دل کی گفتگو میں ہیں
خوشی میں نہاں غمِ گشتِ لاکھوں رتوں ہیں
چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گوِ غریباں کا

تصویر میں جو وہ تصویرِ پُر انوار باقی ہو
یہ اک شکلِ تسلی بخشِ جانِ زار باقی ہو
ہوئے ہم خاک اس کی گرمیِ بازار باقی ہو
ہنوز اک پر تو نقشِ خیالِ بار باقی ہو
دلِ افسردہ گو یا چرہ ہی یوسف کے کنڈاں کا

مری قسمت بُری ہو آپ ہوتے ہمتیں ورنہ
یہ دوری دیدہ و دانستہ ہی رہتے قریب رنہ
پسند ایذا کرتے کیوں مجھے اندوہ گیں ورنہ
بغل میں غیر کی آج آپ سوئے ہیں کہیں رنہ
سبب کیا خواب میں آکر تبسم ہائے پہناں کا

سبب تیری خوشی کا میں نے مرجائے کو بھیج تھا
تراغم و بیکہ کر ٹھکرو قفلت ہی اپنے مرنے کا
میر میری تعزیت اور سب سے مل کر تارا ونا
انہیں معلوم کس کس کا ہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہی سرشکِ لودہ ہونا تیرے مرگاہ کا

کھلا ہی سامنے منظرِ عدم آباد کا غالب
بجھتا ہوا سے مرزا سفر کا منتہا غالب

اسی میں منتشر ہوتے ہیں اوراق بقا غالب نظر میں ہی ہماری جادو راہ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہی عالم کے اجزا پریشاں کا

④

کیوں ہو رہا ہو شیفتہ بربط نواز کا گردیدہ کس لیے ہی عراق و حجاز کا
ہر زباں پہ راگ اُسی بے نیاز کا محرم نہیں ہی تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہی پردہ ہو ساز کا

خداں جو میرے حال پہ وہ ماہ پارہ ہی جاگے نصیب و جہ پر اپنا ستارہ ہی
پڑمردگی پہ میری خوشی کا اشارہ ہی رنگِ کستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہی
یہ وقت ہی شگفتنِ گلہائے ناز کا

مٹا بھی ہی جو مجھے تو آدہ ستیز دشمن کے ساتھ رام ہی مجھ سے ہم و گریز
مجھے تنفر اور رقیبوں سے خیر دیز تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز
میں اور دکھ تری ترہ ہائے دراز کا

بیاب ہو گا صورتِ برق و شہر نہ میں آلے کہ ونگا درد سے شام و سحر نہ میں
خاموش ہوں جاؤں گا دردِ جگر نہ میں صرفہ ہی ضبطِ آہ میں میرا و گرنہ میں
طمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

سبکے ہیں اس کی بزم میں ارماں نکل ہے آبِ بقا کے چشمہ ہیں گو یا اُبل رہے
 مستوں میں پڑی پڑی ہیں عجب زور چل رہے ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اُچھل رہے
 ہر گوشہ بساطِ ہی سر شیشہ باز رکھا

اس کو ہی رات دن طلبِ تیر سینہ دوز مطلوبِ اس کو شام و سحر سوترِ سینہ سوز
 اس بواہوس کو چاہیئے اک زخمِ تازہ روز کاوش کا دل کرے ہی تقاضا کہ ہی ہنوز
 ناخن پہ قرضِ اس گر و نیمباز رکھا
 مرزا کے دل کی پوچھتے ہو بات کیا تہد صدقے میں عشق کے یہ بھرا گھر لٹا تہد
 برباد مفت گنجِ جوا ہر گیا اسد تاراج کاوشِ غم ہجران ہوا اسد
 سینہ کہ تھا دنیہ گہرائے راز رکھا



ہی نویدِ اہل سخن کو خیر کا منظر کھلا (۸) اب بزل و چو گو یا نکتہ سنجوں پر کھلا
 اس بہانے سے مگر داد و دہش کا در کھلا بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا
 رکھیو یا رب یہ درِ گنجینہ گو ہر کھلا
 زینتِ بزمِ فلک کا حال جب مجھ پر کھلا تب مسرت سے ذرا اپنا دل مضطر کھلا
 شاہِ خاور چھپ گیا روئے میر انور کھلا شبِ ہونی پھر انجمِ خشنود کا منظر کھلا

اس تکلف سے کہ گویا بت کردہ کا دکھلا

چاہیے مدت اگر یاروں کے گنواؤں فریب اس کی ہر اک بات میں چاہوں تو دکھلاؤں فریب
اعتبار ان کا مجھے کیونکر ہو جب پاؤں فریب گرچہ ہوں پوانہ پر کیوں دوست کا کھلاؤں فریب
استیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا

بزمِ جو میں اُس سے اس برتاؤ کی کب تھی مبد نشہ میں آئندہ ملنے کی بھی دیتا ہوں نوید
اس خوشی میں جہول وارفتہ سرگرم نشید گو نہ سمجھوں اس کی باتیں گو نہ پاؤں اس کا بھید
پر یہ کیا کم اؤ کہ مجھ سے وہ پری ہلکے کھلا

عمر بھر دل میں ہا شاہد پرستی کا خیال اب حقیقت کھل گئی اس کی کہ تھا اچھا خیال
اس بہشتی رو کا آخر آج کام آیا خیال ہو خیال حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال
خلد کا اک درای میری گور کے اند کھلا

واہ کیا ہر شو کا زینت وہ ہو حسن و نشیں حسن کے پر تو سے ہو جاتا ہو زیور بھی حسین
نور سے اس لئے تاباں کے ہو ہر شو خوشہ چین منہ نہ کھلنے پر ہی وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

گھر کی غلمت بیکھر بے فائدہ کیوں ہوں ملول جو بلا نازل ہو سر پر مجھ کو ہول سے قبول
کیوں شبِ یزید کا شکوہ بے تکلف نے زوے قبول کیوں اندھیری ہو شبِ غم ہو بلاؤں نزول

آج ادھر ہی کو رہنے کا دیدہ اختر کھلا

جب کیا قصد سفر تو تھا طبیعت میں خیال
اپنے بچکانوں کی الفت دیجیے دل سے نکال
کر دیا ترک وطن ترک تعلق ہو محال
کیا رہوں غربت میں خوش جلتا آؤنگی چال

نامہ لاتا ہو وطن سے نامہ برا کتر کھلا

میں نے دل پر نقش کر لی حضرت مرزا کی پند
چاپوسی اہل دنیا کی نہیں مجھ کو پسند
استانِ غیر پر کیوں جاؤں ہو کر مستمند
اس کی امت میں ہوں میں میرے پیچھے کا رہند
واسطے جس شہ کے غالب گنبد بے در کھلا

(۹)

اس کی آمد کے تصور میں جو میں بیتاب تھا
بند کا آنکھوں میں آنا اک خیالِ خواب تھا
اشکباری سے رواں اک سیلِ خونِ ناب تھا
شب کہ ہر وقت سوزِ دل سے زہرہ ابراب تھا
شعاعِ جوالہ ہر اک حلقہ رگِ داب تھا

کنج تنہائی میں ہیں تھا اور وہاں دربارِ عام
وہ عرو کے ساتھ ہنستے تھے مجھے سونے سے کام
میں بہاتا تھا یہاں آنسو وہاں تھا دورِ جام
واں کرم کو عذر بارش تھا غماں گیرِ خرام
گریہ سے یاں پنہاں بالش کفِ سیلاب تھا
میں یہاں سنبل کی صورت غم سے تھا آشفہ حال
اور وہاں آراستہ ہوتے تھے زلفوں کے بال

تھی یہاں حیرت وہاں تھی آنکھ کی دیکھ بھال وہاں خود آرائی کو تھا موتی پر فتنے کا خیال

یاں ہجوم اشک سے تارنگہ نایاب تھا

وہ وہاں کرتے تھے ہاتھوں سے حنا کی شست و شو بہہ رہا تھا دل یہاں سینے میں ہو ہو کر لہو

چاندنا گلشن میں تھا طلعت یہاں تھی چارسو جلوہ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو

یاں رواں شرکانِ چشم تر سے خونِ ناب تھا

سو گئے وہ سُمنے سُمنے قصہ خواں کی گفت گو اور یہاں برساکینا تا صبح آنکھوں سے لہو

فرشِ راحت پر وہ نئے اور ہم پریشاں کو بکو یاں سرِ شوریدہ بے خوابی سے تھا دیوار جو

واں وہ فرقِ نازِ محو بالِشِ سنجاب تھا

تھی یہاں اک ہیکسی موس و واں محفلِ جمی تھا یہاں دل صرف غمِ عشرتِ ہاں مسابقی

وہ وہاں تھے شمعِ محفلِ تھی یہاں اک کو لگی یاں نفسِ کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بے خودی

جلوہ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا

غش میں وہ محو تھے میں درد و غم میں مبتلا وہ وہاں خداں و فرحاں میں یہاں گرم بکا

وہ وہاں سرشارِ بادہ میں یہاں لبِ نشہ تھا فرش سے تاعیش واں طوفاںِ تھامجِ رنگ

یاں زمیں سے آساں تک سوغات کا باب تھا

شوقِ جہ سے زیادہ مجھ کو تڑپانے لگا سینہ سوزاں میں میرے آگ بھڑکانے لگا

چپکے چپکے میں کچھ اپنے جی کو سمجھانے لگا ناگہاں اس رنگ سے خونناہ پہچانے لگا

دل کہ ذوق کاوشِ ناعن سے لذت یاب تھا

شوق میں مضطرب مثالِ ماہی بے آب تھا مضطرب ایسا کہ گویا برق تھا سیما تھا

اس کی حالت سے پریشاں جلسہ احباب تھا نالہ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا

تھا سپندِ نرم وصلِ غیر گو بیتاب تھا

رات دن نالے ہو اس سے گوشہ زد تھے مثلِ ذی یاد ہی اس کے سوا گویا نہ تھی کچھ اور کی

جوشِ گریہ کے سوا بھائی نہیں ہو کوئی شو مقدم سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہو

خانہ عاشقِ مگر از صدائے آب تھا

اُس کے در کی خاک کو اٹس کہوں یا کہوں اس زمیں کے فرش کو یا فرشِ محل کا کہوں

ہو بجاقاظم سے نرمی میں اگر اعلیٰ کہوں نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں

پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا

تھا اُسی کے نور کا ہر چیز میں جلوہ عیاں ہو گیا کچھ بہرہ غفلت ہی حاملِ دریاں

حیف ہو یوں ہی گئی صحرا نوردی رائیگاں کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسانے ورنہ یاں

ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا

یاد ہو صیاد اپنا وہ زمانہ بھی تجھے اب و دانہ کی ہمارے فکر رہتی تھی تجھے

بیکسوں کے حال سے غفلت نہ کٹی اتنی تھی آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تھی

کل تلک تیرا ہی دل مہر و وفا کا باب تھا

آخر کدیا دیکھا ضد ہو گئے کچھ تو بہت دیکھ کر مجھ کو جو تو نے دام اکٹھا کر لیا

شوق سے یوں تیرے پھنڈے میں کی آیا بھی تھا یاد کرو وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا

انتظارِ صید میں اک دیدہ بچوا ب تھا

ہونے والا تھا بپا طوفان اس کے اشک سے پچھتے کیا ہو کہ اک قطرہ سے دریا بہے

خیریت ہی ہو گئی حرارت کہ آنسو ختم گئے میں نے رو کا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے

اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

⑩

ہم جو چاہیں کسی ذرے کا بیاباں ہونا ہی عیبِ چارہ و تدبیر میں حیراں ہونا

ممنوع کا کبھی ممکن نہیں امکان ہونا بس کہ دشوار ہی ہر کام کا آساں ہونا

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

ابرِ قرگاں نے جو ٹھہرائی ہی ہر سانے کی نوبت آئے نہ کسی دن مرے بہ جانے کی

شکل ہونے لگی ہر گوشے میں دیرانے کی گر یہ چاہے ہی خرابی مرے کا شانے کی

درودِ دیوار سے ٹپکے ہی بیاباں ہونا

بس جو دل پہ ہوم کچھ تو اسے رد کوں تو میں اس آوارہ کا تا چندر ہوں گا دلو
اپنے انجام کو سوچوں یہ مجھے ہوش بھی ہو دائے دیوانگی شوق کہ ہر دم مجھ کو

آپ جانا اُدھر اور آپ ہی جہاں ہونا

بختِ آئینہ ترے حسن سے کیا چمکا ہو سامنے آنکھوں کے بے پردہ رخِ زیبا ہو
خود نمائی کا جو ہوشِ شوق تو بیجا کیا ہو جلوہ از بس کہ تھا صفا رنگہ کہ تا ہو

جو ہر آئینہ بھی چاہے اور مرگاں ہونا

حاصل آنکھوں کو اور جو ذوقِ تجلے مت پوچھ انبساطِ دل سرگرم تماشا مت پوچھ
حسرتیں آج نکلنے کو ہیں کیا کیا مست پوچھ عشرتِ قتل گہ اہل تماشا مت پوچھ

عبیدِ نظارہ ہو شمشیر کا عریاں ہونا

یوں تو ہر دل میں ہو کس دل میں نہیں بکشا ہاں جگہ دل میں ہمارے ہی نہ کی دائے نشاط
جیتے جی سر میں رہی جوشِ شوق ہو دائے نشاط لے گئے خاک میں ہم داغِ تنائے نشاط

تو ہو اور آپ بصد رنگ گستاں ہونا

عشق نے ذوقِ ہر اک چیز کو بخشا ہو جدا سینہ مشتاقِ سناں سر کو تبر کا سودا
جانِ بے تاب کو ہوشِ شوق مندرا ہونے کا عشرتِ پارہٴ دل زخمِ تماشا کھانا

لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا

جیتے جی میرے نہ کی مکر و دغا سے تو بہ نہ ستم سے نہ کسی جرم و خطا سے تو بہ
بھول کر بھی تو نہ کی خوفِ خدا سے تو بہ کی مرے قتل کے بعد اس نے جہا سے تو بہ

ہائے اُس زود پشیمان کا پشیمان ہونا

ہوئی ہو حضرت ہر راز کو جو وحشت غالب پھر تو آ جاتی ہو بلبوس کی شامت غالب
جیب امن کی تو ہوئی ہو بری گت غالب حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گرہ بیاں ہونا

⑪

مجھ سے غم آشام کا احباب غم کھائیں گے کیا خوگر کلفت کو وہ آرام پہنچائینگے کیا
جو شمش و حشمت کے ہوتے زخم سلوائیں گے کیا دوست غمخواری میں میری سستی فرمائینگے کیا
زخم کے بھرنے تلک غن نہ بڑھ آئینگے کیا

اس طرح ٹالو گے قصہ سن سنا کر کب تلک یہ جھاکاری روا رکھو گے ہم پر کب تلک
ہوگی آخر حاجت عرض مکر کب تلک بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حال دل اور آپ نہ مانینگے کیا

دوست کیوں پند نصیحت پر تلے ہیں غمِ خواہ مجھ کو کچھ دیوانہ سمجھا ہو کسی نے واہ واہ
ہوں تنہا میں کہ آخر کیا ہوا مجھ سے گناہ حضرت ناصح جو آئیں دیدہ و دل فرشتہ واہ

کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیے کیا

قتل گمہ سے روز گونا کامیاب تاہوں میں وقتِ عرضِ مدعا قاتل سے شرماتا ہوں میں
دیکھیے تو راہ پر کیونکر اٹھیں لاتا ہوں میں آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں اب لائینگے کیا

چارہ سازوں نے جو زنجیروں سے باندھا یوں سہی ہی یہی ہیجانِ وحشت کا مداویوں سہی
ہو نہیں سکتا جو کوئی اور چارہ یوں سہی گر کیا نامح نے مجھ کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنوںِ عشق کے انداز چھٹ جائینگے کیا

ہنگامی اور طوق گردن گیر سے بھاگینگے کیوں خوگر ایذا ہیں ہم تعزیر سے بھاگیں گے کیوں
اس مناسب چارہ و تدبیر سے بھاگینگے کیوں خانہِ ناز و زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفانندان سے گھبراہٹیں گے کیا

یوں تو ہے یہ شہر اک منزلِ گمِ عشرتِ اسد ہر طرف ہی عیش کے ساماں کی کثرتِ اسد
پیش ہی با اینہمہ ہر را کو یہ وقتِ اسد ہو اب اس سمورہ میں قحطِ غمِ الفتِ اسد
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں ہے کھائینگے کیا

(۱۲)

ہیں اس کی بزم میں بھی اگر اذینِ بار ہوتا دل غمزہ نہ غم سے کبھی رستگار ہوتا

شبِ روزِ وقتِ حرام یہ آمید واپس ہوتا یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال پار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یوں ہی انتظار ہوتا

ہمیں پیشتر عیاں تھا تیرا وعدہ پر نہ آنا بس اب اور جھوٹ کہہ کر ہی عبتِ نقیب دلانا
نہ کر اب یہ عذر پہچانے تراش کچھ بہانا ترے وعدے پر جیسے ہم تو یہ جان بھوٹ جانا
کہ خوشی سے مرنے جاتے اگر اعتبار ہوتا

شکستِ عہدِ الفت ہو مقامِ حیرت افزا کہ نہیں یہ کام ہرگز کسی تجھ سے ناز نہیں کا
مگر اس قدر تو کھولا مئے دل نے یہ معما تری ناز کی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

تیرے ناکِ ستم پر دل و جاں فدا ہیں اب تو کہ نکال دیں انھوں نے مری حسرتیں تھیں جو جو
جو ملا ہی لطف کا وش وہ زباں سے کیا بیاں جو کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیر نکیش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ فقط میرا ہی دل تھا یہ میرا ہی تھا کلیجا ہزار صبر و تمکین بھی آفتوں کو جھٹلا
کسی کوہ میں کہاں ہو مری سوزِ غم کا یارا رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

یہ عجیب بات کی ہو کہ بنے ہیں دوستِ ناصح یہ انوکھی دل لگی کہ بنے ہیں دوستِ ناصح

کوئی چال یہ نہی ہو کہ بنے ہیں دوستِ صاحب یہ کہاں کی دوستی ہو کہ بنے ہیں ستِ صاحب

کوئی چارہ ساز ہونا کوئی غم گسار ہونا

ہوا جھٹ چارہ گر کو کہ جو تم سے مشتعل ہو نہیں دل کا کوئی چارہ جو یہ غم سے مضحل ہو

نہیں سہل غم سے چھٹنا یہ شریکِ آبِ گل ہو غم اگر چہ جانگسل ہو پہ کہاں بچیں کہ دل ہو

غمِ عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

نہیں شب ہی مجھ کو بھاری کہ دن اسے بھی سو ہو وہ بلائے جانگسل ہو تو یہ دیوِ جاں گزرا ہو

کبھی جان لبوں پر آئی کبھی دم نکل گیا ہو کہوں کس سے میں کہ کیا ہو شبِ غم بُری با ہو

مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہیں تھا جو شوقِ جلوہ تو قصورِ فہم کا تھا ہو مقامِ مشکر لیکن کہ خدا نے پردہ رکھا

رہی شرمِ اپنی رو نہ کسے تھا نظر کا یارا اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہو وہ کیسا

جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں و چار ہوتا

یہ کسی پر اپنا مرنا ہوا کھیلِ دوستوں کا کہ لگا دیا ہو سب نے سرِ قبر ایک میل

گئے اپنی جان سے ہم انھیں ہو گیا تماشا ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں غرقِ دریا

نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

ہوئی معرفت میں گویا جو تری زبان غالب تو سمجھ گیا ہو مرزا جو ہو تیری شان غالب

کوئی اب بھی تجھ سے کیونکر رہے بدگمان ہے
یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم دلی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

(۱۳)

بشر کرتا ہی بیجا ادعا کیا یہ کہہ سکتا ہی ترک مدعا کیا

اسے تو دمن ہی ہو گا کیا ہو کیا ہوس کو ہی نشاطِ کار کیا کیا

نہ ہو مرنا تو بیچنے کا مزا کیا

نہیں سمجھے ہو اب تک ماجرا کیا کہا کیا ہم نے اور تم نے سنا کیا

مالِ آخر ہی استفہام کا کیا تافلِ پیشگی سے مدعا کیا

کہاں تک ہی سراپا نا ز کیا کیا

عدو پر لطف و دونا دیکھتا ہوں روابط بھی زیادہ دیکھتا ہوں

مدارا میں اضافہ دیکھتا ہوں نواز شہا سے بیجا دیکھتا ہوں

شکایت سے رنگیں کا گلہ کیا

بہنو رہیں نغمہ پر دانا انا البحر عیاں موجوں سے آواز انا البحر

جوابِ بحر کو ناز انا البحر دلِ ہر قطرہ ہی ساز انا البحر

ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

ذرا اس بے زبان دل کی لہریں کچھ اپنی قدردانی کا گلہ سُن
 یسے بے بہا کہتا ہوں کیا سُن سُن اسی غارت گری جنسِ وفا سُن
 شکستِ قیمتِ دل کی صد کیا

ہوائے سنبل و سوسن نہیں ہوں طبیعتِ پلِ گلشن نہیں ہوں
 بسائیں کیا یہاں وہن نہیں ہوں داغِ عطرِ پیراہن نہیں ہوں
 غمِ آوارگی ہائے صبا کیا

کیا ہوں کیوں جفاکاری کا دعوئے جتا یا کیوں شنگاری کا دعوئے
 تجھے کیوں ہوں دل آزاری کا دعوئے کیا کس نے جگر داری کا دعوئے
 شکستِ خاطرِ عاشق بھلا کیا

ابھی تک مگر کہاں ساقی نے دی ہوں مگر حالتِ کمالِ نشہ کی ہوں
 کسی کی چشمِ میگوں دیکھ لی ہوں نفسِ موجِ مجبٹِ بخود سی ہوں
 فنا، فل ہائے ساقی کا گلہ کیا

عبثِ شمن کو جلوے کی ہوں کہ اس کو اک نگاہِ گرم بس ہوں
 اسے کیا سوزِ پہناں سے ہوں فروغِ شعلہِ خسِ یک نفس ہوں
 ہوس کو پاسِ ناموس و وفا کیا

کبھی تو جو ہر تیغِ نظر دیکھ پھر اپنے جاں نثاروں کے جگر دیکھ
 نہیں الزام تجھ پر بے خطر دیکھ مہا کیا ہی میں ضامن ادھر دیکھ
 شہیدانِ نگہ کا غول بہا کیا

اس اپنی آرزو پر مر مٹا ہوں کہ نصبِ لعینِ چشمِ سرمہ سا ہوں
 ہر تنِ شوقِ نظارہ ہوا ہوں نگاہِ بے مہا چاہتا ہوں
 تغافلِ ہائے تمکین آزا کیا

یہ ذکرِ جلوۂ فردا کیا کیوں ابھی سے کر دیا محشرِ بپا کیوں
 تغافلِ اس قدر رکھا روا کیوں یہ قاتلِ وعدہ صبر آزا کیوں
 یہ کافرِ فتنہ طاقتِ بپا کیا

کہے کیا کوئی اس کی باتِ پبات کہ ہوا فصول و جادو سرِ بسات
 نہیں ہو کوئی ہر زاوے اثرِ بات بلائے جاں ہو غالب اس کی ہبات
 عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

کون کہتا ہے کوئی عاشقِ شہیدانہ ہوا (۱۴)
 ہاں یہ دعویٰ ہو کہ ہمسا کوئی ہو گانا ہوا
 اپنی یکتائی کا دعویٰ ہمیں بے جا نہ ہوا
 درخوہِ قہر و غضب جب کوئی ہمسا نہ ہوا

پھر غلط کیا ہے کہ ہمسائی کوئی پیدا نہ ہوا

ہم سے کہیں نہ یہ اُمید کبھی ابل کر م بند ہی در تو کریں طوفِ مہا دیں بہم
زخمِ دُختر ہو بہاں فقر و غنا پر ہر دم بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود ہیں ہم

اُسے پھر آئے درِ کعبہ اگر وہ نہ ہوا

حسن کا تیرے زمانے میں ہی سکھایا سامنے ماہِ مہین کوئی گھڑی جم نہ سکا
شرم سے ہر جہان تاب بھی ہو و بقفا سب کو مقبول ہی دعویٰ تری یکتائی کا

رو برو کوئی بستِ آئینہ سیما نہ ہوا

کب تری آنکھ کے بیمار نے چاہا دریاں کب ہوا چارہ گروں سے یہ دوا کا خواہاں
چشمِ بد دور اُسے ہی یہ مرضِ راحتِ جاں کم نہیں نازش ہمنامی چشمِ خواہاں

تیرا بیمار بُرا کیا ہی گر اچھا نہ ہوا

کیا فغاں ہے وہ فغاں جس سے کوئی دل نہ ہلا کیا کہیں آہ پھر اُس آہ کو جو ہونہ ر سا
ہے وہ فریادِ عبت جس سے کوئی گھر نہ جلا سینے کا داغ ہے وہ نالہ جو لبِ تک نہ گیا

خاک کا رزق ہے وہ قطرہ جو دریا نہ ہوا

جھیلتا ہوں جو شبِ روزِ غم و سنج و بلا یہی مقصود تھا شاید کہ مری خلقت کا
کوئی حرام نہ وہ کیا روزِ ازل اور نہ بقا نام کا میرے ہے جو دکھ کہ کسی کو نہ ہوا

کام میں میرے ہی وہ منتہ کہ پر پانہا
 سن کے ذکر تپش قلب ہے صبر کی تاب داستانِ شبِ غم اور نہ اٹے آنکھوں سے خواب
 سوزِ دل کا ہو بیاں اور جگر ہو نہ کباب ہر بنِ محسوسے دم ذکر نہ ٹپکے خوں ناب
 حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چہر چاہ نہ ہوا
 جرمِ محرم میں نہ ہو جلوہٴ مینا نہ مل ذرہ ذرہ میں نہ ہو سیرِ بیا باں و سبل
 غنچہٴ گل میں نہ آجائے نظر گلشن و گل قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ ہے اور جزو میں کل
 کھیل لڑکوں کا ہوا دیدہٴ مینا نہ ہوا
 مدتوں خط و کتابت رہی مرنے اُس سے تب کہیں قتل کا اقرار کیا قاتل نے
 آج کچھ قتل کے سامان بھی مقتل میں ہوئے تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
 دیکھتے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہو

❦
 (۱۵)

بجا ہی تم کرو جو کچھ گلہ اپنے فدائی کا ادا اس سے نہ کچھ بھی ہو سکا حقِ آشنائی کا
 نہ پہنچا بزم تک تو عذر ہی بیدست و پائی کا پستے نذرِ کرم تحفہ ہی شرمِ نارسائی کا
 بچوں غلطیہٴ صدرِ رنگِ عجبے پارسائی کا
 ابھی تک تو رہا پردہٴ تمھاری خوشِ ادائی کا نہ ہو جائے کہیں نیا میں شہرہٴ دلربائی کا

کسی دن رنگ لائے گا یہ لپکا خود نمائی کا نہ ہو حسن تماشا دوست رسوا بے وفائی کا

بمہر صد نظر ثابت ہے دعوئے پارسائی کا

ترے نور و ضیا سے فیض ہر و ماہ کو پہنچا مگر حسرت کشاکش میں ہی رہا تیرے جلی کا
ترے در پر جو سائل آگیا خالی نہیں جاتا زکوٰۃ حسن دے دی جلوہ بینش کہ مہر آسا

چراغ خانہ درویش ہو کا سہ گدائی کا

اہیں تو یہ تمنا تھی کہ سر ہوا و تیرا خیر سر منقل کہا کس نے کہ اے قاتل عایت کر
یقیناً تجھ سے ہوگی باز پرس اس کی سرخسٹر نہ مارا جان کر بے جرم غافل تیری گردن پر

رہا مانند خون بے گنہ حق آشنائی کا

محمد اللہ جب سے شیوہ طلی لسانی ہو نہ قصہ درد کا لب پر نہ کچھ غم کی کہانی ہو
خوشی میں بسر ہوتی ہے اچھی زندگانی ہو تمنائے زباں مجھ سپاس بے زبانی ہو

مٹا جس سے تقاضا شکوہ بے دست و پائی کا

مرے زخموں کی صورت کے جوتی صورت گل ہے اسی صورت کا صد قرہ کہ قد و قیمت گل ہے
مرے ہی خوں شدہ دل کا تصدق حیرت گل ہے وہی اک بات ہے جو بیاں نفس و ہاں بہت گل ہے

چمن کا جلوہ باعث ہے مری نگیں نوائی کا

دفا داروں سے بھی تو نے جوید ہمہ کی ٹہنی شکایت بے دہن لگوں کے لب تک بھی می آئی

حسینوں سے زبانِ طعن آخر تو نے کھلوائی وہاں ہریت پناہ جو زنجیرِ سسوائی
 عدم تک بے وفا چرچا ہی تیری بیوفائی کا
 نہوگا ختم نامہ یوں تو چاہے جس قدر لکھدے
 پڑھے گا کون تو دفتر کے دفتر بھی اگر لکھدے
 مناسب ہی کہ مرزا کی طرح مصراع ترکھدے
 ندے نامے کو اتنا طول غالب مختصر لکھدے
 کہ حسرتِ سنج ہوں عرض ستمائے جہائی کا

(۱۶)

چپ ہے تو اس راحت کا گماں ہو جائے گا جو گلہ دل کو ہی دل ہی میں نہاں ہو جائے گا
 جو بیاں سے مدعا اور ایگماں ہو جائے گا گر نہ اندوہ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا
 بے تکلف داغِ مہر دہاں ہو جائے گا
 ہیبتِ غم سے ہی بیڈھیل کو کر بے اضطراب ہی شبِ رمہ میں طبیعت کو بلا کا بیچ و تاب
 جزر و مد میں کہیں پیدا نہ کرے ماہِ تاب زہرہ گرا ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہو آب
 پر تو مہتابِ سیلِ خامناں ہو جائے گا
 استراحت میں ہی کس انداز سے وہ سہمہ سورہا ہی مست صہبائے جوانی بے خبر
 میں عجیبِ بیم ورجا میں ہیں یہ حالت دکھ کر لے تولوں ہوتے ہیں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر
 ایسی باتوں سے وہ کا فر بدگماں ہو جائے گا

ہم کو دعویٰ ابتدا میں تھا بہت کچھ عشق کا
 آنکھ جب س سے لڑی سب حوصلہ جاتا رہا
 عمر بھر الفت بنا سینگے یہ اپنا قصہ تھا
 دل کو ہم صرف وفا سمجھتے تھے کیا معلوم تھا

یعنی یہ پہلے ہی نذر امتحان ہو جائے گا

تیری مرضی سے ہو وابستہ زمانے کی ضیا
 تو نے چاہا جس کو مقبول دو عالم کر دیا
 اُس سے دُنیا پھر گئی تو جس سے ناخوشی گیا
 سب کے دل میں ہی جگہ تیری جو تو راضی ہوا

مجھ پہ گویا اک زمانہ ہرماں ہو جائے گا

ہی جو مجھ کو فرط غم میں لیں ہی خوں لونے کا خط
 ایک ن ہو جائینگے دونوں کے دونوں موجود خط
 اور گھٹنے میں ہا یوں ہی جگر اور دل کو ربط
 گر نگاہ گرم فرماتی رہی تسلیم ضبط

شعلہ خس میں جیسے خوں لگ میں نہاں ہو جائے گا

دیکھ کر نالاں مجھے مرغِ چمن میں نوہ گر
 ہونو جائیں چاک چاک اس غم سے چنچوں کے جگر
 میری حالت پر کٹ افسوس ہیں برگِ شجر
 باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر

ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں نشاں ہو جائے گا

منتظر میں بھی ہوں فردائے قیامت آئے تو
 اک بڑی امید پر جھیلایا تیرے ظلم کو
 اپنی اپنی داد اسی دن پائیں گے انصاف جو
 داسے گر نہ اتر انصاف بخشش میں نہ ہو

اب تک تو یہ توقع تھی کہ وہاں ہو جائے گا

یاد رکھ سننے کے قابل پسند مرزا ہی آسند ہوش میں آکھیا ہوا دل کس کو دیتا ہی آسند
 مبتلا اک طفل پر ہونا کچھ اچھا ہی آسند فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہی آسند
 دوستی ناداں کی ہی جی کا زیاں ہو جائیگا

(۱۷)

یوں تو میرا علاج کیا نہ ہوا کم مرض ہی مگر ذرا نہ ہوا
 مجھ پر احساں طیب کا نہ ہوا درد منت کش دوا نہ ہوا
 میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

ہو گئے رُسوا تمھیں کہا مانو بات بڑھ جائے گی بہت پس تو
 چل کے سن لو الگ جوسنتے ہو جمع کرتے ہو کیوں قیہوں کو
 اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

اور تجھسا حسین کہاں سے لائیں حسرتِ دل کی خاکس سے پائیں
 کس کے ہاتھوں سے زخمِ دل بکھائیں ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
 تو ہی جب خنجر آزمانہ ہوا

سخن تلخ کب ہوا ان کے قریب ان سے باتیں سننے کیسے نصیب
 ہوا حلاوت ہی کچھ سخن میں عجیب کتنے شیریں ہیں یہی لبتِ قریب

گالیاں کھائے بے حزا نہ ہوا

جب ہمیں سن تھی اُن کے لانے کی استطاعت تھی گھر جانے کی

اب جو بدلی ہو اڑمانے کی ہو خبر گرم اُن کے آنے کی

آج ہی گھر میں پوریا نہ ہوا

جان طاعت ہی میں کھائی تھی کچھ خودی تھی نہ خود نمائی تھی

سر کھٹا سجدہ تھا جبہ سائی تھی کیا وہ ٹروہ کی خدا فی تھی

بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

قابلِ فخر کیا ہو بات اپنی عین احساں ہو اس کی خوشنوی

ہم نے اس پر نثار کیا شو کی جان دی دی ہوئی ہی کی تھی

حق تو یہ ہو کہ حق ادا نہ ہوا

غم سے خالی نہ کوئی دم گزرا کیا ٹھکانا ہو کم نصیبی کا

کچھ نہ کچھ سلسلہ لگا ہی رہا زخم گردب گیا لہو نہ بھٹا

کام گرک گیا روا نہ ہوا

دعویٰ دوستی زبانی ہو دل میں تو دشمنی کی ٹھانی ہو

قہر ہو یا یہ مہربانی ہو رہزنی ہو کہ دوستانی ہو

یہ کے دل دلتاں روانہ ہوا

مثل حرّ زامصر وہ رہتے ہیں جی میں گھٹ گھٹ پھوٹ بہتے ہیں
سب غم انتہا رہتے ہیں کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں

اج غالب غزل سرانہ ہوا

(۱۸)

یہی ہمیشہ نشیمن رہا تمنا کا رما ہی در داسی میں تمام دنیا کا
مگر اب اسے درکار پہن صحرا کا گلہ ای شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا

گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

ترا خیال و تصور جو دل کو ہی محبوب اسی سے نامہ نویسی کا شغل ہی مرغوب
مجھے امید کرم اور تجھ سے ہو کیا خوب یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخ مکتوب

مگر ستم زدہ ہوں ذوق خام فرسا کا

نہ ہوئے گل بوش روزگار اگر ہی یہی پسے گا زیر قدم سبزہ زار اگر ہی یہی
لے گا دہر نقش دنگار اگر ہی یہی خانے پائے خزاں ہی بہار اگر ہی یہی

دوام کلفت خاطر ہی عیش دنیا کا

ہنسی کا خاک سلیقہ نہیں کسی گل کو کہیں پیبر و متا شانہ رنج افزا ہو

چمن کا قصد ہوا رو تو مجھ کو ساتھ نہ لو غمِ فراق میں تجلیفِ سیرِ باغِ ندو

مجھے دماغ نہیں خندہ لائے بیجا کا

مثال آنہ ہیرت زدہ سراپا ہوں اُمید وار تجلی روح افزا ہوں

رہنِ شوق ہوں سرنا بپا تمنا ہوں ہنوز محرمی حسن کو ترستا ہوں

کرے ہو ہر بنِ مو کا مچشمِ بینا کا

اب اور کیا ہو کہ انداز اُس سنگ کے دمِ فطارہ طلبگار جس کے ہیں ہم سے

اشارہ جان کا ہو گا تو یہ بھی دیدنی کے دل اس کو پہلے ہی ناز واداسے سے بیٹھے

ہیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

مرے سرشک کا انداز سخت مشکل ہو کہ قطرہ قطرہ میں پوشیدہ بحرِ کمال ہو

حساب کا کوئی دعوے کرے تو باطل ہو نہ کہہ کہ گریہ بہ اندازِ حسرتِ دل ہو

مری نگاہ میں ہو جمعِ خجِ دریا کا

ستم جو اس کے اٹھاتا ہوں لہو شاد نہ نہیں کسی سے طلبگارِ عدل واداست

نہ مجھے اس کو نہ مرزا سے ہو عناد نہ فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں کس کو یاد نہ

جہاں میں اس کی ہو انداز کا فرما کا

(۱۹)

اس نے جب خست پئے قطع منازل باندھا چھڑے ناقہ مرے گھر کے مقابل باندھا
میں نے بھی عہدِ سفر دہرے کامل باندھا جب بتقریب ہر قریب نے محل باندھا
پیش شوق نے ہرزہ پہ اک دل باندھا
قتل کر دینے میں عشوہ تھا بڑا وستِ راز بانی قتل کر شتمہ تھا منگمہ تھی غماز
دیکھ کر آئندہ جب ہو گئے قتال انداز اہل بنیش نے ہجرت کردہ شوخی ناز
جو ہر آئندہ کو طوطی بسمل باندھا

منہ ہی جس کا نہ کبھی عرضِ تمنا میں کھلا اس کو حراماں کے سوا اور یہاں کیا ملتا
کام کچھ سہل نہیں تھا طلبِ مقصد کا یاس و اُمید نے اک عرصہ میاں مانگا
عجزِ ہمت نے طلسمِ دل سائل باندھا
اس بیاباں میں ہی حیرانِ دل محزونِ غالب حالِ ہرزہ انجوس میں دیگر گوں غالب
ہو گیا فکرِ مضا میں جگرِ غوں غالب نہ بندھے تشنگیِ ذوق کے مضمونِ غالب
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

(۲۰)

اگر میں صورتِ قہر نہ دریا سے جدا ہوتا تو کیوں پریش قصہ بحثِ ہمتِ نیست کا ہوتا

مگر ہاں نفی سے اثبات پیدا ہوتا نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ڈوبیا مجھ کو ہونے نے نہ ہونے میں تو کیا ہوتا

دل بیمار تو فکر وفا میں گھس گیا اپنا جگر باقی رہا تھا اس کو ورغش کے کھایا

جھکا بارالم سے فرق یوں پہرے نہیں اٹھتا ہوا جب غم سے یوں بچیں تو غم کیا سر کے کٹنے کا

نہ ہوتا اگر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

اُسی کی یاد میں آٹھوں پہر دل تملتا ہے تصور اس کا ہر زلزلات دن دل کو دکھانا ہے

خیال اس کا بھلا کچھ طرغیں سے جاتا ہے ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے

وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں آتا تو کیا ہوتا



کب کوئی باعثِ خونباری مرگاں سمجھا کب کوئی علتِ آہِ شمرِ افشاں سمجھا (۴۱)

کوئی غمخوار نہ حالِ دلِ نالاں سمجھا وہ مری چینِ جبین سے غم نہاں سمجھا

رازِ مکتوب بہ بے بڑی عنوان سمجھا

لوٹ دنیائے مکرر ہی مرا سینہ ہنوز دل میں باقی ہے ابھی کلفتِ یربہ ہنوز

خاک بھی شکلِ صفائی نظر آئی نہ ہنوز یکا لک بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز

چاک کرتا ہوں میں جس دن سے گریباں سمجھا

حزن و اندوہ میں نا چاری خاطر مت پوچھ زیست باعث بیزاری خاطر مت پوچھ
 حال دشواری و بیماری خاطر مت پوچھ شجہ اسباب گرفتاری خاطر مت پوچھ
 اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں ندائ سمجھا

کب مینطور ہی وہ جلوہ نما ہو سر بام کب گوارا ہو کہ وہ رخ ہوں نظر گاہ عوام
 چاہتا ہوں ہے مستور وہ شوخ خود کام بدگمانی نے نہ چاہا اسے سرگرم خدام

رخ پہ قطرہ عرق دیدہ جیراں سمجھا
 چھیڑ کر غیر نے اُس کو جو غضب ناک کیا آگ ہو کر صفت شعلہ آتش بھڑکا
 باعث طیش تو اغیار کا سفلہ پن تھا عجز سے میں نے یہ جانا کہ وہ بد خو ہوگا
 نبض جس سے تپش شعلہ سوزاں سمجھا

قطع منزل کے لیے میں نے مکر تو باندھی پر نقاہت نے اجارت پہے رفتار نہ دی
 نوبت آئی نہ تھی دو ایک قدم چلنے کی سفر عشق میں کی ضعف تے رحلت طلبی

ہر قدم سایہ کو میں اپنے شبستاں سمجھا
 کوئی پہلو بھی تو نہ بچنے کا نہیں تھا دم مرگ نشتر آخر رگ جاں نے وہی کھایا دم مرگ
 پیش آیا وہی تھتیر کا لکھا دم مرگ تھا گریزاں مژدہ بار سے دل تا دم مرگ
 دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا

یوں تو تم بھی اُسے کہتے تھے جفا کار اُسے پھر بھی ہرگز اُسے کیا تھا تمہیں ہشیار اُسے
کیوں تھے دیدہ و دانستہ گرفتار اُسے دل دیا جان کے کیوں اُس کو وفادار اُسے
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلمان سمجھا

(۲۲)

پھر مجھے یار کا دیا دیا آیا اپنا پھوٹا ہوا سر یا دیا آیا
پھر وہی خونِ جگر یا دیا آیا پھر مجھے دیدہ و تر یا دیا آیا
دل جگر تشنہ فریا دیا آیا

تھا ترا ہجر عذابِ جانسوز لفظِ نصرت تھا سانِ دل و دوز
پھر نصیبوں نے دکھایا یہ دوز دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز

پھر ترا وقتِ سفر یا دیا آیا

جب ملا آنکھ پھر الی اپنی نظرِ لطف کسی دن نہ ہوئی
کی نہ اک وزِ تنافل میں کمی سا دیکھائے تمنائیں

پھر وہ نیزنگِ نظر یا دیا آیا

کیوں نہ فریا دے مجھے ہو مشکل آئے منہ میں ہیں سینہ گھائل
میں کہاں آہ و فغاں کا قابل عذر و امانہ کی اے حسرتِ دل

آلہ کرتا تھا جگر یاد آیا

جستجو گر نہ تری کی جاتی پھیبیت ہی نہ جھیلی جاتی

ہاں کیوں مفت میں اپنی جاتی زندگی یوں بھی گزری جاتی

کیوں ترا راہ گزری یاد آیا

مانتا ہوں وہ جگہ ہے اچھی ہیں ہاں عیش کسمان سبھی

کیا کروں گا جو طبیعت نہ لگی کیا ہی رضوان سے لڑائی ہوگی

گھر ترا خلد میں گری یاد آیا

اب کہاں ضعیفے یا بے نقاس آہ کی تابش نالوں کی تو اس

جی لرزتا ہے جو طئی ہو زبان آہ وہ جرات فریاد کہاں

دل سے تنگ کے جگر یاد آیا

دل میں وہ رہ کے جو آتا ہے خیال کیا بلا دیکھیے لانا ہے خیال

پھر مجھے غم میں پھنسا تا ہے خیال پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال

دل گم گشتہ مگر یاد آیا

خاک ابھی ہیں نے کہاں چھائی ہے دل ٹھکرتا ہے پریشانی ہے

فرط ہیبت سے جگر پانی ہے کوئی ویرانی سی ویرانی ہے

دشت کو دیکھ کے گھریا د آیا

قدر مسکن کی ابھی جانی ہو یہی اس میں بھی پریشانی ہو
یہ ہمیش وہ لاشانی ہو کوئی ویرانی سی ویرانی ہو

دشت کو دیکھ کے گھریا د آیا

قائل اس کا ہر انسان شاید کہ بدی کی ہو محافات بھی بد
جرم ہونے کو تھا ہر اس سرور میں نے مجنوں پہ لکین ہیں اسد
سنگ اٹھا یا تھا کہ سر یا د آیا

۲۳

آپ کے ساتھ کوئی دشمن بے پیر بھی تھا
دیر کرنے میں کوئی مائل تدبیر بھی تھا
سست رفتار کوئی از رہ تیر بھی تھا
ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

تم نے جو کام کیا غیر مشیت نہ کیا
دوں جو تنہا تھیں الزام تو ہی میری خطا
تھا تقدیر جو مرے واسطے ہونا وہ ہوا
تم سے بیجا ہی مجھے اپنی تیاہی کا گلا
اس میں کچھ شائبہ خوبی تقدیر بھی تھا

شاہد حال ہی ہر چہند مرا حال زلیں
سخت حیران ہوں کہ کیونکر تجھے آگاہ کروں

کچھ خبر بھی ہو کہ میں عاشقِ دیرینہ ہوں تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں
کبھی فراق میں تیرے کوئی پنچیر بھی تھا

مجھ سے کہتا ہو کہ تو کون ہو کیا بتلا دوں عاشقِ زار ہوں کیا اس کے سوا بتلا دوں
نہ رہا ہوں جو تجھے یاد تو آبتلا دوں تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں
کبھی فراق میں تیرے کوئی پنچیر بھی تھا

حد سے گزری ہوئی تھی چاہہ گروں کی بیڈ بھول کر بھی تو نہ لب پر کبھی لایا فریاد
دل پریشاں ہوں میں بھی تو رہا خورم و شاد قید میں بھی تھے وحشی کو رہی لفت کی یاد
ہاں کچھ اک رنجِ گرانباری زنجیر بھی تھا

محفلِ یار میں اللہ کے اس کا عنصر حق تو یہ ہی کہ بڑے بول کا سر ہی نیچا
خوش ہوں اس سے کہ اثر کچھ تو ہوا آہوں کا دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا
نالہ کرتا تھا ولے طالبِ تاثیر بھی تھا

وصلِ شیریں سے وہ گو ہونہ سکا شیریں کام کر گیا کام تو ایسا کہ رہا نامِ مدام
کہتے ہیں سنگتراشی کو جو آپ ادنیٰ کام پیشے میں عیب نہیں کہتے نہ فرما دو نام

ہم ہی آشفۃ سروں میں ہوا نمیر بھی تھا

سینہ زانو سے جو اس نے نہ دبایا نہ سہی خنجر تیز گلے پر نہ چلایا نہ سہی

ہاتھ تھم شیر کا بڑھ کر نہ لگتا یا نہ سہی ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی

آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

ہم پہ فائق جو سمجھتے تھے کبھی اپنا حق ان کو یہ خفیہ نویسی کا ملا کیسا حق

ان کی تحریر کو کیوں مانیے سرتا پا حق پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے کھچے پر ناحق

آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

رکھتے تھے دیدہ دیدار طلب شوق لقا پھر جو دیکھا تو سنٹھے دید کا یار اپنی تھا

جلوہ دیکھا بھی مگر دل کا نہ ارماں نکلا بجلی اک کو نہ گئی آنکھوں کے آگے تو کیا

بات کرتے کہ میں لب تشنہ تقریر بھی تھا

دی جو تشبیہ سے مہر و رخشاں سے کبھی آگ غصے سے ہوا چہرے کی رنگت بدلی

اس کی تمثیل ہی گویا کوئی دنیا میں نہ تھی یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی

گر بگڑ بیٹھے تو میں لایق تعزیر بھی تھا

انخاری سے توجہ چاہو وہ کہلو غالب تم پہ دیکھا نہیں مہر زانے کسی کو غالب

کوئی دعوے سے ذرا آگے کہے تو غالب ریتختے کے تھیں استاد نہیں ہو غالب

کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

(۲۳)

دنیا میں کبھی کیا کوئی دل بر نہ ہوا تھا بکیش و جفا پیشہ و کافر نہ ہوا تھا
سفاک مگر تیرے برابر نہ ہوا تھا تو دوست کسی کا بھی ستگر نہ ہوا تھا

اور وہ یہ ہو وہ ظلم جو مجھ پر نہ ہوا تھا

قدرت جو لگی اور حسینوں کو بنانے اُس کا کوئی ہمتا ہو نہ چاہا یہ خدانے
پائی نہ تھی تکمیل ابھی نور و ضیائے چھوڑا نہ نخب کی طرح دستِ تھنائے
خورشید ہنوز اُس کے برابر نہ ہوا تھا

کم فخر میں سے نہیں کچھ اشک ہمارے آنسو نہ ہوئے ہوتے تو گوہر یہی بنتے
ہو مادہ تو ایک ہی ایجاد میں ان کے توفیق بہ اندازہ ہمت ہو ازل سے
آنکھوں میں ہو وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

ابرو سے عیاں خیرِ خوار کا عالم مست آنکھ مگر فتنہ بیدار کا عالم
ہو جس سے بپا حشر وہ رفتار کا عالم جب تاک نہ دیکھا تھا قہار کا عالم
میں معتقِ رفتہ محشر نہ ہوا تھا

قسمت یہ کہاں تھی کہ کبیدہ اسے دیکھوں آنکھوں سے ٹپوں پاؤں غشاہ کے مزے لوں
برسوں سے تمنا تھی کہ روٹھے تو مناؤں میں سادہ دل آزر دگی یا اسے خوش ہوں

یعنی سبقِ شوق مکرر نہ ہوا تھا

لکھنے میں فرشتوں نے سمن نہ کو کیا خشک اک لمحہ مسلم کو کبھی ہونے نہ دیا خشک
عاصی ہوں میں ایسا کہ قدم رکھتے ہی تھا خشک دریا، معاصی شگافِ بی سے ہوا خشک

میر اسرارِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

کیا سوز نہاں پر کسی آتش کو ہو تفصیل جو اس سے فوائد دیتے نہیں قابلِ تفصیل
سینہ تھا مرا درہم و دینار کی زنجیل جاری تھی اس دروغِ جگر سے مری تحصیل
آتش کدہ جاگیرِ سمن در نہ ہوا تھا

(۲۵)

میں کب فدائے خنجرِ قاتل نہیں رہا کب تیغِ نازِ یار کا بسمل نہیں رہا
لیکن وہ ضبطِ اب مجھے حاصل نہیں ہا عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

دل میں بھرنے ہیں لاکھ غم اس کے لیے ہوئے پوچھو نہ سرگزشت کہ لب ہیں سیئے ہوئے
آیا تھا میں بقا کا ہتھیہ کیئے ہوئے جانا ہوں داغِ حسرت ہستی لیے ہوئے
ہوں شمعِ کشتہ درخویرِ محفل نہیں رہا

دشمن تھے اس کے سامنے سینہ سپر کہ میں پھرتے تھے ہاتھ پر وہ لیے اپنا سر کہ میں

اب غیر ہیں کہ جن سے پھری ہو نظر کہ میں مرنے کی اور دل اور ہی تدبیر کر کہ میں

شایان دست بازوئے قاتل نہیں رہا

یکساں گداؤں شاہ سے یہاں ساز و باز ہو محمودِ حسنہ نوری کے برابر آیا نہ ہو

دل صاف ہو کسی سے نہیں احتراز ہو برہ و سسش جہت در آئندہ باز ہو

یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

جب سے کھٹا ہوا ہو تصور میں باب حسن پیش نظر ہو آٹھ پہر آفتاب حسن

اٹھا ہو درمیان سے گویا حجاب حسن واکروییئے ہیں شوق نے بند لقا حسن

غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

تھا صبح و شام درپے کیس چرخ کج مدار تھا غم سے وقف در و خوش سینہ تھا و نگار

دل تھا ہزار کاوش حراماں سے بیقرار گو میں رہا رہیں ستم ہائے روزگار

لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

خوننا بہ جگر سے سدا مثلِ باغباں ہم سینچتے رہے چمنِ الفتِ بتاں

دیکھا مال کو تو تر و تھار اے گاں دل سے ہولے کشتِ فامٹ گئی کہواں

حاصل سوئے حسرت حاصل نہیں رہا

یہ تیغ آرمائے تو حاضر ہو سراسر کھینچے یہ تیرا اگر تو ہو سینہ سپر اسد

مرزا ہوں کھیل جاؤں گیں جان پر ہند بیداد عشق سے نہیں ڈرتا اگر اس
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں با



(۲۶) جس کو ہم سمجھتے تھے یا رہبر ہاں اپنا ہو گیا وہی دشمن آہ ناگہاں اپنا
ہم نے اپنے ہاتھوں سے کر لیا زیاں اپنا ذکر اس پر یوش کا اور پھر سیاں اپنا
بن گیا قیوب خرتھا جو راز داں اپنا
ان کو تھی ہوسنا کی بکشی میں تھی کب پیتے تھے جو میے ساتھ کرتے تھے فقط تراب
ضد ہی کچھ سر محفل ان کو چڑھ گئی بیہب محو وہ کیوں بہت پتے بزم غیر میں بارب
آج ہی ہوا منظور ان کو امتحان اپنا
حال اضطراب لکچھ اُسے دکھا سکتے نالہ کے ذریعہ سے دکھا اُسے سنا سکتے
لطف اس کے جلوے کا دمبدم اٹھا سکتے منظر اک بلندی پر اور ہم ہٹا سکتے
عرش سے اُدھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا
بستر اُس کے کوچے میں اک طرف چالینگے جو کڑی پڑے گی اشق سے اٹھا لینگے
اب تو اس سے ملنے کی راہ کچھ نکالیں گے دے وہ جس قدر دولت ہم ہمیشی میں لینگے
بارے آشتا نکلا اُن کا پاساں اپنا

دل میں ہو کہ ملنے کی خود ہی اُن سے ٹھہراؤں سلسلہ کتابت کا درمیاں سے اُٹھواؤں
نامہ بر سے کیا ہو گا خود ہی ان کو سمجھاؤں در و دل لکھوں کب تک جاؤں انکو دکھلاؤں
انگلیاں ٹھکار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا

ہو گیا ہوں جب عادی آستان کے سجدوں کا پھر بھی تو ہیں آخر ہوں گائیں جہیں فرسا
پڑے پڑے جرات اور ن سجدے میں یہاں کرتا گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا
تنگ سجدہ سے میرے تنگ آستان اپنا

لاکھ اس کی محفل میں غیر کی رسائی ہو اب کسی بُرائی میں لب ذرا ہلائے تو
اس کے منہ سے کہلایا ہم کو کہنا تھا جو جو ناکرے نہ غمازی کر لیا ہو دشمن کو
دوست کی شکایت ہیں ہم نے ہنریاں اپنا

روز کے ستانے سے کر دیا ہو تنگ اس نے حد سے اب تو اسی ہر ترابڑھ گئے ستم اس کے
کہتے ہیں عداوت ہی اس کو ہر ہنرور سے ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں کتنا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسمان اپنا



ظلم پر وہ عذر و حجت لائیں کیا غیر تاویلِ غلط نہ مائیں کیا
چھوڑ کر ایذا دہی شرمائیں کیا جو سے باز آئے پر باز آئیں کیا

کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلا میں کیا

جو مقرر ہو وہ ہو گا بے گساں پھر ہوں کیوں مصروفِ سعی راگساں

ہیں اُمیدیں بھی جو قائم ہو جہاں رات دن گردش میں ہیں سلت آساں

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبراہٹیں کیا

صاف یوں بھی تو نہیں کہتے کہ جاؤ اور نہ یہ مژدہ سناتے ہیں کہ آؤ

وجہ تو اس بے نیازی کی بتاؤ لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ

جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوسا کھائیں کیا

جب چلا قاصد تو ہم تھے ساتھ ساتھ تا ویرِ جانا نہ پہونچے ساتھ ساتھ

کب گئے تھے اس سے پہلے ساتھ ساتھ ہوئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ

یارب اپنے خط کو ہم پہونچائیں کیا

اس کے در پر ہم جو ہیں بسترِ جمائے قتل کے در پر ہیں سب اپنے پر اے

جس کو ہمت ہو اٹھانے کی وہ آئے موجِ خوں سر سے گز رہی کیوں نہ چلے

آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا

شوق ہی میں ہو گئی ہستی تباہ جیتے جی دیکھی نہ اُس کی جلوہ گاہ

مرے ہم موت کی حسرت میں آہ عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ

مر گئے پر دیکھیے دکھ میں کیا

یا تو خط لکھتے تھے ہم کو پڑی پڑی یا تناقل سے کیا قصہ ہی طو
ہی تجاہل اُن کا ہر زا طرفہ شو پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلا دو کہ ہم بتلا میں کیا

(۲۸)

شرط ہے اُس کا ذرا جلوہ نما ہو جانا پھر تو آساں ہی تجھے مجھ لیتا ہو جانا
راحتِ جزو نہیں کل سے جدا ہو جانا عشرتِ قطرہ ہی دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہی دوا ہو جانا

یا تو تھا مجھ سے محبت میں کبھی عہداید اب ہی کس تفرقہ انداز کے باعث اُدو کہ
ہو گیا ایک ہی چمکی میں محبت کا رد تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفل ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

ہوتی تھی اس کے لئے فکرِ نئی صبح و شام نہ ہوئیِ واشدگی اور نہ ہوا کچھ آرام
بسکہ درمانِ مخالف سے فنا تھا انجام دل ہوا کشمکشِ چارہ زحمت میں تمام
مٹ گیا گھسنے میں اس عقدہ کا دوا ہو جانا

جب تک ہم سے تعلق تھا اور اکس کی راہ چھیڑ اٹھا یا کیے اور ظلم کیے خاطر خواہ

دفعتا پھر گئے کیوں آپ بتائیں تو گناہ اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ

اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

خونِ اک آتشِ سیال مرے دل میں تھا پانی ہو کر دم گر یہ جو مژہ پر آیا

خاک بھی تن میں بجز عنصرِ خاکی نہ با ضعف سے گر یہ مبدل بہ دم سر ہو

باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

جلوہ گر ان میں تصور سے ہو تیری مثال مردمِ چشم کا آنکھوں سے نکلنا ہو محال

جی میں جو بات کبھی و بھیجے کس طرح نکال دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال

ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

اپنی ہستی کو سر بزم جو کرتی ہو فنا شمع نے مجھ سے دم گر یہ یہ گھلنا سیکھا

بیخ کن ہو مرا گر یہ ہی مری ہستی کا ہو مجھے ابر بہاری کا برس کر گھلنا

روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

سبزہ رکھتا ہی ترے پاؤں کے بجسے کئی نس گل کو بازار میں لانی تیرے جلو سے کی ہوس

تجھ تک کس کو نہیں اٹکے پہونچنے کی ہوس گر نہیں نہایت گل کو ترے کوچے کی ہوس

کیوں ہو گر و روہِ جولانِ صبا ہو جانا

جن کو رہتی ہو صفائی کی تنہا ہریل خواہشِ تصفیۂ قلب ہیں وہ ہیں بے کل

گر کے رہتا ہی ہر اک رنگ میں ق اپنا مل تاکہ تجھ پر کھلے اعجاز ہوا سے صیقل

دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا

قابل دید ہی ہر ذرہ یہاں کا غالب کیوں نہ پھر کیجیے نظارہ دنیا غالب

متفق تم سے ہی اس قول میں مرزا غالب بخشتے ہی جلوہ گل ذوق تماشا غالب

چشم کو چاہیے ہر رنگ میں ہو جانا

(۷۹)

پھر گلوں کا باغ میں منظر کھلا سبز سبز اوراق کا دفتر کھلا

یہ بہار اور ظلم یہ مجھ پر کھلا کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا

کاشکے ہوتا نفس کا در کھلا

ہم ہیں اس دھن میں کہ وہ خود ہی بگا کون جا کر بے طلب نعت اٹھائے

جائیں جاتے ہیں اگر اپنے پر اے ہم پیاریں اور کھلے یوں کون جائے

یار کا دروازہ پائیں گھر کھلا

ان کو ہو دشمن کی یاری پر گھمنڈ دوستی پر جاں نثاری پر گھمنڈ

اُس کو اپنی ہوشیاری پر گھمنڈ ہم کو ہی اس راز داری پر گھمنڈ

دوست کا ہو راز دشمن پر کھلا

داغ کھا کر دل ہوا تھا باغ باغ تھا مسطر اس گل تر سے داغ
یہ اندھیرے گھر کا تھا روشن چراغ واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ

زخم لبیکن داغ سے بہتر کھلا

باز آیا ظلم سے کب وہ جواں ناز سے اس کے ہی بل اک جہاں
پھینک دی مڑگاں نے کب اپنی سناں ہاتھ سے رکھ دی کب برو نے کہاں

کب کمر سے غمزے کی خنجر کھلا

خود ہی جب پھرتا ہی یہ گمراہ سا پھر کسی کا خاک ہو گا رہنا
خیراب یہ ساتھ ہو تو حرج کیا مفت کا کس کو بڑا ہی بدرقہ

رہروی میں پردہ رہبر کھلا

کب تک برسائے بارانِ اشک چارہ کس کس کا کرے بارانِ اشک
کیا جگر ٹھنڈا کرے بارانِ اشک سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک

آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھلا

ہو گیا جامِ مسرت جامِ مرگ حور کا بازو بنی صمصامِ مرگ
نگلی صبح زندگانی شامِ مرگ نامہ کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ

رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

اس سے بڑھ کر رند کیا ہو گا کوئی ہو نہیں سکتا کبھی ایسا کوئی
 اس کو کیا چھڑے گا اور مرزا کوئی دیکھو غالب سے گرا بچھا کوئی
 ہر ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

ردیف (ب)

(۳۰)

ہر مرے واسطے سامانِ بقا موجِ شراب اس سے جیتا ہوں کہ ہو موجِ فزا موجِ شراب
 ایک سنگ نہ تھی جلوہ نما موجِ شراب پھر ہوا وقت کہ ہو بالکشا موجِ شراب
 دے بڑے کو دلِ دستِ نسا موجِ شراب
 بنم زندانِ فدا رہنا ہو گلشن بادہ نوشوں کی طرح جھومتے ہیں سرو و تن
 بچو دوست ہیں مرغانِ گلستاں ہمہ تن پوچھ مت وجہ سیہ سستی اربابِ جن
 سایہ تاک میں ہوتی ہو ہوا موجِ شراب
 جو جسے مل گئی شاہانہ داغ اس کا ہو تختِ شاہی کی پھر اس مست کو پردا کیا ہو
 کون ہو اس کا مشاوریہ عجب دریا ہو جو ہو اغرقہ می تختِ رسا رکھتا ہو
 سر سے گزرے پہ بھی ہو بالِ ہما موجِ شراب

خشک استیجار کو بھی اس نے کیا بار آور دو رکھا ہو کہ لگیں سرو چراغاں میں شر
ہوئی ہے اس کی ہو ابھی عجیب اعجاز اثر ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجیب کیا ہو اگر

موج ہستی کو کرے فیض ہو اموج شراب

موسم گل نے گلستاں میں کیا کیا جاو پھولے پڑتے ہیں مسرت سے گل خنداں و
موج میں پھرتی ہو مستانہ گلوں کی خوشبو چار موج اٹھتی ہیں طوفان ہوا سے ہر سو

موج گل موج شفق موج صبا موج شراب

وہ کہے ہیں جو شب روز ہیں سرگرم نیاز ان سے پوچھے کوئی شادابی گزار کارا ز
ہو باراں کی کرامت نہ ہو اکا اعجاز جس قدر روح بنائی ہو جگر تشہ ناز

دے ہو تسکین بدم آب بقا موج شراب

اپنی حرمت میں یہ نکلی گل تر سے برتر رنگ پر اس کے قد ادل ہو تو صدفی جگر
قوتِ نایب نام اس کا نہو اس کا اثر بسکہ ڈوٹے ہو رگ تاک میں خوں ہو ہو کر

شہپر رنگ سے ہو بالکشا موج شراب

جامِ جمشید کا ہمسرا مرا جامِ سفال سامنے ہیں مری نظروں کے جہاں کے احوال
کیوں نہ حاصل ہو مری فکر و خشاں کو کمال موج گل سے چراغاں ہو گزیر گاہ خیال

ہو تصور میں زبیں جلوہ نما موج شراب

آنکھ میں آئے ہی چڑھتی ہی یہ بالائے دماغ موجزن دل میں ہی ہر وقت ٹٹائے دماغ
 ہی جو مرغوب اسے منزلِ زیبائے دماغ نشہ کے پڑے میں ہی موج ٹٹائے دماغ
 بسکہ رکھتی ہی سر نشو و نما موجِ شراب

ہی عجب عالم نورانی کیفیتِ فصل کیفیت کوئی نہیں ثانی کیفیتِ فصل
 کیجئے کیوں نہ ثنا خوانی کیفیتِ فصل ایک عالم پہ ہی طوفانی کیفیتِ فصل
 موجِ سبزِ نو خیز سے تامل موجِ شراب

جس کو اس بزم میں ساقی نے دیا ساغرِ دل اس کے سر میں نہاد ہم و خیالِ جزوِ کل
 شایعِ فصل گلستاں ہی نوائے بلبل شرح ہنگامہ ہستی ہی نہ ہے موسمِ گل
 رہبرِ قطرہ بہ دریا ہی خوشامیجِ شراب

شوقِ بادہ دلِ مرزا میں بھرا پھر سجد بعدِ توبہ کے کہیں پھر نہ خطا ہو سرزد
 فصلِ گلِ جوش پہ ہی ابر کی بھی ہو آمد ہوش اُٹتے ہیں مے جلوہ گل دیکھ استاد
 پھر ہوا وقت کہ ہو بالکشا موجِ شراب

رویت (ت)

(۳۱)

خار زار ایتو ہوا ہی گلشن کے خار دوست او نمونے سبزہ سے صرف خزاں گلزار دوست
چھپ گئی ہوتی تیرگی میں تابشِ انوار دوست آمد خط سے ہوا ہو سر و جو بازار دوست
دوستِ شمع کشتہ ہو شاید خطِ خسار دوست

آنکھ اٹھائے اُس کے نظارہ کو ہو کس کا جگر کیا لڑا سکتا ہو کوئی برقی تاباں سے نظر
لن ترقی اس کو زیبا ہو کمالِ حسن پر اسے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر
کون لاسکتا ہو تابِ جلوہ دیدار دوست

سامنے ہو کر مرے گزرا کچھ اُن انداز سے ہر قدم پر پامالی کے مرے میں نے لیے
کرویا سرِ تاباں اک دیدہ حیران مجھے خانہ ویراں سازی حیرت کا شاکیجی
صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتہ رفتارِ دوست

غیر کے ساتھ ان کو دیکھوں یہ کہاں لیرا مجھے پوچھنے آئے تو دکھلایا یہ نظارہ مجھے
کچھ نظر آیا نہ مرنے کے سوا چارہ مجھے عشق میں بیدارِ شکِ غیر نے مارا مجھے
کشتہ دشمن ہوں آخر گر چہ تھا بیمار دوست

ہوا اگر ہر آن ہم پر اک نئی افاد ہو اپنا لب کب اُٹھائے شوہ بیدار ہو

خوش ہو وہ زاری سے اور لذت کش قیاد ہو چشم مارو شن کہ اُس بیرون کا دل شاد ہو
دیدہ پر خوں ہمارا ساغر شراب دوست

قطعہ

یہ فاقہ کی جو ٹھہرائی ہو اس نے ہجر میں چاہتا ہی دیکے دھوکا بھید کچھ لے ہجر میں
اس بہانے سے غم و ایزد انکھٹے ہجر میں غیروں کرتا ہی پیش مجھے اُس کے ہجر میں
بے تکلف دوست جیسے کوئی غمخوار دوست

ادعا یہ ہو کہ ہیں تابع مے جن و ملک مہر و مہ جو رو پری و آدمی ارض و فلک
یوں بیاں کرتا ہی اس مغل کی باتیں بیدھڑک تاکہ میں جانوں کہ اس کے رسائی و اس تک
مجھ کو دیتا ہی پیام وعدہ دیدار دوست

میرے ہر اک زور کا ظالم لگاتا ہی سرخ اوریہ کہتا ہی کہ اب حال ہوا اس سفر غ
کیا بتاؤں مجھ کو دکھلاتا ہی کیا کیا سبز باغ جبکہ میں کرتا ہوں اپنا شکوہ ضعف و ماغ
سر کرے ہی وہ جاہل لطف غنیمت دوست

باتوں باتوں میں لگا دیتا ہی دل میں بیشتر یاد دلواتا ہی باتیں یار کی آٹھوں پہر
ہو تسلی و دلاسا سے جھنا نظر چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہی اگر
ہنس کے کرتا ہی بیان شوخی گفتار دوست

دشمن اس کا مسئلہ آیا ستانے کے لیے دوست بن کر ظلم اس انداز سے اس کے لیے
ہوں تحیر میں دونوں میں سے دکھ کس نے دیئے مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجئے

یا بیاں کیجئے سپاس لذتِ آزارِ دوست

بات جو ہوتی ہر اچھی دل میں کہب جاتی ہو آپ کیجئے کراسامع کا دل اپنی طرف لاتی ہو آپ
بلع مرزا دمیرم یہ کہہ کر اتر آتی ہو آپ یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہو آپ

ہو رویت شعر میں غالب زمیں تکرارِ دوست

روایت (د)

ناز کا لطف حبیبوں سے گیا میرے بعد (۳۲) دلربا عشوہ دکش نہ رہا میرے بعد
وہ کرشمہ نہ رہا ہو شرابا میرے بعد حسن غم نے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد

بارے آرام سے ہیں اہلِ جنائے بعد

شیوہ غنچ و دلال آج جہاں سے اٹھا کام سے اپنے ہوا نازِ معطل گویا
اب کہاں ہو کوئی دل ان سے جو ہو عہدِ بزا منصبِ فتلی کے کوئی قابلِ نرا

ہوئی معزولی اندازِ وادایا میرے بعد

اب کہاں ہو کوئی سر باز میسر مجھ سا تیز جس کے لیے کی جائے گی شمشیر قضا
اب تو بیچارہ ہی خود جو ہر ذاتی اس کا درخور عرض نہیں جو ہر سیداد کو جا
نگہ ناز ہی سرمہ سے خفا میرے بعد

یا کبھی ان کی پھر انگشت لہو میں تر تھی یا نظر آتی تھی پروں پہ خاک کی سُرخ
میری مرتے ہی صد افسوس تو بیت پنچي خوں ہو دل خاک میں احوال بتاں پنی
ان کے ناخن ہوئے محتاج حایمے بعد

آج دنیا سے اٹھی دست گریباں کی نزع اب کبھی ایک جگہ ان کا نہ ہوگا اجماع
رہنِ عشق سے محفوظ ہوئی دل کی متاع ہو جنوں ہل جنوں کے لیے آغوش وداع
چاک ہوتا ہو گریباں سے جدائے بعد

و کدے بند ہوئے سرو ہوا گلخنِ عشق کون ایسا ہی کہ آباد کرے گلخنِ عشق
ہو کوئی اب کہ ہوا سوارِ سرو تو سن عشق کون ہوتا ہو حریت مئے مروا فلن عشق
ہو مگر رلب ساقی چہ سالامیرے بعد

بزمِ الفت ہو دھواں دھار تو حیرت کیا ہو کیا تعجب ہو جو اندھیر پہاں چھایا ہو
مجھ سا پردانہ جانسوز کہاں پیدا ہو شمع بجھتی ہو تو اس میں دھواں ٹھٹھا ہو
شعلہ عشق سیبہ پوش ہو امیرے بعد

موتوں روئے کی سرپیٹ کے حسرت میری کوئی بھی بات نہ پوچھے گا تمناؤں کی
 بیکی ہوگی پس مرگ لحد پر چھپائی غم سے مرنے والوں کو اتنا نہیں دنیا میں کوئی
 کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد
 چھوٹ کر مجھے ہوا بیکیں و تنہا غالب ایسا وارفتہ کہاں اس کو ملے گا غالب
 ہاتھ ملتا ہو جو افسوس سے مرزا غالب آئے ہو بیکی عشق پہ رونا غالب
 کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد



ردیف (ر)

(۳۳)

ہوئے ہیں سدرہ شوق در در و دیوار نہ اس کو روک سکیں گے مگر در و دیوار
 کریں گے اور اسے تیز تر و در و دیوار بلا سے ہیں جو یہ پیش نظر در و دیوار
 نگاہ شوق کو ہیں بال و پیر در و دیوار
 شب فراق میں رونے کی آگئی جو انگ توپل کی پل میں ہوا کچھ عجیب گھر کا ڈھنگ
 ادھر ہی خشت کا انبار ادھر ہی تودہ سنگ و غور اشک نے کاشا نہ کا سب یہ رنگ
 کہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار

خبر جو ہو کہ سرِ شام آئے گا وہ لنگار تو سایہِ حد سے بڑھتا کہ ہو قدم پہ نثار
چلا ہی جاتا ہو بڑھتا ہوا نہیں ہو قرار نہیں ہو سایہ کہ سنکر نویدِ مقدم یار
گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار

چڑھا دماغ میں کچھ نشہِ شباب ایسا کہ گرم کر دیا بازارِ خود نمائی کا
کسی سے اب تجھے مطلق حجاب بھی نہ رہا ہوئی ہو اس قدر ازانی سے جلوہ
کہ مست ہو تھے کوچے میں ہر در و دیوار

سدا جو جانبِ دیوار و در رہا نکتا ہوا ہو آئینہ ہر سنگ و خشت حیرت کا
کیئے ہیں کام مری چشمِ شوق نے کیا کیا جو ہو تجھے سرِ سودا سے انتظار تو آ
کہ ہیں دکانِ مستاعِ نظر در و دیوار

رہی ہمیشہ جو گردش ہی سایہ کو گھر کے یہ شوق تھا کہ بلا میں یہ اس کے گھر کی لے
نصیبِ خنہ مرے غم کدہ کے جاگ اُٹھے وہ آ رہا مرے ہمسایہ میں تو سایہ سے

ہوئے سدا در و دیوار پر در و دیوار

یہ آرزو ہو کہ اپنوں سے پائیں آزادی یہ وفاق ان کی ہنہیں ہم کو وجہِ نشادی
پہل پہل سے پریشان ہیں دل سے فراہی نظر میں کھٹکے ہو بن تیرے گھر کی آبادی
ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار

ہمیشہ ضبط ہی گریہ کو کر لیا میں نے اُمٹ کے اشک جو آئے ابھیں پائیں نے
یہ عجز دیکھ کے گھر کو بچا دیا میں نے ہجوم گریہ کا سامان کب کیا میں نے
کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر در و دیوار

ہر ایک جزو ہو گھر کا سرور سے بیابا ہر ایک ذرہ نظر آ رہا ہو مست خراب
ہماریے اشک نے گویا اٹھائیئے ہیں حجاب نہوچھہ بیخودی عیشِ مقدم سیلاب
کہ ناچتے ہیں پڑے سربس در و دیوار

نہ کوئی دوست ہو ہر زمانہ میں نہ راز داں ہو نہ ہو ہمیشہ زماں میں
بھرے پڑے ہیں بہت اہل کین زمانے میں نہ کہہ کسی سے کہ غالب نہیں زمانے میں
حریفِ رازِ محبت مگر در و دیوار

— ❦ —

پایا نہ میرے گھر کو سنگِ گریہ بغیر ڈھونڈا ہو گھرِ قریب کا کیونکر کہے بغیر
بجھا مرا پستہ نہ مگر رکھے بغیر گھرِ جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

جب تک کہ دیکھتے تھے کہ ہو قدرتِ سخن اک روز بھی تو مجھ کو نہ دی نصرتِ سخن
پھٹا کبھی تو بولے نہیں فرصتِ سخن کہتے ہیں جب ہی نہ مجھے طاقتِ سخن

جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

حرام نصیب کون ہی مہسا جہان میں بخلا نہ کوئی کام ہمارا جہان میں
کس طرح دیکھیے ہو گزارا جہان میں کام اس سے آپڑا ہو کہ جس کا جہان میں
یوں نہ کوئی نام ستگر کہے بغیر

کیا کیا تمہارے ہاتھ سے ہوتے نہیں ستم کیا کیا ہیں پہنچے نہیں تم سے رنج و غم
لیکن جو ہو ذرا بھی شکایت تو لو قسم جی میں ہی کچھ نہیں ہو ہمارے ورنہ ہم
سہرا جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

ابرو کو اس کی کہتے ہیں شمشیر خوش نیام تیرا بل ہو اس نگہ جاں ستاں کا نام
ہوتا ہو مراد کے بیاں میں اک انتظام مقصد ہو ناز و غمزہ وے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہو دشمنہ و خنجر کہے بغیر

بہتر سمجھتا ہو کوئی پتھر کو پوجنا نہ ہب کسی کا مہر منور کو پوجنا
ایمان عاشقوں کا ہو دلیر کو پوجنا چھوڑوں گا میں اس بت کافر کو پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

ہوتا نہ کس طرح سے فرائے خم پیو دکھلا رہا تھا عالم مستی مقام ہو
پیش نظر نہ ہو جو ساقی ہو روبرو ہر چہ نہ ہو مشاہد حق کی گفتگو

بستی نہیں ہی نشہ و ساغر کہے بغیر

رکھتا ہوں پاس اس لیے کاغذ قلم و دوات

مکن ہی کوئی دن کہے سمجھوں میں سکورات

سنا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

مرزا نے کچھ کیا جو کبھی حالِ نارِ عرض

یوں ہی نہ ہو کہیں دلِ نازکِ پارِ عرض

ظاہر ہی تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر

﴿۳۵﴾

اس بامِ پر تجلی افوارِ دیکھ کر

جھپکی نہ آنکھ برقِ شررِ بارِ دیکھ کر

جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدارِ دیکھ کر

رکھتی ہوں رات دن تپشِ دلِ تپاں نے مجھے

کرنا نہ آیا سو زحمتِ نہاں نے مجھے

سرگرمِ ناہائے شررِ بارِ دیکھ کر

ظلم و ستم کا وقت ہی کوئی نہ جو رکھا

اک کھیل ہو گیا کہ جب لٹھے ستارِ لیا

دل اب تو اُٹام سے ہی محبت کے کانپنا کیا آبرو سے عشق جہاں عام ہو جانا

رُکنا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

نوبت نہ آئی تھی کہ گلے پر مے چلے چلنے سے اس کے پہلے ہی مرنا پڑا مجھے

یہ اور بوسے لے مے قاتل کے ہاتھ سے آتا ہی میرے قتل کو پر جوش رشک سے

مرتا ہوں اُس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

مستی نے تیری کھودیا صبر و سکونِ خلق ہو لغزشِ خرام سے زخمی درونِ خلق

شیشہ ہوا ہی باعثِ حالِ زبونِ خلق ثابت ہوا ہی گردنِ مینا پہ خونِ خلق

لڑے ہو موجِ محو تری رفا دیکھ کر

پڑنا ہو دمِ مری سر پر الم سے ہاتھ مصروفِ سینہ کو بی ہو وقتِ غم سے ہاتھ

قیمت کہاں وہ شہس کے ملا کر ہم ہاتھ واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ

مجھ کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

مضمون ہمارے تلے ہیں لعلِ یں کے ساتھ نسبت ہو حرفِ حرف کو درِ عدن کے ساتھ

یتنا ہو اس کو کوئی اگر قدر فن کے ساتھ یک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ

لیکن عیارِ طبعِ خرد بیدار دیکھ کر

چلنے سے پیشتر تھکے لازم ہو دیکھ بھال رستے کی اونچ نیچ سے چلنا نہ وہ بال

پرسنگ آہ میں بھی ہو غافل سفر محال زنا ریاندہ سبجہ صد دانہ نور ڈال

رہرو چلے ہو راہ کو ہوار دیکھ کر

دن رات خاک دشت کی یا پھانتا تھا میں پا کچھ دنوں سے نقش قدم بن رہا تھا میں

مثل شکستہ پاسروادی پڑا تھا میں ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں

جی خوش ہوا ہو راہ کو پڑ خا رو دیکھ کر

اس درجہ بطنی ہو خدا جانے کیوں اُسے ہر دم یہ وہم ہو کہ محبت ہو اور سے

کہتا ہو منہ کے مجھ کو ہری چگ اسی لیے کیا بد گمان ہو مجھ سے کہ آئینہ میں مرے

طوطی کا عکس سمجھے ہو رنگا رو دیکھ کر

ہیبت بٹھائی ہوتی طلیکار نور پر خاک سیہ پہاڑ ہوا کس قصور پر

یہ گرمیاں یہ غیظ اور اک نے شعور پر گرنی تھی ہم پہ برق تجسلی نہ طور پر

دیتے ہیں یادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

دیکھا جو آستانہ تو آنکھوں میں پھر گیا حرز اکابح و شام وہ سجدوں کا مشعلہ

دبے جو پھر لوہے کے نظر آئے جا بجا سر پھوڑنا وہ غالب آشفہ حال کا

یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

یہ سرگرمی ہوا حق میری بربادی کے سناں پر
فضول اتنا ترس آیا جو اس گریبانِ تیراں پر

عنایت کی یہ کیوں مجھ زار کے حالِ تیشاں پر
لرزنا ہی مرادِ رحمت مہرِ درخشاں پر

میں ہوں وہ قطرہ شبنم کہ ہوں خارِ بیاباں پر

ہوئی گوشت کے ہاتوں زمانے بھر میں سوئی
ہو ابے ساز و سامانی پہ بھی سامانِ نیاباں

سیہ خانہ میں جب آئے کہ بھگتیں قید تنہائی
نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی

سفیدی دیدہ یعقوب کی پھر فی ہونداں پر

جنوں مانع ہوا استاد کا احساں اٹھانے سے
فراغت پا چکا روزِ ازل پڑھنے پڑھانے سے

رہا انکار عقلِ کل کو غیبِ لبرِ بتانے سے
فنا تعلیمِ درسِ بیخودی ہوں اُن مانے سے

کہ جنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ وبستاں پر

جگر میں خلیش ہرگز نہ رہتی نشترِ غم سے
یہ ایذا میں نہ ہو میں جہاںِ جنتِ کئے مے

کوئی دمِ جان کو مہلت تو ہوتی درِ دیہم سے
فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویشِ مرہم سے

بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دلِ نکلاں پر

جدا ہو نقشہِ عالم سے حسن آباد کا نقش
وہاں بیٹھا ہی سکے ہو تِرا دل سے کرشمے کا

بہت فرمانِ جاری تھے مگر دیکھا تو یہ دیکھا
نہیں اقلیمِ الفت میں کوئی طومارِ نازِ ایسا

کہ پشتِ چشم سے جس کے نہوے ہنر خواں پر
 پریشانی کے عالم میں جو دل بہلانے جاتا تھا
 نظر آتا تھا مجھ کو تختہ گلزار گلشن سا
 جلانا تھا مرے دل کو بھڑکنا آتشِ گل کا
 مجھے اب دیکھ کہ ابرِ شفق آلودہ یاد آیا
 کہ فرقت میں تری آتشِ برستی تھی گلستانِ
 نہیں آنظر علت سے خالی صورت کا پھٹکنا
 اُڑایا جائے گا آسودگانِ خاک کا خاک کا
 بے جو خاک میں پھر انکی بربادی سے چل گیا
 بجز پردانِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہو گا
 قیامت اک ہوائے تند ہو خاکِ شہیدان پر
 نصیحت گر سے مرزا و جد کیا آخرِ خصوصیت کی
 کہ پسندِ مشفقانہ ہو دلیل اس کی محبت کی
 سرانگھوں پر ہر ہمدردی سے جو کچھ بھی نصیحت کی
 نہ لڑنا صحیح سے غالب کیا ہو اگر اس شدت کی
 ہمارا بھی تو آخرِ زور چلتا ہو گریباں پر

﴿﴾

(۳۷)

ہیں مصطلحات ان کے جدا ان کی نیاں اور
 الفاظ ہیں کچھ اور معانی و بیاں اور
 ہر بات دو فصلی ہی نہیں اور ہواں اور
 ہو بسکہ ہر کلام کے اشارے میں نشان اور
 کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہو گماں اور
 مدت سے ہو اظہارِ تمنا سے ملاقات
 ہوں ان سے طبکارِ مصافات و مدارات

بنتی ہی نہیں بات یہ کیا بات ہی یہ بات یا رب ہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو جو نہ دے چھوٹاں اور

اس کے لب شیریں کے مقابل میں ہو کیا قند ہو برق کہاں اور کہاں اُس کا شکر خند
تنبیہ دیا کرتے ہیں اکثر جو خرد مند ابرو سے ہو کیا اس نگہ ناز کو پیوند
ہو تیر مقرر مگر اس کی ہو کہاں اور

انداز ہو نخوت کا وہی نفس دنی میں دار فتیہ کجخت رہا کبر و منی میں
سرگرم خودی کی ہے ہم بیخ کنی میں ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہو شگ گراں اور

سر پر کبھی تازیت یہ الزام نہ لیں گے بکتی ہوئی اشیا ہیں تو کیا بخل کرینگے
مانگو گے اگر وزن سے ڈھونڈھ کے دینگے تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل جاں اور

مانا کہ مری آنکھوں سے جاری ہوا سوتا یوں آنسوؤں رونے سے تو دل خوش نہیں ہوتا
ہاں خون کے سیلاب میں اپنے کو ڈبو تا ہو خون جگر جوش میں دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدہ خوں ناہ فشاں اور

کھائے جوئے زخم تو بسمل کوئے آئے او کاش وہ پرئے تن مجروح کے اڑوئے

یارب کہیں جلاد نہ تعمیل میں اکتاے مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سراٹھائے
جلاد سے لیکن وہ کہے جائیں کم ہاں اور

نالوں کے دھوئیں کا ہوشب تار میں نقشا انجم میں ہو آہ شرر افشاں کا تماشا
ہوشعلہ الفت سے زمانے میں اُجالا لوگوں کو ہو خورشید جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں کدِ ابرغ نہاں اور

دل باختہ کو کب ہو تم سے سر کی قسم چین پاتا ہو کہاں بستہ زنجیرِ الم چین
دیتے ہیں کہاں مجھ کو شبِ روز کے غم چین لیٹا نہ اگر دل ٹھقیں دیتا کوئی دم چین
کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور

ٹھٹھتے نہیں رستہ جو دراپاتے ہیں نالے بہتے ہوئے اشکوں کے چلے آتے ہیں نالے
وہ جوش ہو دریا کو بھی شرماتے ہیں نالے پاتے نہیں جب آہ تو چرٹھ جاتے ہیں نالے
رکستی ہو مری طبع تو ہوتی ہو رواں اور

پسے شعر اُکھتے تھے جو ہر بہت اچھے تھے سیکڑوں ایک ایک بہت بہت اچھے
مرزا کے بھی اشعار ہیں اکثر بہت اچھے ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہوا اندازِ بیاں اور

(۱۲۸)

وقفہ جو یہاں مجھ کو ابھی تھا کوئی دن اور تم کو بھی مناسب تھا ٹھہرنا کوئی دن اور
تم نے نہ مرا سا تھکنا بھانپا کوئی دن اور لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تھنا گئے کیوں اب ہوتا تھا کوئی دن اور

در پر ترے اس خاص غرض سے ہون ہیں ہا منظور ہو ہستی کا مجھے اپنی منشا ہا
ہو سخت اگر سنگ در اس کی نہیں پروا مٹ جائے گا سرگر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پر ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

بگڑے ہوئے آثار ہیں کیا بات بناؤں کچھ دھڑکے ہو تو بستا دو کہ مناؤں
اک بات ذرا سی ہو جو مانو تو بستاؤں آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

دیرینہ محبت کا کیا پاس نہ تم نے حیرت ہو کہ کس دل سے جدا ہوتے ہو مجھ سے
باندھی ہو مگر ملکِ عام کے ہیں اداوے جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب، قیامت کا ہو گیا کوئی دن اور

کس فوق سے تھا محو تماشا ابھی عارف اس بزم سے کس واسطے اٹھا ابھی عارف
کیوں ہو گیا پیوندِ زمیں کا ابھی عارف کیوں ای فلکِ پیر جو اٹھا ابھی عارف

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرنے کوئی دن اور

والد تمہیں گھر کے اُجالے کا سیب تھے چھایا ہوا اک اندھیر مری آنکھوں کے آگے
کس خاک کے پردے میں تھی پیری نظر سے تم باو شب چار دہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور

مانا کہ وہ آیا تھا فقط جان ہی لینے ممکن تھا کہ جیل سے اُسے مالتے رہتے
کچھ بات بنا دیتے تو کیوں چھوڑتے ہم سے تم کون سے تھے ایسے گھرے دوست کے
کہ تاملک الموت نقاضا کوئی دن اور

جلدی جو یہ کی جانے میں کیا جی میں سمائی جاتے ہوئے ہر ایک کیوں آنکھ پھرائی
افسوس نہ اپنوں کی بھی الفت بخشیں آئی مجھ سے تجھیں نفرت سہی میرے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ مٹا شاکوئی دن اور

ناراض ہی تم تھے تو دل غمزدہ تھا خوش تم سامنے تو رہتے تھے ناخوش ہے یا خوش
جب تم نہ رہے یہ تو کہو دل ہے کیا خوش گزری نہ بہر حال یہ مدت ناخوش و ناخوش
کہ رہا تھا جو انہرگ گزارا کوئی دن اور

چوڑے گی ابھی جان کہاں رہتے قالب مرزا ابھی سمجھے نہیں تم اس کے مطالب
کیا زیت ہے ایسے کی جو ہو موت کا طالب ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالب

قسمت میں ہو مرنے کی ٹمنا کوئی دن او

✱

(۳۹)

اجابتوں پہ دعاؤں کی کیجیے کیا ناز نہ عجز اپنا ہوا کارگر نہ سوز و گداز
ازل میں بسکہ ہر اک شو کا ہو چکا ہو طراز حریف مطلب مشکل نہیں فسونِ نیا ز
دعا قبول ہو یا رب کہ عمر خضر دراز

نظری جب نہیں پھر دوڑ و صوب ہو بے سود ابھی ہو تجھ سے بہت ویر منزلِ مقصود
ہر ایک ذرہ میں ہو نورِ ہستی معبود نہ ہو بہر ذرہ بیاباں نور و ہم وجود
ہنوز تیرے قصور میں ہیں نشیب فراز

ہم آج تک تو رہے شکل و پردہ حیراں ہو انہ سامنے نظروں کے حسنِ یار عیاں
گزاریں صبر میں کچھ اور دن کہاں یہ توان وصالِ جلوہ تماشا ہی پر دماغ کہاں
کہ دیکھیے آستِ انتظار کو پرواز

رہا ہو یہ تہہ خنجر بھی ذوقِ دید میں مست گیا ہو جان سے پھر بھی ہوا خیالِ پست
کیا ہو یار کے پر تو نے اس کو نیست بہت ہر ایک ذرہ عاشق ہو آفتاب پرست
گئی نہ خاک مچے پر ہوائے جلوہ ناز

عجب مقام میں مر رہا ہو کیا کہوں غالب مثال اس کو اگر دوں تو کس سے وں غالب

فضائیں عالم امکاں سے ہو فزوں غالب نہ پوچھ وسعتِ مینا نہ حسنوں غالب
جہاں یہ کاسہ گردوں ہو ایک خاک انداز

(۴۰) مفت ہوتے ہیں پریشان عزیز کیا مجھے سمجھے ہیں نادان عزیز
جھک رہی یا رکاشِ رمان عزیز کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہو مجھے ایمان عزیز
مشکل اس کا ہو ٹکنا دل سے ہو قلع بھی بلا کا دل سے
تیر کو تو نے جو کھینچا دل سے دل سے نکلا یہ نہ نکلا دل سے
ہی ترے تیر کا پیکان عزیز
اُن نہ مرزا نے کبھی کی غالب جو مصیبت پڑی جھیلی غالب
ضبط لازم ہو تجھیں بھی غالب اب لاتے ہی بے گی غالب
واقعہ سخت ہو اور جان عزیز

(۴۱) میری ہستی ہو اک نوکھاراز ہیں بقا و فنا ہم دم ساز
ظاہر انجہام ہو نہ کچھ آغاز نہ گلِ نعمہ ہوں نہ پردہ ساز

میں ہوں اپنی شکست کی آواز

تجھ کو ہنسنے سے کام صورتِ گل میں ہوں اور ہم نوائیِ لبیل
لاگ دونوں میں اُڑی با کُل تو اور آرایشِ خم کا کل

میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

بس زیادہ نہ لے تسلی کی غیر ممکن ہو دل کی آزادی
کیا عجب ہو کھلے یہ پردہ کبھی لافِ تمکین فریبِ سادہ دلی

ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز

جب سے کنجِ قفس کیا آباد بھول کر بھی نہیں چین کی یاد
دل نہیں چاہتا کہ ہوں آزاد ہوں گرفتارِ الفتِ صیاد

ورنہ باقی ہو طاقتِ پرواز

تنگ آیا ہوں ہجرِ دلبر سے کیوں نہ آنکھوں سے اشکِ غل
دل کہاں تک فراق میں تر سے وہ بھی دن ہو کہ اس شکر سے

ماز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز

یہ کوئی ضبط ہی کہ میں چپ ہوں دل ہو خالی تو کیا لہر و ووں
روتے روتے ہوا ہی حالِ زبوں نہیں دل میں مئے وہ قطرہ غوں

جس سے مرگیاں ہوئی نہ ہو گلیاں

تینخ برآں تری نگاہ تیز
عشوہ تیرا جہاں سے گرم سیز
خوش خرامی تری قیامت خیز
اے ترا جلوه پاک تلم انگیز
اے ترا ظلم سر بسر انداز

اٹھ گیا ہی نقاب روئے نکو
خوب نکلیں گے حسرتیں اب تو
منع ہا بوس سے نکر مجھ کو
تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو
رینزش سجدہ جبین نیاز

غم سے کس دن میں جاں بلب نہ ہوا
ورد سے حال غیر کب نہ ہوا
لطف مجھ پر یہ بے سبب نہ ہوا
مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا
میں غریب اور تو غریب نواز

سرخوش و مست نظم رہتا تھا
دل سے نکاشا ہر سخن پہ فدا
روئے خاک اڑا اے حرزا
اسد اللہ خاں تمام ہوا

اے درینا وہ رند شاہباز

ردیف (ک)

(۳۲)

چاہتے یہ شوخ تو دنیا میں کیا کم تھا نمک
سنگ کے بدلے یہ لے سکتے تھے پتھر کا نمک
ان کے ہاتھوں کب دہان زخم نے چھٹا نمک
زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک
کیا مرہ ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

بے سبب کب ہو نمک سے احتراز زخمِ دل
تو نہیں واقف تو مجھ سے پوچھ را ز زخمِ دل
اُس کی خاکِ پا پھر کئی چارہ ساز زخمِ دل
گردِ راہِ یار ہی سامانِ تاز زخمِ دل
ورنہ ہوتا ہی جہاں میں کس قدر پیدا نمک

چاہتا ہوں میں تو یہ پیرا کوئی تہہ و بہو
اور مرہ مجھ کو یہ ہی دیکھوں اسے ہنستا بہو
حسرتیں نکلیں کہیں فصلِ بہاری آئے تو
مجھ کو ارزائی رہے تجھ کو مبارک ہو جو
نالہ بلبیل کا درد اور خندہ گل کا نمک

غیر ممکن تھا کسی مرہم سے ہو اس کا علاج
تھا اسی درماں کا طالب اس کے زخموں کا علاج
تھی تاکِ دو کس کی اس کو اور کس کی احتیاج
شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج
گردِ ساحلِ ہو بہ زخمِ موجِ دریا نمک

یکھ لے اُس شوخ سے کوئی محبت کا نباہ
گو بظاہر ہو چکی ہی مجھ سے ترکِ ہم دریاہ

پھر بھی مجھ پر کس قدر مہربانی کی نگاہ داد دیتا ہے مرے زخم جگر کی واہ واہ

یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وہ جس جانمک

بوجھ لو آکر یہ کیسی لگ رہی جوان کوئی
تم گئے مجھ پر لگے ہونے لگاؤ نے پڑ پڑ
ماں کہ ہو اس حسرت تن کا قصہ آسانی سے طو
چھوڑ کر جانا تن مجروح عاشق صیغ ہے

دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگیں ہیں اعضا نامک

ہو درد سے چارہ جوئی باعث تحقیر درد
اُس کے منہ سے مجھے ہاتھ آگئی تدبیر درد
کیوں کسی کی سچی سے حاصل کرتا شیر درد
غیر کی منت نہ کھینچوں گا پسے تو غیر درد

زخم مثل خستہ قاتل ہو سرتا پانمک

اپنی آنکھوں سے جو تیرے شوق کو پھر دیکھ لیں
اب کہاں ہے زخم کھائے اور کہاں ہے لذتیں
حضرت ہر زبانی تیری بیخودی کی آویں
یاد ہیں غالب مجھے وہ دن کہ دھندلوق ہیں
زخم سے گرتا تو تو پلوں سے چیتا تھا نامک

﴿۳۳﴾

ختم قصہ ہے شب بھر بسر ہونے تک
کیا خبر حال ہو کیا تجھ کو خبر ہونے تک
صورت شمع ہوں جہان سحر ہونے تک
آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

اک تلامذہ ہی بیا کیوں نہ ہے پھر دل تنگ روز طوفان حوادث کا ہوا مادہ جنگ
کس طرح دیکھئے بیچارہ کی نکلے گی اُمنگ دام ہر موج میں ہی حلقہ صد کام نہنگ

دیکھیں کیا گزرے ہی قطرہ پہ گہر نے تاک

آتش ہجر سے حالت ہو جگر کی جو خراب کشکش سے ہی مری جان گرفتار عذاب
دل یہ کہتا ہو کہ پہلے مجھے کیجئے خون تاب عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب

دل کا کیا رنگ کروغن جگر ہونے تاک

تم سے اور وعدہ وفائی ہو کبھی ناممکن دیکھ لیں خیر کہ لائے ہو خدا کو صفا من
اپنی اس دار فنا میں ہو بقا ہی کو دن ہم نے مانا کہ تناقل نہ کرو گے لیکن

خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تاک

ہو گیا حسن کی ہیبت سے دل کوہِ دو نیم سخت حیرت ہو کہ زندہ رہے کس طرح کلیم
فرضِ عاشق ہو دم جلوہ کرے جان تسلیم پر تو خور سے ہو شبنم کو فنا کی تعلیم

میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تاک

ظرف لکھتا ہو تو کربادہ پرستی غافل ورنہ یہ بزم رہے گی نہ یہ بستی غافل
تجھ کو محروم نہ کرنے تری بستی غافل اک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل

گر می بزم ہو اک قہص شر ہونے تاک

پوچھنے کیا ہو یہ فرما سے کہ کیسا ہی مزاج کل تھی فرصت اسے اندوہ مصیبت سے نہ آج
وہ مرض ہی کہ معالج نہ دوا کا محتاج غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہو سحر ہونے تک

ردیف (۱)

(۳۴)

یہ بے شعور جب سے ہوئی مبتلائے گل بجھا نہیں ہو اس کی نظر میں سوائے گل
بھولی ہوئی ہو عہدِ قیام و بقائے گل ہی کس قدر ہلاک فریبِ وفائے گل
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ لائے گل
مدت سے یادِ گل میں عنادِ دل کو تھا شغف اشجارِ برگِ باسے خالی تھے صفت بصف
اب گل سے شاخ شاخ ہوئی جامِ جم بکف آزادی نسیمِ مبارک کہ ہر طرف
ٹوٹے پڑے ہیں حلقہٴ دوام ہوائے گل
جوشِ بہار میں کوئی غنچہ اگر کھلا کمتر کسی طرح دل صد چاک سے نہ تھا
سمجھا نہ کوئی خستگی گل کا ماجرا جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا
ای وائے نالہ لبِ خویش نوائے گل

جب پاسبوس کی بھی اجازت مجھے نہ دے
مجرم بنوں لگاؤں جو آنکھوں سے پاؤں کو
کلم قسمتی کا اپنی گلہ مجھ کو کیوں نہ ہو
خوش حال اُس حریف یہ مست کا کہ جو
رکھتا ہو مثل سایہ گل سر پہائے گل

گل کو جو دیکھتا ہوں کھٹکتا ہے دل میں خار
اس کے وجود پر ہو مجھے رشک بار بار
کہتا ہوں ہونہ یہ کہیں تیرے گلے کا ہار
ایجا دکرتی ہے اسے تیرے لیے بہار
میرا رقیب ہے نفسِ عطر سے گل

دل تکتا گیا ہے غم روزگار سے
خالی ہے ہاتھ سر میں گرانی خار سے
فرحت ہو خاک سیر گل و لالہ زار سے
شرمندہ رکھتے ہیں مجھے باد بہار سے
مینا سے بے شراب دل بے ہوائے گل

یو باس اس نے حسن میں حاصل ضرور کی
نسیکین کیا ہو اس سے دل نا صبور کی
لیکن وہ بات اس میں کہاں تیرے نور کی
سطوت سے تیرے جلوہ حسنِ غیور کی
غول ہو مری نگاہ میں نگاہ دائے گل

رکھتا ہو غنچہ دل میں زل سے مرے چپک
نرگس بھی چاہتی ہے ترے نور کی جھلک
سنبل کو کر رہی ہے پریشاں ترنی لٹک
تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکا کہ آج ٹک
بے اختیار دوڑے ہو گل و رقصائے گل

پھلی ہوس کی بوے دل آویز چارسو
 حاصل ہوس سے ہر گلِ خداں کو رنگِ بو
 مرزا کو جس کی باغِ جہاں میں ہی جستجو
 غالب مجھے ہر اس سے ہم آغوشی آرزو
 جس کا خیال ہر گلِ جیبِ قباے گل

رویت (ن)

(۴۵)

اب نہ دل اور وہ خیال کہاں وہ تصور وہ ذیکہ بھال کہاں
 وہ خوشی اور وہ ملاں کہاں وہ فراق اور وہ وصال کہاں
 وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
 جب تک آزاد وہ کہاں ہم تھے دید بازی میں ہم نے دن کاٹے
 دل ہواب اور غم ہیں دنیا کے فرصتِ کار و بار شوق کسے
 ذوقِ نظارہ جمال کہاں
 اب نہ دل میں خیال گیسو کا اور نہ آنکھیں ہیں محو شوقِ لقا
 دلولہ مٹ گیا جو دل میں تھا دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا
 شورِ سودا سے خط و خال کہاں

کیا کروں گریزِ زمانہ نے جو صلی پست کر دیئے دل کے
نرہ وہ سخن کا ذوق سنجھے تھی وہ اک شخص کے تصور سے

اب وہ رعنائی خیال کہاں

بہہ چکا خون دل میں جتنا تھا کوئی قطرہ جگر میں بھی نہ رہا
ہمنشیں طعن کیا یہ ٹھیکو دیا ایسا آسان نہیں ہو رونا

دل میں طاقت جگر میں حال کہاں

تھے کبھی حاکِ استناء عشق اب نہ وہ ہم نہ وہ زمانہ عشق
جیب پڑ تھی تو تھے یگانہ عشق ہم سے چھوٹا تھا رخاۂ عشق

واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں

جو گردوں اٹھائے جاتا ہوں ٹھوکریں صبح و شام کھاتا ہوں
روز ایذا نئی اٹھاتا ہوں شکر و نیا میں سر کھاتا ہوں

میں کہاں اور یہ وبال کہاں

کہیے مرتزاکا حال کیا غالب بے طرح ضعف ہو گیا غالب
ہو یہ پیری بھی کیا بلا غالب مضمحل ہو گئے توئے غالب

وہ عناصر میں اعتدال کہاں

(۴۶)

بھاگتا ہوں دام توڑ کے آفت سید ہوں بیجا نہیں جو سایہ سے اپنے مرید ہوں
 بہت زدہ ہوں چاشنی غم چشیدہ ہوں ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
 میں دستِ غم میں آہوئے مینا دیدہ ہوں
 کہتے ہیں یوں تو سب مجھے با اختیار ہو لیکن خدا گواہ جو کچھ اختیار ہو
 مجبور ہو پھر اسے کیا اختیار ہو ہوں درد مند جبر ہو یا اختیار ہو
 گے نالہ کشیدہ گے اشکِ حلیدہ ہوں

چکے ہوئے غصہ و غم کا مزہ دہن خوش ذائقہ حلاوتِ جاں مجھے کیا دہن
 اس درجہ تلخ تھا دمِ آخر مرا دہن جاں لب پر آئی تب بھی نہ شیریں ہوا دہن
 از بسکہ تلخیِ غم ہجراں پیشیدہ ہوں
 بے حس ہوں مثلِ عضوِ معطل پڑا ہوا جنبشِ مجھے ہو ذرہ برابرِ مجال کیا
 بل لائقِ جزا ہوں نہ مستوجبِ سزا نے سچے سے علاقہ نہ ساعت سے واسطہ
 میں معرضِ مثال میں دستِ مریدہ ہوں

یہ دشمن فرشتہ نہ جن و پری سے لاگ جیواں کی تاک میں نہ کسی آدمی سے لاگ
 بنے سے ہی لگاؤ نہ کچھ غیر ہی سے لاگ ہوں خاکسار پر نہیں مجھ کو کسی سے لاگ

بغلِ مروجہ دیوان ہیں نہیں جو مصنف کو نالیکہ قلم خاص کی لکھی ہوئی اپنے استاد سوزناں سے ملی تھی۔

نے دانہ فاق ہوں زودم چیدہ ہوں

پوچھو نہ ہمد مومری حسرت کی داستاں حراماں نصیب کر کے قضا لائی ہو میاں
انکامیاں نصیب میں نہ ہیں کہ الاماں ظاہر میں میری شکل سے افسوس کے نشاں

خارالم سے دست بدنداں گزیدہ ہوں

سنبھل نے اپنی زلف کے کھوئے نہیں شکیں سبزان باغ ابھی نہیں گرم دلاں و غنچ
بلغ خیال دل سے مٹائے ہوئے ہو سچ ہوں گرمی نشاط تصور سے منہ سچ

میں عندلیب گلشن نا آفرین ہوں

مسکن نہ آسماں نہ زمیں ہو مری جگہ کرسی ہو اور نہ عرش بریں ہو مری جگہ
میں خود کہیں ہوں اور نہ کہیں ہو مری جگہ ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہو مری جگہ

ہوں میں کلام نغزوئے ناشنیدہ ہوں

ہواک زانہ بر سر کہین و مخالفت دنیا کو ہو عروج میں میرے مزاحمت
پہناں ہو خیزی کی نظر سے مری صفت جو چاہئے نہیں وہ مری قدر و منزلت

میں یوسف بہ قیمت اول خریدہ ہوں

مشراب پو میرے کیوں ہونے کو قال و قیل میں بھی ہوں اپنے رنگ میں بے مثل و بیل
نیکوں نے فرض کر لیا بد مجھ کوئے و سبیل اہل دمع کے زمرے میں ہر چند ہوں ذلیل

پر عاصیوں کے فرستے میں میں برگزیدہ ہوں
مرزا ہی سے نہیں ہونا نے کو کچھ حسد میرے لئے بھی بن گئے انسان وام و دود
اس طرح کھائے لیتے ہیں جس کی نہیں حسد پانی سے ساگ گزیدہ ڈسے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آئندہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں

(۱۱)

ہم سے برتاؤ برا ہو تو بھلا کہتے ہیں لطف بیجا کو جوان پر ہی بجا کہتے ہیں
کچھ صواب اس نے کیا بھی تو خطاب کہتے ہیں کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جبا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہو کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں
دل پریشان ہر مضمون میں پریشان اپنے ایسی آشفٹ بیانی کو کوئی خاک سنے
کہ نہ بیٹھیں کہیں کچھ اور خدا خیر کرے آج ہم اپنی پریشانی خاطر ان سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں
درد و دل خود بھی جو رکھتے تو سمجھتے اس کو درد انگیز ہیں اندوہ فرا ہیں یہ تو
سادگی سے گراپ جو یہ کہیں سب سن لو انکے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
جو می و نسخہ کو اندوہ رہا کہتے ہیں
رات دن رہتی ہی یہاں تم سے کی حالت غش سے نالہ کش خاک ہوں ہتی ہو بری گت غش سے

ب تک آجا ہوتی ہے جو مہلت غش سے دل میں آجائے ہے جو فرصت غش سے

اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں

ہیں موجد بخدا شرک ہو دل سے مفقود ہم معبود ہیں نہ کہنے کے نہ کعبہ معبود

بقبلہ ہیں تو صرف ایک جہت ہے مقصود ہو پے سرحد ادراک سے اپنا مسجود

قبلہ کو اہل نظر قبلہ بنا کہتے ہیں

یوں تو کانٹوں پہ ہمیشہ ہیں تڑپا ہوا اب محبت کا تری لطف مگر پایا ہے

حالتِ نادر پہ تو نے جو ترس کھایا ہے پائے افکار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے

خارہ کو ترسے ہم مہر گیا کہتے ہیں

سوزِ باطن کا جو کچھ حال ستم گزینے سنا دلنشین ہونے کو تھا ہی کہ یکایک جھجکا

ہم نے بھی رنگِ بیاں کو ہم میں اپنے بدلا اک شررِ دل میں ہے اس کوئی گھبرایا کیا

اگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

کرتے ہم رو و فتح اس سے تو ہوتا دل تنگ گفتگو کرتے ہوئے رہتا ہے آمادہ بجنگ

ہاں میں ہاں اس کی ملنے ہیں تو بھرتی ہو تنگ دیکھیے لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ

اس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں

سُن کے یہاں نہ مرزا بھی و دیں شاید جو سخنِ سنج ہیں اس غم کو نہ بھولیں شاید

بزم ماتم ہو پیا بزم سخن میں شاید وحشت و شفتہ اب مرثیہ کہیں شاید
مرگیا غالب آشفتنہ نو کہتے ہیں

(۴۸)

عشق کیا جب شل قمری طوق گردن میں نہیں وہ جنوں کیا پتھروں سے زخم اگر تن میں نہیں
اس کو محضوں کیا کہیں جس کا کہاں بن میں نہیں ابرو کیا خاک اس گل کی جو گلشن میں نہیں
ہر گریباں تنگ پیراں جو دامن میں نہیں

پہلے دامن میں جی گلکاری تھی گاش میں نہیں لطفِ نو نباری جو ٹھانڑ گاں میں نہیں
دل تڑپا تو ہو گیا سہ گردن میں نہیں ضعف سے اڑ کر یہ کچھ باقی مے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اڑ گیا جو خون کہ دامن میں نہیں

چونکہ دیواریں ہوئی تھیں سدا رہ آفتاب اس لیے وہ در ہوا ہی سجدہ گاؤ آفتاب
تھی جو زبدیدہ نگاہی اک گناہ آفتاب ہو گئے ہیں جمع اجزاء نگاہ آفتاب
درے اس کے گھر کی یوارد کی وزن میں نہیں

دریہ خانہ کا میرے اک وہاں شیرازی موت کے منہ میں اٹھ جینے سے طبیعت سیرازی
درے انگریز ہیں زمین خاکِ سیاہ کا ڈھیرازی کیا کہوں تاریتی زندانِ غم اندھیرازی
پہنہ نور صبح سے کلم جس کے وزن میں نہیں

اس کو مارا اُس کو زندہ کر دیا اعجاز سے اس کو غمِ ز سے کیسا ہل تو اُس کو ناز سے
گھر بنایا اس نے ہر دل میں نئے انداز سے رونقِ تہستی ہو عیشِ خانہ ویراں ساز ہو

انجن بے شمع ہو گر برقِ خرمین میں نہیں

غم بھریں اس نے لے دیکر فقط سیکھا ہو طعن دیکھئے انصاف سے تو سر بسر بیجا ہو طعن
ہو فقط نا تجربہ کاری کہ یہ کرتا ہو طعن زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جونی کا ہو طعن

غیر سمجھا ہو کہ لذتِ زخمِ سوزن میں نہیں

جیتے جی اُس شکِ گل کے خوب نظارے ہوئے مر کے بھی پوئے پوئے ہی رانِ لسانے ہوئے
قبر میں پیشِ نظر وہ گل سے رخسارے ہوئے بسکہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے کماے ہوئے

جلوہ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

کرنہ درماں چارہ گر مجھ خستہ ورنجور کا ہر مسام اک زخم ہو گا اس تنِ محروم کا
دل کی حالت دیکھ چھا ہو گیا زنبور کا قطرہ قطرہ اک ہیولا ہوئے نئے ناسور کا

خوں بھی ذوقِ درد سے فارغِ مے تن میں نہیں

کثرتِ درد پر ہوشیاری پیرِ میخانہ کو تھی ڈٹ گیا میں رندِ پینے پر تو قلعی کھل گئی
ایک کش میں خم کے خمِ قالی کیے اور بس کی لے گئی ساقی کی نچوٹِ قلزمِ آشامی مری
موجِ مری کی آج رگِ سینا کی گردن میں نہیں

عزم جو آنے کا ہی پھر کو نہ آئے دل سے دوو کیا اُدھیر اپنی پیری نے تن کا تار و بونہ
 نیستی ہی اپنی ہستی اور عدم اپنا وجود ہو فشا رصفت میں کیا نا توانی کی نمود
 قدر کے جھکنے کی بھی گنجائش مے تن میں نہیں
 کس طرح ہر زنا ہو اس کی بدِ خلقت میں قدر مال میں جس کا نہ حصہ ہو نہ ہو دولت میں قدر
 قدر کی حسرت عیش و بہار قسمت میں قدر تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
 بے تکلف ہوں ہشت خس رگ کش میں نہیں

(۴۹)

اب جو مستانہ گھٹا آئے برستی ایک دن آدھل جل کر اٹھا میں لطف ہستی ایک دن
 دیکھ لو گے بچو دوں کی تیز دستی ایک دن ہم سے کھل جاؤ بوقتِ محو برستی ایک دن
 ورنہ ہم چھڑیں گے رکھ کر عذر ہستی ایک دن
 جب گرہ میں ام تھے پیرمناں تھا مہر باں رات دن پیہ پیہ پلانے سے تھی تب نصرت کہاں
 منطقی میں بھی نہ اس جھپکے سے باتی تھاں قرض کی پیٹتے تھے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
 رنگ لائے گی ہماری فادہ ہستی ایک دن
 بے بہا اس دور کی ایک ایک ساعت جانیئے اس کی رونق کو نہ کچھ بقدر و قیمت جانیئے
 زار نالی بھی جو ہو تو سارِ عشرت جانیئے نمنہ ہائے غم کہ بھی احوال غنیمت جانیئے

بے صدا ہو جائے گا یہ ساریستی ایک دن

زعم و نامانی پر اس درجہ نہ کرنا داں نہ ہو مثل گل پڑ مرده ہوگا ورنہ یوں خندان ہو
چارون کی رفعت ہو ہم پر نازاں نہ ہو عرقہ اوج بنائے عالم انکاں نہ ہو

اس بلندی کے نصیبوں میں ہیستی ایک دن

شب سحر محل جو ہٹا پائی وہ کرنے لگا کون کہتا ہو کہ غیروں نے لے لے اکسا دیا
اس بُرے برتاؤ میں مرتزا نہیں اس کی خطا دھول دھپا اس ہر اپنا ناز کا شیوہ نہ تھا
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب سہیستی ایک دن

۵۰

ظاہر میں گو شفیق نہیں مہرباں نہیں ان کے ہمارے ربط کوئی درمیاں نہیں
لیکن خفا بھی ہم سے وہ جان جہاں نہیں ہم پر جفا سے ترک وفا کا لگاں نہیں
اک چھپڑا ہو ورنہ مراد امتحاں نہیں

تم پوچھنے جو آئے تو مجھ پر کرم کیا کچھ بھی اگرچہ رسم عیا دست نہ کی ادا
کیا کم ہو یہ نگاہِ ترجم سے دیکھنا کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا
پرستش ہو اور پائے سخن درمیاں نہیں

ہوتا نہیں وہ رام تو ہو اس کا رم عزیز بڑھتا ہو جس سے شوق نہ ہو کہا ہو کم عزیز

خفگی کا بھی تو شوق کی ہی ہم کو غم عزیز
ہم کو ستم عزیز ستم گر کو ہم عزیز
نا مہرباں نہیں ہو اگر مہرباں نہیں

کیا جانے ذوق جو رو بھاکو دوسا ہیز
ہم جس سے یاد آتے ہیں ہو ظلم ہی چیز
اس لطف معنوی کی کہاں غیر کو تمیز
ہم کو ستم عزیز ستم گر کو ہم عزیز
نا مہرباں نہیں ہو اگر مہرباں نہیں

کیا بات میں نے کی ہو کہ تم کو بری لگی
حیرت سی نام بوسہ لب سن کے ہو گئی
میں نے کیا سوال تو مجھ سے خطا ہوئی
بوسہ نہیں نہ وہ بچھے و نشام ہی اسی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم گوداں نہیں

قصیدہ

ہر چند غمے یار ہیں اک الہاب ہو
ہر چند مجھ کو اس کی حضوری عذاب ہو
ہر چند غیظ و غصہ بوقت خطاب ہو
ہر چند جاں گدازی تہر و عتاب ہو
ہر چند پشت گری تاب تو اں نہیں

لیکن جلاس سے رحم و کرم کی امید ہو
جو گشتگوئے تلخ ہی حلوائے عید ہو
اس فراق و انبساط میں شکوہ یسید ہو
جان مطربہ ترا نہ ہل من مزید ہو
لب پر وہ سنگی زمزمہ الاماں نہیں

صادق اگر عشق تو پھر کیا ہو خوف و بیم کمند زیار گو ہر جاں بھی نہ بن لیم
پیدا وہ درو کر کہ ہو حال جگر سقیم خنجر سے پیر سینہ اگر دل نہ ہو دیم
دل میں چھری چھو جو مرہ تو نچکاں نہیں

بے دل غ سینہ ہو تو نہ سینہ لے سے کہو خالی ہو سوز سے تو جگر کو خال دو
مضطر اگر نہ تو سلام ایسی جان کو ہو ننگ سینہ دل اگر آتش کہہ ہو
ہو علو دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

وحشت میں سر کیٹھو تا ہوں کھلے بیچ قباب دیوار و در گریں کہیں ہو کچھ تو انقلاب
دیوانہ ہوں تو کیا مجھے آتا نہیں حساب نقصان نہیں جنوں ہیں بے ہو گھر خراب
سو گزین کج بے بیاباں گراں نہیں

عقاب بنگی کا مادہ میری مرثیہ میں بیت لہضم میں عمر کٹی یا کشت میں
ہوتا تھا اور خاک مرے بخت میں کہتے ہو کیا لکھا ہو تری سر نوشت میں

گویا جہیں پہ سجدہ بت کا نشان نہیں
ہو حرف گیر اگر تو زبیاں خاص و عام کی پروا نہیں کسی کے خیالات خام کی
شہرت ملا لیکہ میں بھی ہو میرے نام کی پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی
روح القدس اگر چہ مرا ہنر باں نہیں

مرزا سوال بوسہ لب کو وہ ہر گھڑی سُن کر جو ٹالتا ہی تو سو جھی ہی دور کی
جب لب لبائے گاتو خود ہوگا مقتضی جان ہی بہائے بوسہ ولے کیوں کہے ابھی
غالب کو جانتا ہی کہ وہ نیم جاں نہیں

(۵۱)

میں جو آوارہ ہوں اس میں مری تصویر نہیں میری تحریر جہیں لایق تصویر نہیں
قابل چارہ مری گردشِ تفتیر نہیں مانع دشتِ فردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہی مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

دل کا اک لولہ ہی جو پئے پھرتا ہی کشاں بچو دانتا ہوں کہ اولاد بھی نظروں سے نہاں
کوئی منزل بھی تو پیدا نہیں جز وہم و گماں شوقِ اسِ شستینِ ٹوڑے ہی جھکو کہ جہاں
جادو غیر از نگہِ دین تصویر نہیں

جان تو نذر میں جلا دے دی جاتی ہی اس کے خوش کرنے کی تدبیر تو کی جاتی ہی
لیکن اُمید جہاں قطع ہوئی جاتی ہی حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہی
جادو راہِ رفتِ جزوِ شمشیر نہیں

نہیں ناکامی سراپا کی پروا مجھ کو نہ خیالِ آہ کی بربادِ روی کا مجھ کو
ہو نہ پوری نہ سہی ہی تو منتِ مجھ کو رنجِ نومیدی جاوید گوارا مجھ کو

خوش ہوں گر نالہ زبونی کش تا نہیں

خشک ہو زخم تو بے چین دل اپنا ہو جائے جب تک اک زخم نیا اور نہ پیدا ہو جائے
سنگِ طفلان جو نہ کھاؤں مجھے سوا ہو جائے سر کھجانا ہی جہاں زخم سرا چھا ہو جائے

لذتِ سنگ باندازہ قسرتِ یر نہیں

کر لیا عفو کا جب وعدہ راسخ اس نے کون شرمندہ ہو پھر شرم گنہگاری سے
نفس کہتا ہو کہ لے خوب گناہوں کے منے جب کرمِ خستِ بیباکی و گستاخی سے
کوئی تقصیرِ جہنمِ غفلتِ تقصیر نہیں

وہ بھی مہرِ آسا جریدہ ہو بقول ناسخ صاحبِ اوصافِ حمیدہ ہو بقول ناسخ
ہند میں شاعرِ حمیدہ ہو بقول ناسخ غالب اپنا یہ عقیدہ ہو بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہو جو معتقدِ تیر نہیں

تری رہ گزریں جو ہم دیکھتے ہیں فضا ایسی جنت میں کم دیکھتے ہیں
گل و لالہ ہر جا ہم دیکھتے ہیں جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں
ہوئے ہم جو مشتاق اس کے سخن کے یہ آثار گویا ہیں دیوانہ پن کے

دہن ہی نہیں اس بتِ سحر فن کے دل آشفٹ گاہِ خالی کنجِ دہن کے

سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں

ترے قدموں نے پایا وہ عالم عجیب کیا قیامت کرے خیر مقدم
جو تو ہوسہ اماں تو محشرِ مسلم ترے سروِ قامت سے اک قدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

جو ہر حیرتِ آئینہ تجھ کو پیاری تو اس سے بھی بڑھ کر ہر حیرت ہماری
فقط اک نگہ کی ہی اُمیدواری تماشا کر ای محوِ آئینہ داری
تجھے کس تماشا سے ہم دیکھتے ہیں

رہے ہجر میں رات بھر گرم نالے گئے قافلے جانبِ عرش ان کے
نہ ہوتا نشان تو نشان بھی نہ پائے سراغِ توفانِ نالہ لے واغِ دل سے
کہ شبر و کافکش قدم دیکھتے ہیں

نہیں رکھتے مرزا کسی سے مطالب نہ دل جانبِ عیشِ دنیا ہو راغب
تماشا نہ رہا نہ دولت کے طالب بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشا سے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

(۵۲)

جلتا ہوں ان کی گرمی تہر و عتاب میں کیونکر منے نہ پاؤں عذاب عتاب میں
پہچھو نہ مجھ سے گرمی دوزخ کے باب میں مٹی ہو غم سے یا رستے نار الہتاب میں

کافر ہوں گر نہ مٹی ہو لذت عذاب میں

آیا ہوں درد و غم کے لیے انتخاب میں دن زندگی کے کاٹا ہا ہوں عذاب میں
ہوں عرصہ دراز سے اس پیچ و تاب میں کب سے ہوں کیا بتاؤں جہان خراب میں
شہائے ہجر کو بھی رکھوں گہ حساب میں

کیا کہیے ہوتی تھی شب غم کس طرح بسر اختر شمار یوں ہی میں ہو جاتی تھی سحر
ٹوڑا ستم یہ اور نیا چشم شوق پر آپھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر

آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

آنکھوں میں ہیشتری نہ تھا نیند کا گزر کرتا تھا صبح ہجر میں سر پٹ پیٹ کر
غفلت جو روئے رشتے ہوئی شب کسی قد آپھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر

آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

لکھ تو دیا انھیں کہ مرا مال ہی زبوں جوان سے آرزوئے تسلی تراجبوں
آگاہ آن کی عادت خجالت سے خوب تہاں قاصد کے آئے آئے خط اک اور لکھ رکھوں

رہتے تھے ہم پرالہ جہاں اُسے خاص و عام
پینے میں آج تجھ کو نہو کس طرح کلام
اُٹھتا تھا ایسی بزم سے میں روز نشہ کام
مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا درجام

ساقی نے کچھ ملانہ دیا ہو شراب میں

آنکھیں بھی اڑا رہیں جو بچھاتا ہوا چلے
چالیں ہزار بار سے یہ پُر دغا چلے
ملن نہیں کہ مکر و نمون غیر کا چلے
جو منکر و وفا ہو فریب اس پہ کیا چلے

کیوں بد گمان ہوں دست دشمن کے باب میں

دشمن کا مجھے تو یہ ہے کہ دشمن نہ آ کرے
تم ہنستے ہنستے ہو گئے خاموش کس سیئے
جاتے ہوئے تھیں مئے گھر سے نہ دیکھ لے
میں مضطرب ہوں صل میں خوفِ قیام سے

ڈالا ہو تم کو وہم نے کس بیج و تاب میں

وہ آج میرے گھر جو چلے آئے مست و
جاتے ہوئے وصال کا وعدہ بھی کر گئے
شکر خدا کہ ہو گئے قصے تمام ٹو
میں اور خط و صل خدا ساز بات ہو

جاں نذر دیتی بھول گیا اضطراب میں

شاہ پرہہ کچھ اثر ہیں نمایاں نقاب کے
اتار بات بات میں ہیں بیج و تاب کے
لیکن ہیں چُپ خیال سے شرم و حجاب کے
ہو تو رسی چڑھی ہوئی اندر نقاب کے

ہو اک شکن پڑی ہوئی طرف نقاب میں

اتنا ہیوں تو ان کو لڑانا لنگاہ کا نظریں بچا کے سب کی ملا نا لنگاہ کا
آفت ہوا نہ مگر نہ اٹھانا لنگاہ کا لاکھوں لگاؤ ایک چرانا لنگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

وہ نالہ جو کہ عرشِ معلے کو بھی ہلائے وہ نالہ جو زمین کو بھی زلزلے میں لائے
وہ نالہ اور کان تک اس شوخ کے بچائے وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالہ سے شکاف پڑے آفتاب میں

جادو وہ چیز ہے کہ جو اس کو عمل میں لائے مشکل سے مشکل امر کو آسان کر دکھائے
لیکن مجھے یہی تو ہی افسوس ہائے وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سیفِ رواں ہو سراپ میں

تھے یاد ہم پیالہ ہمارے سبھی کبھی دیکھا نہ ہم نے ہوش میں ہرگز اکو بھی کبھی
وہ دن کہاں کہ شغل سے فرصت نہ تھی کبھی غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ برابر و شبِ ماہِ شباب میں

۵۳

جامِ سب کو رکھ نہ بچا کر سحاب میں شامل نہ کر جمہوری کو شب کے سحاب میں
دہاں کچھ کمی نہیں کہ ہو تو غنڈہ سراپ میں کل کے لئے کہ آج نہ خست شراب میں

یہ سوئے ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں

یا تو ملائم سے بھی تھا مرتبہ بلند ہم سا نہیں ہی یا کوئی اب غوار و مستند
پہونچا رہا ہے ہر شمس ہمیں گزند ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند

گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

آواز کیوں یہ دوح کا غالب سے انزع کیوں بھٹکے کہ پسانس کا ہوتا ہے انقطاع
سننے سے اس کے کہتے پہنچ پہنچ الوداع جان کیوں نکلنے لگتی ہو تن سے دم سماع

گر وہ صدا سمانی ہے چنگا و رہا بس میں

کہتے ہیں صاف صاف یہ انداز چال کے لینا نہیں عادم سے ادم دم کہیں اسے
بے اختیار ہوں کہیں مجھ کو گرا نہ دے رو میں ہی خوش عمر کہاں دیکھیے کھتے

وئی ہاتھ باگ پر ہو نہ پا ہی رکاب میں

کی لاکھ فکر ہستی آشنا میں پڑی پڑی قصہ ہوا نہ ان کے وجود و عدم کا طو
حیرت میں مبتلا ہوں کہ میں بھی ہوں طرفہ شو اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بعد ہی

جتنا کہ دہم غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

ایسا دیکھا کہ موجود و موجود ایک ہی سب مہدوں میں عابد و معبود ایک ہی
کیا ذکر سجدہ سجد و مسجود ایک ہی اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہی

حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہو کس حساب میں

موج و حباب میں ہی مقررہ وجود بحر
ان کا وجود بھی ہو سرا سر وجود بحر
کہیے انہیں عرض تو ہو جو ہر وجود بحر
ہو مثل نمود صورت پر وجود بحر

یاں کیا دھرا ہو قطرہ و موج و حباب میں

جیتے ہیں تانہ حسن سے ہم کو ہو آگہی
ہر ہروں کے واسطے سامانِ گمراہی
جب پھپھکے نہ ذاتِ پیرے کی کیا رہی
شرم اک اٹلے ناز ہو اپنے ہی سے ہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

گو خود نما نہیں ہو وہ پردہ نشیں ہنوز
نظارگی نہیں کوئی اس کا کہیں ہنوز
ہو مجرناز خود بھی وہ ناز آفریں ہنوز
ارایشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز

پیش نظر ہو آئینہ دائم نقاب میں

اشیاء کی ہو تصور اشیاء سب نمود
دیکھا جو غور سے تو خیالی ہیں سب وجود
ہستی کی داعی کی بدولت ہو ہستی بود
ہو غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے میں غیب میں

مرزا کو ایک عمر سے ہی جستجوئے دوست
کچھ آرزو نہیں ہو بجز آرزوئے دوست
انکبیس ہیں سمنشیں کی طرف لے ہو دوست
فالتبایم دوست آتی ہو بے دوست

مشغول حق ہوں بندگی بو تراب میں

(۵۵)

کس طرح روکوں گریہ شام و سحر کو میں رونے میں رونہ بیٹھوں کہیں چشم تر کو میں
کس کس کے بیخ و غم میں کھپاؤں گا سر کو میں جیساں ہوں ل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوہ گر کو میں

مانا نہ دل سے تیرا پتہ دشمنوں کو دوں آگاہ تیرے نام سے اغیار کو کروں
آوارہ و خراب تری جستجو میں ہوں چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

جس راہ میں قدم کا بھی لکھنا تھا تنگ عار طو سر کے بل کیا اُسے اللہ رے اضطراب
دم بھر کو بھی تو دل نے نہ لینے دیا قرار جانا پڑا قریب کے در پر ہزار بار
اچھ کا شس جانتا نہ تری رہ گزر کو میں

آمان میرے قتل کو کس زعم پر ہوئے انجان تم نے جان لیا جان من مجھے
دھکی میں تو وہ آئے نہ معلوم ہو جسے ہی کیا جو کسکے باندھو گے میری بلاؤں سے
کیا جانتا نہیں ہوں تمھاری کمر کو میں

میں جانتا تھا مجھ کو فقط ان سے کام ہو الفت ہو ماسول سے تو سودا سے خام ہو

اُس پر بھی ہے یہ قدر تو میرا سلام ہو لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے شک و نام ہو
یہ جانتا اگر تو سلطانہ گھر کو میں !

کہتا ہوں "تو قدم بھی اگر طو تو ہو کے ساتھ یعنی ہر اک قدم پہ ہوں کھنڈروں کے ساتھ
آہستہ رو کے ساتھ کبھی تیر رو کے ساتھ چلتا ہوں تھوڑی دیر ہر اک راہ کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

ہر جذبہ کدوں ہی میں سب عمر دی گزرا لیکن خدا گواہ کہ ایماں ہے ہر قرار
ہاں شوق وید کا تو ہوں بیشک گناہگار خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوچھتا ہوں اُس بت سیداگر کو میں

پھر گم ہوا تلاش میں اس کی میں دلفگار ہوش و حواس پر نہ رہا پھر کچھ اختیار
پھر سعی و جستجو کا جنوں سر پہ ہے سوار پھر بیخودی میں بھول گیا راہ کوئے یار
جانا دگر نہ ایک دن اپنی خیر کو میں

پرساں حال کوئی ہنسر کا نہیں ہا باقی جہاں میں قدر ہنر و نہیں ذرا
مجھ کو یہ زعم اب بھی ہیں گاہک ہزار ہا اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہل دہر کا
سمجھا ہوں دلپذیر متاع ہنر کو میں

مرزا میری دعا بھی ہے ہر بصد نیاز دیکھوں جمال یار میں ای رب کار ساز

جس طرح پہلے کہہ گیا ہو اک سخن طراز غالب خدا کرے کہ سوار سمن دان
دیکھوں عسلی بہادر عالی گہر کو میں

(۵۶)

کون کہتا ہو خفا، مجھ سے وہ مغرور نہیں کینہ و بعض جو مجھ سے ہو وہ مستور نہیں
لے سکے نام مرا کوئی یہ فتور نہیں ذکر میرا بہ بدی بھی لے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ وہ نہیں

بہ اک عمر کے بیدار ہو طالع شوق خوش نصیبی ہو کہ چکا تو ذرا طالع شوق
آج تو بے سربازی ہو مرا طالع شوق وعدہ سیر گلستاں ہو خوشا طالع شوق
مردہ قتل مستدر ہو جو مذکور نہیں

ہو فقط نقطہ موہوم اگر ہو عالم دہن اس شوخ دل آرا کا مگر ہو عالم
وہم ہی وہم ہو گو پیش نظر ہو عالم شاہستی مطلق کی کمر ہو عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہو پراہیں منظور نہیں

غور سے دیکھ اگر رکھتا ہو چشم باطن تجھ پہ کھل جائے گا یہ عقدہ مشکل اک دن
جزو ہو کل سے جدا یہ نہیں ہرگز ممکن فطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہو دریا یکن
ہم کو تقلید تناک طرفی منصوبہ نہیں

وائے ناکامی اُمید کہ ہمت نہ ہی بار غم جس سے اٹھائے تھے وہ قدر نہ ہی
چسدرول کا ہوا ہست وہ جرات نہ ہی حسرت اذوقِ خرابی کہ وہ طاقت نہ ہی
عشق پر پردہ کے گوں تن رہجو رہیں

ہنسکے کہتے ہیں گئے آپ اگر جنت میں ہونگے غلمان ہی غلمان دہان یا حوریں
کچھ تعجب نہیں جو آپ وہاں جو رہی لیں میں جو کہتا ہوں کہ ہم لینگے قیامت میں تمہیں
کس لعنت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم جو نہیں

یہ تو ممکن نہیں تو دل سے مجھے بھولا ہو ہاں جو اغماض سے لے کام تو چارہ کیا
کچھ بہانہ بھی رہے یاد کا تو اچھا ہو ظلم کر ظلم اگر لطافت دریغ آتا ہو
تو تغافل سے کسی رنگ میں سعد و زہد نہیں

ای خوشابزم طرب جس میں بہم ہیں ہم لوگ دافعِ سنج واطم و شمن غم ہیں ہم لوگ
آن تک اہر و نقش قدم ہیں ہم لوگ صاف دردی کش پیمانہ جم ہیں ہم لوگ
وائے وہ بادہ کہ افشردہ انگو رہیں

ہو فدا ہی مرے نکم توں کا فدا فی غالب میری حکمت کا ثنا گر ہو شنائی غالب
پوچھو مرزا سے مری نعمہ سرا ہی غالب ہوں تلوری کے مقابل میں خفائی غالب
میر کے دعوے کے پو یہ حجت ہو کہ مشہور نہیں

(۵۷)

قابلِ رجز فنانِ دلِ ناسا دہیں آہ و زاری یہ مری لایتِ ایراد نہیں
ہر نقطِ یاد و ہائی کوئی فریاد نہیں نالہ جز حسنِ طلب اس سقمِ ایجا دہیں
ہر تقاضا، جفا شکوہ بیداد نہیں

عاشقوں کو نہیں محبوب سے جاں بھی محبوب ہاں سمجھتے ہیں صبا جوئی دشمنِ معیوب
نگہِ عشاقِ مخافرا د کا بیجا اسلوب عشق و مزدوری عشرتِ گم خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نہ کو نامی فرما دہیں

کشتی تھی خانہ نشینی تگ و دو سے محروم ابے کا وٹ و دمِ وحشت ہو نہ دل ہی مغنوم
گو بیاباں میں ہو آبادی رونقِ معدوم کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعتِ معلوم
دشت میں ہی مجھے وہ عیش کہ گھرایا نہیں

ہر تغیر سے زمانہ کے ہو عبرتِ مطلب دور اس کا سینِ آموزیِ عالم کا سبب
یہ موزب وہ ہو جو خوب سکھاتا ہوا دب اہلِ پیش کو ہی طوفانِ حولدتِ کتب
نظم موج کم از سیلی استا دہیں

کس خوشی سے تو تھبلا کیے ہم جو روحِ جفا آہ و نالہ کو کیا ضبط سمجھ کر شکوہ
پھر بھی سمجھا نہ ستم گار نے پابندِ رضا وائے محرومیِ تسلیم و پدا حالِ وفا

جاننا ہی کہ ہمیں طاقت فرما نہیں

آشیانے سے قدم اب تو خال اپنا کہیں
اب نہیں ہو وہ زمانہ کہ ہے گوشہ نشین
شکر کر آج کوئی دام نہیں فرشتہ میں
سبد گل کے تلے بند کرے ہی گلپیں

مشرق ای مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں

دل کے لینے کو تو ہر دم تھا تقاضا لا لا
بوسہ مانگا تو بہ تکرار یہ بولا لا لا
تھا تو ممدوم دہن لانے معما کھولا
نفی سے کہتی ہی اثبات تراوش گویا

دی ہی جائے دہن اس کو دم ایجا نہیں

شبم اس عشرت گلزار پہ گریاں کیوں ہی
دیدہ نرگس حیرت زدہ حیراں کیوں ہی
منقبض غنچہ گل وقت بہاراں کیوں ہی
دیدہ نرگس حیرت زدہ حیراں کیوں ہی

گرچہ چراغانِ سرِ رہ گزر باد نہیں

تم اگر بھول گئے اپنی حکایت غالب
سنو مہرِ راسے وہ پُروردِ روایت غالب
ہو گئی سہو کی یہ کیا تھیں عادت غالب
کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب

تم کو بے مہری یاران وطن یاد نہیں

۵۴

مرے عقایدِ راسخ میں کچھ فساد نہیں
خدا خواستہ میں منکرِ معاد نہیں

خوب گل چھڑے اڑا کوئی مرزا ہی نہیں

غلط کہ یاد مجھے طویل روزِ داد نہیں نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں

شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

یہ بات ساقی ہوش نے کیا بنائی ہے کہ ہو نہ ابر تو پینے میں کیا برائی ہے

ایسے کیا اسی صورت سے پی پلائی ہے کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا برائی ہے

بلا سے آج اگر دن کو ابر باد نہیں

کون رقیب برائی بھی تو بُرا نہ کہیں بھلائی لاکھ ہو مجھ سے مگر بھلا نہ کہیں

کئی زباں سے کوئی کلمہ خیر کا نہ کہیں جو آؤں سامنے ان کے تو مرجھا نہ کہیں

جو جاؤں پاس سے ان کے تو خیر باد نہیں

دل و جگر غم و انداے رشک بہتے ہیں سرشکِ خونِ جگرِ چشمِ تر سے بہتے ہیں

حد کے ساتھ وہ مصروفِ عیش رہتے ہیں کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں

کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

کھلا ہی رہتا ہے اٹھوں پہرِ فیض کا باب اس آستانے سے ملتا نہیں کسی کو جواب

جو صرفِ راہِ خدا ہو نہیں کچھ اُس کا حساب علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب

گداے کو چہ میخانہ نامراد نہیں

ابے جہان میں ہم مبتلاے رنجِ مدام کھلی جو آنکھ تو دیکھا نہ جز غم و آلام

سنا نہیں بھی ہم نے سرور و عیش کا نام جہاں میں ہوں غم و شادی بہم ہیں کیا کام
 دیا ہی ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں
 اک لہاس تو مرزا کی بھی سُنو غالب کرو وہ بات نتیجہ بھی جس کا ہو غالب
 خیف ہو گے یہ چھیڑاں سے چھوڑو غالب تم اُن کے عیسے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالب
 یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

(۵۹)

روزِ مضمون نیا باندھتے ہیں روزِ مرہ بھی جدا باندھتے ہیں
 تجھ کو ہم برقِ ادا باندھتے ہیں تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں
 ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں
 نالہ دل کی حقیقت کیا ہے کامیاب اس سے کوئی ہوتا ہے
 چھیڑنا اس کو فقط منشا ہے اہ کا کس نے اثر دیکھا ہے
 ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں
 تجھ کو وہ چال ہے حاصلِ عمر دم میں طی کرتی ہے منزلِ عمر
 تیری رفتار ہے کاملِ عمر تیری فرصت کے مقابلِ عمر
 برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں

بند کا جبکہ ہی بندہ مفہوم مرگ کی پھر ہی توقع موہوم
کیوں رہیں شوقِ اجل میں مغموم قیدِ ہستی سے رہائی معلوم
انک کو بے سرو پا باندھتے ہیں

سر میں لکھتا ہی نہ یہ نشہِ مل نہ اسے نازشِ عشقِ بلبل
ناز ہو حسنِ پیر اپنے با کُل نشہِ رنگ سے ہو واشدِ گل
مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں

ان کی بندش کو سخنِ چیت پوچھ کس طرح لیتے ہیں تحسینِ مت پوچھ
شعرا کی غلط آئیں مت پوچھ غلطیہائے مضامین مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

مجھ سے وحشی کا کیا کیا درماں ڈال دی پاؤں میں گیا جولاں
چارہ گر اپنے ہیں کتنے ناداں اہل تدبیر کی واماندہ گیاں
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

تھے وہ مرزا ہی سے پہاں غالب ہم سے دھوکا نہیں آساں غالب
ہم کو سمجھا کوئی ناداں غالب سادہ پرکار ہیں خواہاں غالب
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

(۶۰)

جب تیری خاک سہ کی برابر نہیں توں میں کیا شکوہ سنج جو رشتہ در نہیں ہوں میں

رہتے میں سنگ در کا بھی ہمسر نہیں ہوں میں داہم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں

خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

ہو جائے مضطرب تو نہیں کچھ خطائے دل انصاف شرط ہو کبھی راحت بھی پائے دل

دن است جو چرخ کہاں تک اٹھائے دل کیوں گردش بدام سے گھبرانہ جائے دل

انسان ہوں پیالہ وس غر نہیں ہوں میں

بیچارہ کیوں سمجھتے ہیں اہل جہاں مجھے نقصان کیا کسی کو ہو میرے وجود سے

سہواً ظلم نہیں ہوں کہ معنی بدل گئے یارب مجھے زمانہ ٹٹاتا ہو کس لئے

لوح جہاں پہ حرف مکر نہیں توں میں

تجو نیز قتل مجرم الفت کے واسطے ہو سنگ مدعی عدالت کے واسطے

یہ جو ر و ظلم اہل محبت کے واسطے حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے

آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

حضرت حقیر جانتے ہیں کس لئے مجھے بے آبرو کیا مری تقدیر نے مجھے

نسبت نہیں ہو کوئی جادات سے مجھے کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے

لعل و زمر و زرد و گوہر نہیں ہیں

اجرام چرخ بھی تو نہ محروم ہوں درین
اور مجھ سے آج کٹ دہی جوں کا توں دین
بندہ نواز کس لیے آخر ایویں درین
رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں کیوں دین
رستے ہیں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہیں

گردوں نے بوسے پاؤں کے کس شوق سے لیے
سر پر قدم تھالے زیریں تک نہ لے گئے
یہ یوں ٹوک ہی تو فقط ہو مرے لیے
کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کے لیے

کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

مرزا کی طرح شغل تمھیں بھی کوئی نہ تھا
بیکار بیٹھے بیٹھے زمانہ گزرتا گیا
خوابیدہ بخت شکمہ ای بیدار تو ہوا
غالب نے طیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے تو کہ نہیں ہیں

تھیں کبھی زلفیں جو زیب سنبلستاں ہو گئیں
خار بن کر جلوہ گر دلہ و زہر گاہاں ہو گئیں
شکل زکس چشمہائے شوخ و فشاں ہو گئیں
سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پہاں ہو گئیں
آہ ای عہد جوانی وہ اُنٹکیں اب کہاں
تو ہی جب نصرت ہوا پھر کیا ہی عمر جاوے

دلوئے ہی دل میں تھے کچھ اور جیکے تھے جواں
یاد تھیں ہم کو بھی لکھا رنگ بزم آرائیاں

لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

ہو گیا ہر چند پہلو سے جدا تختِ جگر
دکھتی آنکھوں ہوا گم یک سیک نورِ نذر

دیدہ بے نور وا تھے شوق سے آنکھوں پہر
قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر

لیکن آنکھیں روزِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

سیکڑوں قربانی رشکِ قنابت مر گئے
ہیں زبانِ خلق بہرِ دن رات جن کے تذکرے

غیر کا نظارگی ہونا نہ چاہا عشق نے
سب رقیبوں سے ہیں خوشن بزمِ زمانِ مصر سے

ہو زلیخا خوش کہ موماہ کسناں ہو گئیں

ہم کو یہ سمجھے ہوئے ہیں اس قدر بے ننگ نام
ننگِ ہر ان کیلئے ہم ہوں گراں کے غلام

خیر اگر چاہا خدا نے پھر تو بن جائے گا کام
ان پر نرا دوسرے لینگے حنکد میں ہم انتقام

قدسِ حق سے یہی عوریں گرواں ہو گئیں

دل میں تو بیشک اُترتی ہیں یہ پھریاں بارِ بار
اُن واحد کیلئے لیکن نہیں ان کو قرار

تیرن کر آ رہی ہیں جا رہی ہیں برقِ وار
وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یہ لکے پا

جو مری کو تا ہی قسمت سے نرگاں ہو گئیں

دیدہ ہوا دنِ رباں نے تو کھا کر پیچ و تاب
کم ہوا منتِ حاجتِ مری اس کا عتاب

ہو گیا ہی سہل گویا میں ہونا یا رباب
واں گیا بھی میں ان کی گالیوں کا کیا جواب
یا دھنیں جتنی دعائیں صرف رباں ہو گئیں

کام اچھا دے گیا صبر و سکون انجام کار
ورنہ پہنچی تھی یہ نوبت پیرہن ہوتا رنار
دل فٹاں کرتا تو پھر ہاتھوں کو کیوں ہوتا قرار
بسکہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں بار بار
میری آہیں بچیہ چاک گریباں ہو گئیں

میکے میں تشنہ لب جو نہ نہا کام آگیا
چشتہ آب بقا تک وہ مو آ شام آگیا
جی گیا جو شستہ شمشیرِ لاسم آگیا
جاں فزا ہی یادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں

اپنے نصب العین ہیں جہل نہا ہے بالعموم
نقش ہیں دل پر تمام ان کے قوانین اور علوم
بچ ہیں اپنی نظر میں لاکھ ہوں سب کی حیم
ہم موحہ ہیں ہمارا کیش ہو ترک رسوم
ملتیں جیب مٹ گئیں اجزاء ایماں ہو گئیں

ابتدا میں تو بہت کچھ دل کو ترپاتا تو رنج
غمزدہ کی جان کو آٹھوں پر رکھتا ہو رنج
ضبط و اعتدال سے آخر ہنگام ہو رنج
سج سے جو گرہا انسان ٹوٹ جاتا ہو رنج
مشکلیں چھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

دو تاروں نے کامیرے کیوں اڑاتے ہو مذاق
یہ لہو روانا بھی ہو آنکھوں کا حسن اتفاق

میرزا غلام احمد دہلوی نے یہ شعر لکھا کہ
روح کلام غالب میں یہ شعر لکھا کہ
میرزا غلام احمد دہلوی نے یہ شعر لکھا کہ
روح کلام غالب میں یہ شعر لکھا کہ

ہو شبِ ہجران کی تاریکی زیادہ دل کشاوت
اشکِ خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہوشامِ فراق
میں یہ سمجھو نگاہِ دو سمعیں فروزاں ہو گئیں

بزم میں جو ہمیشہ تیرا ہی راہیں اس کی ہیں
صبحِ نظارہ پس کہ دیتا ہوں راہیں اس کی ہیں
اس سے بھی وہ خوش نصیب ہے ہوا راہیں اس کی ہیں
نیناس کی ہو دماغ اس کا ہوا راہیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پیشیاں گئیں

اگر غضب کا یہ طوفان خیز دانا لاماں
اس کی آنکھوں نے تو باندھا ابرو بار لکھاں
کرو پئے اس نے بھی ہر زاویہ دریا رواں
یوں ہی گزرتا رہا غالب ای اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو ختم کہ ویراں ہو گئیں

(۶۲)

دشتِ ہوا اور طاقتِ رفتا رہی نہیں
دامنِ بقدرِ خلعتِ یکِ خار بھی نہیں
ہمساجنوں زوہ کوئی نادر بھی نہیں
دیوانگی سے دوش پہ زنا رہی نہیں

یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں

ہو کر غریبِ درطہ حیرماں ابھر چکے
یہ یاس جیتے جی ہی تو سمجھو کہ مر چکے
دن اپنے جبکہ شوقِ لقا میں گزر چکے
دل کو بنا زحیرت دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

ملنے ہیں تجھ سے کرتے ہیں جو سر سے ادا طو
البتہ تجھ کو پا نہیں سکتے ہیں سست پڑی
مکن کبھی ہوئی نہیں کوئی حال شو
ملنا تیرا اگر نہیں آساں تو سہل ہو
دشوار تو یہی ہو کہ دشوار بھی نہیں

میں اک نحیف نزار ہوں بے طاقت تو اں
اس پر یہ دل کے ولولے پیثوق جاں تل
حیرت یہ کہہ ہی ہو کہ اب چاہیئے کہاں
بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہو ادوریاں
طاقت بقدر لذت آزار بھی نہیں

سودائے سرا ہو چہ پراگندگی ہوش
وحشت ابھارتی ہو کہ کرنا لہ و خروش
گراؤں بائے کس سے کہ جائے جنوں کا ہوش
شوریدگی کے ہاتھ سے سرزد و بال دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

دشمن ہی کچھ عناد کو سمجھا کریں شرف
پھر نے بھی وہ جو پھٹتے ہیں دن رات سرکف
لیکن میں جو بنفٹن ہو کچھ بھی تو لو حلف
گنجائش عداوت اغیار یک طرف

یاں دل میں ضعف سے ہوں یار بھی نہیں

فریاد میں جو میں نے ہلا دی کبھی زبان
قائم نہ پھر نہ میں رہے گی نہ آسمان
آسان میری آہ جہاں سوز کو نہ جان
ڈرنا لہائے نزار سے میرے خدا کو مان

آخر فوائے مرغ گرفتار بھی نہیں

ہو زخم زار سینہ کو پیکاں سے روکشی دھجی جگر کو خنجر بہاں سے روکشی
کرتا ہو اس کا تیر نظر جاں سے روکشی دل میں ہر یاد کی صفِ ترگاں سے روکشی
حالانکہ طاقتِ خلش غار بھی نہیں

لیتے ہیں کامِ اداؤں سے آلاستِ حرب کا خنجر کی ادھر تیر کی حاجت نہیں ذرا
کرتے ہیں خونِ خلق نہتے ہیں وہ تو کیا اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اور خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

فرزِ اجو بادشاہ تھا امتِ سلیم شعر کا جس کا ہو ملکِ نظم میں جھنڈا اگر اہوا
فرزانہ کوئی ہو گا یہ غالب گمان تھا دیکھا استاد کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہو تو ہوشیار بھی نہیں

۶۱۶

رفوگر کس طرح شک ہو بھلا تیرے ٹہری پن میں کہ بیٹھا ہو رفوگر نے مرنے نفلوں کو دامن میں
کچھ لیتا جو ہوتی تجھ کو کچھ بھی آنکھ اس فن میں نہیں ہو زخم کوئی نہ خیمے کے زورِ مرے تن میں
ہوا ہوتا راہِ شکلیاں مستحکمِ چشمِ سوزن میں

دمِ نظارہ دیوار و در ہوں وقفِ حیرانی کہ اچھا رنگ لائی اشکِ چشمِ ترکی طنبانی
ان آنکھوں کی بدولت بھر گیا امید پر پانی ہوئی ہر مائعِ ذوق تماشا خانہ ویرانی

کعبہ سید اباباتی ہو رنگِ پنیہ و زن میں

کبھی ابرو کے سر صدف میں قفسِ تیغ برآں ہوں کبھی ترچھی نگاہوں سے جراحتِ خوارِ پچاں ہوں
دورِ سوزِ غم سے جلوہ گاہِ واسطِ پہناں ہوں و دیوت خانہ بیداد کا و شہائے مرگاں ہوں

لیکن نامِ شاہد ہی مرا بہ قطرہ خوں تن میں

نہ چھو کیا بلا ہو تیرگی شہائے ہجراں کی چمکے تھے کی ہوس میں مہرِ وفاں کی
سیاہی ماتِ ہی بختِ مہ کی فردِ عصیاں کی بیاں کس سے ظلمتِ گستری میرے شہتیاں کی
شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنیہ دیو اولیٰ و زن میں

ہنسی یاروں نے کیا کی کس نصیحت بھوکو فرمائی نہ اب ہوش و حشمت ہے نہ فرطِ ناشکیبائی
سکوں سا ہو گیا دل کو گیا سامانِ رسوائی نکو مش مائے بے رطبی شوخوں آئی

ہوا ہی خندہ اجابِ پنجپہ چہینا امن میں

نہے تقدیر آئینہ کہ یہ ہو سامنے اُس کے کہاں پہنچا دیا شانِ خدا اس کے معتد نے
ہی ہیرت ہو ضیا پائی ہو کیا اُس کی غلی سے ہوئے اُس روش کے جلوہ تماشاں کے اُس کے
پراشتاں جو ہر آئینہ میں مثلِ تہِ زن میں

کروں کیا ہم نشینوں سے مری حالتِ مخالف ہو مرادِ مہب جدا سے مری ملتِ مخالف ہو
نکھے ڈالا ہوا غصوں میں کیا نیتِ مخالف ہو نجانوں نیکوں سے بڑھوں پر حبیبِ مخالف ہو

جو گل ہوں تو گلشنِ نہیں ہوں گلشن ہیں

مقامِ شکوہ کیا؟ درد اگر لاکھوں دے مجھ کو ذرا پیسے بھی تو بخشے درد کی برداشت کے ٹھکڑے
سبکدوشی نہو گی اس کے احسانات سے مجھ کو ہزاروں دل دے جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو

سید ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں

خیالِ گیسو سے پرہیز میں پابندِ جواں ہیں بتوں کے دم میں پابندوں کی سیدہ مسلمان ہیں
اداس پران کی ہر ترانہ کی طرح کیونکر نہ قریاں ہوں اسدِ زندانیِ تاثیرِ الفت ٹٹے خواب ہیں
نغمہ و مستِ آرزو ہو گیا ہر طوقِ گردن میں

(۶۸)

طمانیتِ دلِ اربابِ میں خاک نہیں خیالِ زر کے سوا اور سر میں خاک نہیں
چھوڑ پڑی ہیں یہاں اور گھر میں خاک نہیں مرے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خونِ جگر سو جگر میں خاک نہیں

خالی ہو کہ وہاں بختِ نارسا لے جائے کوئی اٹھا کے جہنم تک نفسِ مرا لے جائے
غرض ہو کیا اُسے عیاد کی بلا لے جائے مگر غبارِ ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے
وگرنہ تاب و توانِ بل و پیر میں خاک نہیں

ہوئے ہیں فرشِ زمیں گلِ بہار بے حد کھڑا ادب سے سرِ راہِ سروِ خوش قد و

وجودِ عرقِ مرکبِ گلوں سے شاید ہی
 یہ کس بہشتِ شمائل کی آمد آمد ہو
 کہ غیرِ جلوہ گل رہز میں خاک نہیں
 جو فکرِ دل مجھے ہوتی تو یوں نہ کھل جاتا
 سنبھالتا کسی صورت سے اس کو بھلاتا
 مجھے ہی جب نہیں پروا وہ کیوں نہ کھاتا
 بھلا اُسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا
 اثرِ مرے نفس بے اثر میں خاک نہیں
 کیا خالنے نہ مجھ کو کسی سے شرمندہ
 ہوا کسی کی نہ منت کشی سے شرمندہ
 نہیں ای کچھ بھی تو ہوں اپنے جی سے شرمندہ
 ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
 سوائے حسرتِ تمیر گھر میں خاک نہیں
 دامِ طالبِ حسنِ المآب میں و کشش
 کسی کی یاد میں بے ارتباب ہیں میکش
 زمانہ کہتا ہست شراب ہیں جو کشش
 خیالِ جلوہ گل سے خماب ہیں میکش
 شرابخانہ کی دیوار و دریں خاک نہیں
 جو دیکھتے ہیں مضامینِ تازہ کی آمد
 مذاقِ ارٹے ہیں ہر زمانہ تمام الٰہ
 کہا جب ہی غالب نے ہو کے دق ہے صد
 ہمارے شہر میں اب صرف دل لگی کے سد
 کھلا کہ فائدہ عرقِ ہنر میں خاک نہیں

(۶۵)

ہم سے نہ کہیے بار بار کرتے ہوتا کئے کیوں
اپنے ہی دل سے پوچھئے زخم جگر دکھائے کیوں
فرط الم سے خون لاشک میں بہ بجائے کیوں
دل ہی تو نہ سنگ خشک و شستہ پھرائے کیوں

روینکے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

اس میں کسی کو دخل کیا بلکہ عدو نہیں زمین
سر پہ ٹھاکے ہم اسے لے تو بجائینگے کہیں
اپنا نشان مٹائینگے صورت نقش پا یہیں
دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاناں یہیں
بیٹھے ہیں رہ گزرے ہم کوئی ہمیں ٹھکائے کیوں

چشم بشر میں ہو اگر حسرت مہر نیم روز
دیکھ سیکے نہ بھر کے جی طلعت مہر نیم روز
تاب کہاں کہ ہو اسے لو بیتا مہر نیم روز
جسبہ وہ جمال و لغز صورت مہر نیم روز

آپ ہی ہو نظارہ سوز پرے میں مہر نیم کیوں

خوف سے تیرے پروا نہیں سیکے مہر و ماہ
ان کو کہاں یہ تاب ہو دیکھیں جی تیری جلوہ گاہ
سکتہ ہوا نہ کو بھی ڈالے تو اگر نگاہ
وشہ غمرہ جانستاں ناوک ناز بے پناہ

تیرا ہی عکس رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

دہر میں شادی دائم الٰہ میں نوا یک ہیں
زندگی و محن بہ ہم اصل میں نوا یک ہیں
قطرہ آب آسیم اصل میں نوا یک ہیں
نہد حیات و بند غم اصل میں نوا یک ہیں

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اُن سے مدد کا سادہ پتہ گئی بواہوس کی شرم
باندھ کر آیا تھا کفن گئی بواہوس کی شرم
نال کیا وہ تیغ زن رہ گئی بواہوس کی شرم
حسن اور اس پسین ظن گئی بواہوس کی شرم
اپنے یہ اعتماد ہو غیب کو آزمائے کیوں

ہم کو یہ دھن کہ چھٹ بجے راہ صواب پاس وضع
اس کو یہ صدا دھتے ہو کچھ تو جواب پاس وضع
مان رہم و راہ ہو غمے خواب پاس وضع
وال وہ غرور عرونا زیاں یہ خواب پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں ہم وہ بلائے کیوں

ہیں ہوں تلاش یار میں کہتے ہو جس کو گم رہی
بک نہ لگاؤ ہمدموں تم نے یہ بات کیا کہی
اس کی جفا دہر سے مجھ کو ہو خوب آگئی
ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بیوفا سہی
جس کو ہودین و دل عزیزا کی گلی میں جا کیوں

کم ہوئی میکشی کچھ دور مدام بند ہیں
بزم سے اٹھ گئے بیویا کہیں جام بند ہیں
میں و خوشی سے میرزا خاص نہ عام بند ہیں
غائب تھے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

نہ اٹھائے سے مجھے کیا یہ بتا دیا کہ یوں صاف جواب دے مجھے میرے سوال کا کہ یوں

چپکے چپکے گا کام کیا لب تو ذرا ہلا کہ یوں! غنچہ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں

بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

غمرہ جو اس کا دیکھ لے سینے میں پھر نہ دل رہا ناز و کرشمہ دیکھ کر ہوش اڑیں رہے ہے
بیخ نگہ اگر چلے ہو کے ہو جگر نہ ہے پریش طرز دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے

اس کے ہر اک شاہ سے نکلے ہو یہ ادا کہ یوں

ہیم و امید میں ہے کیا کہیں کس طرح جیے حسرت یا س غرض عمر کے دن گنوا دیے
ہاتھ اٹھا اٹھا کے ہم دل سے دھا کیا کیے رات کے وقت مہرے ساتھ رقیب کو لیے

آئے وہ یاں خدا کرے پر کرے خدا کہ یوں

لی ہیں جگر میں چٹکیاں طور بھنا تو دیکھئے مجھ کو جواب کیا دیا طرز ادا تو دیکھئے
کیسا حجاب ٹھا دیا شرم و حیا تو دیکھئے غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھئے

سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھت کہ یوں

سکتے میں خاص عام ہیں عرب جمال پر سے ہونٹ سیٹے ہوئے سے ہیں آج تو اہل بزم کے
حکم سکوت بھی ہمیں گو نہ دیا ہوشوخی نے بزم میں اس کے سوبر و کیوں نہ خوش بیٹھے

اس کی تو خامشی میں بھی ہو یہی عا کہ یوں

کیا کہیں بزم یار میں بات ہی کچھ بگڑ گئی مفت میں ہو گیا مرن مرن نظر تھی دل لگی

دیر تک مٹھتی رہی بات بن آئی غیر کی میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے ہی

سُن کے ستمِ طریقت نے مجھ کاٹھا دیا کہ یوں

اُس کے دکھاؤں عشق کا جوشِ خروش کس طرح لاسے زباں پہ حالِ دل شمعِ جھوٹ کس طرح

شوقِ ہوس کیں بیاں دیدہ و گوشت کس طرح مجھ سے کہا جو یا نے جاتے ہیں ہوش کس طرح

دیکھ کے میری بخجوری چلنے لگی ہوا کہ یوں

آتشِ دہاں جو تھی طبع اسی میں شاد تھی تادریار ہو گزر دل کی یہی مراد تھی

خاک میں بھی اگر ملا خاک بھی وقفِ یاد تھی کب مجھے کوئے یار میں بہنے کی وضع یاد تھی

آئینہ وار بن گئی چہر تِ نقشِ پاکہ یوں

عشق میں صدمہ ہو اگر اُس کا مالِ ہموال جزوِ جہل سے جا ملا ہو گیا ایک سُن کا حال

وجہ سکون و اتحاد کیوں ہو پھر یہ اتصال گرتے دل میں ہو خیالِ صلِ شوق کا زوال

موجِ مجبوطِ آبِ ہوائے ہمدستِ پاکہ یوں

یوں تو ہیں ہند میں بہت فنِ سخن کے مدعی ہیں یہ جدا ہی بنائیں طرزِ ادا کا و رہی

حق تو یہی جو میرِ راضم ہوئی سخنِ ندوی جو یہ کہے کہ رنجیتہ کیونکہ ہو زنگِ فارسی

گفتہ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ لیں

روایت (۶۷)

کچھ بات ہو بطر زمامت ہی کیوں نہ ہو عزت ازی ہم کو خواہ امانت ہی کیوں نہ ہو
 کچھ کہئے ہم سے مل میں کورت ہی کیوں نہ ہو وارستہ اس سے ہیں محبت ہی کیوں نہ ہو
 یکجہ ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

مکن نہیں ہو دل میں گزرا نبساط کا دل میں ہ شوق ذوق کہاں ارتباط کا
 اب نہ میں رہا نہ زمانہ نشاط کا چھوڑا نہ مجھ میں صنعت نے رنگ اختلاط کا

ہو دل پہ بار نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

آزادگی کا اپنی مجھے مل گیا صلہ ٹوٹا ہی التجا سے اعانت کا سلسلہ
 تنکوہ کسی کا ہی نہ کسی کا مجھے گلہ ڈالا نہ بی کسی نے کسی سے معاملہ

اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو

لیں چکیاں جگر میں جو مجھ سے کبھی ملا چھیرا ہمیشہ مشکوہ دشمن کا سلسلہ
 کی بات بھی تو وہ کہ دیا جس نے دل ہلا ہو مجھ کو تجھ سے تذکرہ غیب کا گلہ

ہر چند بریل شکایت ہی کیوں نہ ہو

کیسوی ہو بشر کو میسر یہ ہو حال اس کے لئے ہو خلوت خلوت کا ایک ٹال

تہا بھی ہو تو نفس سے تہی ہو فیلِ دقال ہو آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال

ہم آنجن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

ہم انقلاب سے متاثر ہوں کیا مجال ہرگز نہ لیں ہزار سبق دے جہاں کا حال

دارنگی میں تہہ و غیرت کا رکھ خیال ہنگامہ نہ بونی ہمت ہو انفصال

جہل نہ کیجئے دہرے عبرت ہی کیوں نہ ہو

انادگی جہان سے فرزا نگہ نہیں کیا رم ہو اور چیر جو دیوانگی نہیں

دُیا سے بھاگنا کوئی مردانگی نہیں وارستگی بے بیگانگی نہیں

اپنے سے کر نہ غیر سے جنت ہی کیوں نہ ہو

رکھتا ہو شاہراہِ فنا میں قدم کوئی ہوتا ہو محوِ دل سے خیالِ عدم کوئی

اس فکرِ جاں گداز سے پھٹتے ہیں ہم کوئی مستتا ہو قوتِ فرصتِ مستی کا غم کوئی

عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

کرتے پھریں قریبِ چناں و چینیں اسد جاتے ہیں اس کے کوچے سے عزرا کیلین اسد

دیکھیں گے آپ قبر ہماری وہیں اسد اُس فتنہ خوکے ڈسے اب گھٹتے نہیں اسد

اس میں تھارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

شایا تو نہیں میں نے کسی مرغ تو ازن کو
مٹھ یوں پکھتے ہیں جیسے پکھیں اپنے دشمن کو
فغان تہا ہوں میں جب دکھتا ہوں نشیمن کو
فقس میں تہں گرا چکا کھنی جانیں میرے شیون کو

مرا ہونا بڑا کیا ہے تو اسجان گلشن کو
یہ مانا غیر صورت آشنا اس کا نہ محرم ہے
مگر یہ روسیہ اس کے شمس میں تو ہر دم ہے
وجود غیر حجب تک ہے تو مجھ کو کچھ نہ کچھ غم ہے
نہ دی ہوئی تھار یا آئے دوست تہن کو
ہنیں گہ ہمدی آساں نہو یہ شک کیا کم ہے

بھرا آیا بھیرے کا دل بھی ظالم میری حالت پر
اشر ڈالانہ اس منظر نے بھی تیری طبیعت پر
ہنسی آتی ہے مجھ کو تیرے دعوائے محبت پر
نہ نکلا آنچھ سے تیری کائنات سوس جواہر پر

کیا سینے میں جس نے نہ بچ کاں شان ہون کو
کہ یا اے سکون مطلق نہیں قلب مشوش میں
جنوں کی حرکتیں قلم ہیں گہیں ہوں عاشق میں
خدا شرمائے ہاتھوں کو کہتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دہن کو
ہم اپنا غن خون نایجا آساں سمجھتے ہیں
نکلنا جانب قتل ترا آساں سمجھتے ہیں
رواں ہونا گلے پر تیغ کا آساں سمجھتے ہیں
بھی ہم قتل گہہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں

ہنیں دیکھا سنا و عجبے خوں میں سرے تو سن کو

ہاؤ ستوراہن سے سناں و تیر بٹے کا ہمیشہ مادہ اس میں ہاؤ کشیر بٹے کا
زمانہ اب اس کے لائق تو قیر بٹے کا ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بٹے کا

کیا بیتاب کاں ہیں جنبش جو ہر نے آہن کو

مجھے کیا اس سے ابر تر گھمے یا گھر کے کھل جائے دُر خوش آب پانی کی جگہ یار و زبیر سائے
نیہی تجھتا ہوں اگر کالی گھٹا چھائے خوشی کیا کھیت پر سیے اگر سو بار ابر آئے
سمجھتا ہوں کہ دھوٹے ہر بھی سے برق خرمن کو

بے ثمرت کہ اس سامنے مثالِ جاناں ہے بتوں کو جان کر سگانِ کعبہ دل سے قرباں ہر
اگر کبھی حقیقت یہاں لو وہ پکا مسلمان ہر وفا داری بشرطِ استواری اصل ایماں ہر

مئے بُرتِ خانہ میں کچھ ہیں گا رُو ہر ہن کو

پہرا یا سر بکثِ ثوقِ اجل نے چار سو مجھ کو لیے پھرتی تھی زور جاں دہی کی آرزو مجھ کو
رہی جلا دہی کی زندگی بھر جستجو مجھ کو شہادت تھی ہری قسمت میں دی تھی یہ جو مجھ کو

جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

جو ہوتا مال مٹی نیند کیونکہ خاک پر سوتا زرو گوہر کے ہوتے کس طرح ٹھنڈے جگر سوتا
متاعِ رفہ رہ جاتی تو پھر کیا بے خطر ہوتا نہ لٹاؤن کو تو کب ات کو یوں بے خبر سوتا

رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں بہن کو

مضامین کے خزینے بستے ہیں سینے میں شاعر کے
خزینہ دار و مالک ہیں سخنوران و فغان کے
گہر کی قدر کیا ہو سامنے الفاظِ نادر کے
سخن کیا کہ نہیں سکتے کہ چو یا ہوں جاہر کے

جگر کیا ہم نہیں کھٹے کہ کھو دیں جا کے معدن کو

دراقدس کا اک دربان ہو مفتوح ہیں غالب
سکندر کو ہو فخر آستانِ بوسی یہیں غالب
اسی دروازہ پر رکھتا ہو مرزا بھی ہیں غالب
مرے شاہِ سلیمان جاہ سے نسبت نہیں غالب
فریدوں و جم و کینسر و و داراب و سہمن کو

۹۹

سنگِ سمنائی سن ہوئے اس خستہ تن کے پاؤ
جانا کہاں کہ ہو گئے ایک ایک من کے پاؤ
کیا جانتا تھا وہ نہیں جھوٹے سخن کے پاؤ
دی سادگی سے جان پڑوں کو کہن کے پاؤ
ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرِ زن کے پاؤ

جی ہیں ہو چجے بت نازک بدن کے پاؤ
جیسے سجاہری پوچھے ہیں برہمن کے پاؤ
ہاتھ آئیں کس طرح مگر اس پُرفتن کے پاؤ
دھوتا ہوں میں چپے کو اس سیم تن کے پاؤ
رکھتا ہو ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤ

کہتے تھے اپنے نفس کو ہم ناسرا ہو یہ
بچتے تھے اس کے سایہ سے گویا بلا ہو یہ

اتارہ اب ہمارے لیے ہو گیا ہو یہ بھاگے تھے ہم بہت سوا بس کی سڑاوی یہ
ہو کر اسپر دابستے ہیں راہزن کے پاؤ

سارا بدن ہو فرط جراحت سے چور چور عاجز ہوں میں دواؤ دوش سے تو کیا تھو
جرح کچھ علاج تو ان کا بھی کر ضرور مریم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور
تن سے سوا نگار ہیں اس خستہ تن کے پاؤ

صد چاک دل ہو صورت صد برگ چار برگ صحرا میں ٹھکانہ کچھ بھی غم برقہ و تلبرگ
پھر ہو چلا ہو قبر میں وحشت کا ساز و برگ اللہ سے ذوق وشت نوروی کہ بد مرگ
ہلتے ہیں غو و بنجو دمرے اندر کفن کے پاؤ

گلبں کی شاخ شلخ ہوئی جام گل بکف ہیں قبریوں کی تاک میں سب سرو صفت
کس کس کی جان دیکھیے امسال ہو تلف ہو جوش گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
اڑتے ہوئے اُکھٹے ہیں مرغِ چین کے پاؤ

ناز و نراکت مٹی بھی دیکھی مٹنی نہیں رفا کے خیال سے تھکتا ہو وہ حسین
ظاہر ہیں سب تنہا کے آثار ہم نشین شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دکھتے ہیں آج اس بت ناکثان کے پاؤ

ایسا سخن شناس تو شاید نہ ہو پڑھ کر سخن ظفر کا جو لب چاٹتا نہ ہو

مترز ایقین کیوں مجھے اس قول کا نہ ہو غالب مرے کلام میں کیوں کہ مرزا نہ ہو
پتیا ہوں دھوکے خسر و شیریں سخن کے پانو

❖
(۷۰)

یہ قدم رنجہ پا کیا کوئی کم ہو ہم کو ان کا لانا ہی سر بزم کرم ہو ہم کو
خاک بوسی کا عجب شوق اتم ہو ہم کو واں پہونچکر جو غش آتا پڑی ہم ہو ہم کو

صدرہ آہنگ میں بوس قدم ہو ہم کو

سہریں سودائے چین ہو نہ ہو اے گلشن تیرے در سے ہو نہیں پاؤ اٹھانا بھی کھن
لاغری وہ ہو کہ اک بال ہیں گویا اہم تن ضعف سے نقش پڑ مور ہو طوق گردن

تیرے کپچے سے کہاں طاقت رم ہو ہم کو

آج ہمدرد زمانے میں کہاں پیدا ہو ایک کا ایک کو ہو درد تو بے جا کیا ہو
غم سے جو واسطہ میرا ہو وہی دل کا ہو دل کو میں اور مجھے دل مجھ و فار کھتا ہو

کس قدر ذوق گرفتاری ہم ہو ہم کو

دائے غفلت کہ نہیں اتنی خبر بھی اب تو سامنے کون ہو اور آپ نے دیکھا کس کو
ہم سے اب یدہ و دانستہ ہوا غماض ہو جو جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو

یہ نگاہ غلط انداز تو رسم ہو ہم کو

رہنے دین دست ہی طرح ہیں گوشہ نشین سیر گلزار سے دل اور بھی ہو گا غمگین
 لکھائیے زخم جگر پر یہ ہمیں تاب نہیں رشک ہم طرحی و درد اثر بانگ حزیں
 نالہ مرغِ چین تیغ و دم ہو ہم کو
 صاف ظاہر ہو کہ وعدہ تھا مگر صاف تھا وقت اصرار کھلا آکے نتیجہ اس کا
 ایسی قسموں کا بھروسہ ہمیں کیونکر ہوتا سر اڑانے کے جو وعدے کو بکتر چاہا
 ہنس کے بولے کہ تے سر کی قسم ہو ہم کو
 بے سبب اشکِ رواں کا تو نہیں اندھا عین جو ہر ایہ ان کا کہ ہوں آنکھیں غبار
 نہ اپورویں تو مڑگاں پہ کہاں آئے بہار دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ و لیکن ناچار
 پاس بے روفی دین اہم ہو ہم کو
 داخل شکوہ سمجھتے ہو جو خاموشی کو حال کیا ہو جو کبھی نالہ پرور دُسنو
 کیا کریں چین کسی طرح نہ جب لینے دو تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو
 ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہو ہم کو
 عقل حیران ہو کس وجہ سے چھوڑی ہلی کچھ تو ہو جس لئے طو کی ہو مسافت اتنی
 یک بیک چھوڑ دی کیوں الفتِ راحت کی لکھو آئے کا باعث نہیں کھلتا یعنی
 ہوسِ میر و تماشا سو وہ کم ہو ہم کو

جب چلے گھر سے تو مٹی دل میں پیاں اور ہی لہر بیٹھ رہنا ہیں اور ترک سفر ہو اک قہر
قصہ ہی دور کا مانع جو نہ ہو گردش ہر مقطع سلسلہ شوق نہیں ہے یہ شہر

عزم سیرِ نجف و طوافِ حرم ہو ہم کو
آپ کی طرح ہی مرزا بھی کرم کا طالب
دل کھنچا جاتا ہے اربابِ کرم کی جانب
وجہِ نقل و حرکت کیا کہوں مرزا صاحب
لئے جاتی ہے کہیں ایک توقعِ غالب
جادو رہ کششِ کافِ کرم ہو ہم کو

(۷۱)

کیا قابلِ خطاب وہی دوستیاد ہو مجھ پر نہ بھول کر بھی کرم کی نگاہ ہو
چاہو اسی کو دل میں گراں کی چاہ ہو تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

الزام رکھ کے غیر پہ کیا صاف ہو گئے گویا یہ خون ہی نہیں دسے جناب کے
فرماتے ہو کہ قتل کیا تجھ کو غیر نے بچتے نہیں مواخذہ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

جس طرح قتلِ خون میں حسین بے ہراس ہیں کیا وہ بھی یوں ہی دشمنِ جانِ اناس ہیں
کیا یوں ہی ان کے شینہ بھی قصبہ یاں ہیں کیا وہ بھی بے گنہ کش حقِ ناشناس ہیں

ماتا کہ تم بشر نہیں غور شدید و ماہ ہو

محل تمام شوق بقائیں ہی بے قرار
تکتے ہیں غیسر بھی نگہ سے بابر
یہ رشاک کس طرح نہ کرے مجھ کو دل نگار
اُبھرا ہوا نقاب ہیں ہر ان کے ایک تار

مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

رکتا نہ میکان سے تو رکھتا جگہ کی قید
آزاد کے لیے نہیں زیب جگہ کی قید
وارستگی بجا ہی تو بے جا جگہ کی قید
جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید

مسجد ہو مہر سہ ہو کوئی خانقاہ ہو

ہر چیز باغِ خلد کی ہی منتخب درست
حور و تصور و شہد و انار و غنہ درست
مشہور ہو کہ ہی وہ مقامِ طرب درست
سنتے ہیں جو بہشت کی تعریفِ سب درست

لیکن خدا کرے وہ ترا جلوہ گاہ ہو

سُونَا نہ ہو گا دیس اگر ہم نہ ہوں کہیں
ذاتی نہ کوئی گھر ہی نہ گھر کی کہیں زمین
مرزا و جو شاہ ہی رونقِ فزا سے دیں
غالب ہی گرنے ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں

دُنیا ہو یا رب اور مرا بادشاہ ہو

تجسّسِ ضبط سے جب کام لو تو کیونکر ہو
تجسّسِ نہ فرصتِ تدبیر دو تو کیونکر ہو

اب اس سے حضرت نال بات ہو تو کیونکر ہو
کئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو

کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو

حصولِ صلت و دیدار تو ہی امرِ محال
فقط ہی باعثِ تسکین تصورِ مثال

امید و یاس کو سمجھا ہو آرزو کا مال
ہماری ذہن میں اس فکر کا ہونا مصل

کہ گرنے ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو

کبھی خیال کہ اظہارِ مدعا کیجے
کبھی یہ وہم کہ ہرگز نہ یہ خطا کیجے

کہاں تک اپنے مقاصد کا التوا کیجے
ادب ہی اور یہی کشمکش تو کیا کیجے

جیسا ہی اور یہی گو مگو تو کیونکر ہو

مختارِ ادل ہو کہ رشک و حسد کا گنجینہ
بھرا ہی رہتا ہی بغض و نفاق سے سینہ

یہاں تک اپنے مقابل سے ہی تمہیں کینہ
الچھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ

جو تم سے شہر میں ہوں ایک و تو کیونکر ہو

وہ رشک مہرِ رات بھر تو جلوہ نما
منود ہونے نہ پائی سحر کہ چل نکلا

مری نگاہ میں اندھیر کیوں نہ چھا جاتا
جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا

وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

لیا جو فرطِ عقیدت سے ہم نے بوسہ پا
تو تم نے غایتِ نخوت سے سر کو ٹھکرایا

نہ شرم کچھ تھیں بندوں کی ہر نہ خوف خدا تھیں کہو کہ گزارہ منہم پرستوں کا
بتوں کی ہو جو بھاری سی ہو تو کیونکر ہو

کہیں حضرت دل خاک وہ بھاری قدر ہوئی نہ کچھ بھی ہماری سوائے خواری قدر
گنا چکے ہوں ہاں ہم جب اپنی ساری قدر ہمیں پھر ان سے اُمید اور انھیں ہماری قدر
ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیونکر ہو

ہیں تو آجہ قرآن تھا جو مضمون تھا بجا ہی ہم نے جو پڑھ کر کہا ہو آ متا
وفا ضرور کریں گے وہ وعدہ فردا غلط نہ تھا ہمیں خط پر گمان سلی کا
نہ مانے دیئے دیدار جو تو کیونکر ہو

سکوں سے کام نہ لوں غطراب ہیں تو قصود مگر ہوں ضبط میں اس اضطراب سے مغضوب
زمانہ بھر میں نہ مرزا سا پائے گا صبور مجھے جنوں نہیں غالب نے بقول حضو
فراق یا میں تسکین ہو تو کیونکر ہو

(۷۳)

جو تاب ضبط غم ہو شاک نکھوں سے رواں کہیں کسی سے دل کی بیٹائی کا در پر وہ بیاں کہیں ہو
جو بود و آشتا تو شکوہ در و نہاں کیوں ہو کسی کو دے کئے دل کوئی نواسخ فنا کہیں ہو
نہ ہو جب دل ہی پہاوی تہ چہرہ نہیں ماکیں ہو

وہ ہر دم سلسلہ توڑیں تو تم کب تک سے جو رہیں
 رہیں ہم محو نظارہ کہاں تک جیت نہ توڑیں
 خنداہ ہیں تو ہوں تم رشتہ تمکین کو کیوں توڑیں
 وہ اپنی خونہ چھوڑ بیٹھے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
 سب سے بیشک کیا چھپیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہیں

چھپا رکھا تھا ہم نے اپنے دل میں ازا الفت کو
 نہ کی اُٹ صبر و استقلال سے جھیل اہرافت کو
 خیر کیا تھی ہمارے در پہ پہنائی کی خلعت کو
 کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
 نہ لائے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہیں

نہ کرنے دے ہمیں وحشت میں بچہ اپنی چو کھٹ کا
 پہاڑوں تاک کے پکار بہری سو داسے سراپنا
 ہیں ہر کچھ نہ کچھ تو چارہ جو شش جنوں کرنا
 وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
 تو پھر اسی سنگ ل تیرا ہی سنگ ستاں کیوں ہیں

گل و سرور یا حین کا مفصل ذکر کر ہم دم
 کڑا دل کر کے سب حالات مجھ سے کہہ کر ہم دم
 یہ میرے پوچھنے پر تو نے تھا ما کیوں جگر ہم دم
 نفس میں مجھ سے رو دا دین کہتے نہ ڈر ہم دم

گری ہو جس پہ کل سبلی وہ میرا آشیانہ کیوں ہیں
 نظربندی کیسی ہی مہا کیا ہو سمجھاؤ
 طبیعت کو عجب کھن ہو اس گٹھی کو سلجھاؤ
 یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں لیکن پہنلاؤ
 اگر پرہیز نہیں مد نظر تو سامنے آؤ
 اگر دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہیں

کچھ ایسا ہی ہر انسان کی طبیعت کا تھا خدا ہی کہ یہ اپنی خطا کو غیر کے سہم ڈال دیتا ہی
 ہیں ٹھہرے گنہگاروں میں یہ انصاف اچھا ہی غلط ہی جہنم کا شکوہ دیکھو جہم کس کا ہی
 نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

یہ رخ کا آئینہ دنیا کی حیرانی کو کیا کم ہی پریشیاں نصفِ عالم کی پریشیاں کو کیا کم ہی
 نگاہ تیز جان بازوں کی قیابی کو کیا کم ہی یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہی
 ہوئے تم وہ دست جس کے ٹخن اس کا آسمان کیوں ہو

عنایت تم نے کی جس پہاڑی کا ناک میں دم ہی ہوئے غمخوار جس غم کیں کے تم وہ طعنہ غم ہی
 تھاری مہربانی میں بھی جلا دی کا عالم ہی یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہی
 ہوئے تم وہ دست جس کے ٹخن اس کا آسمان کیوں ہو

مہبت رنک کی ظلم و دن رات بہتے ہیں تھاری مہربانی سے پریشیاں حال رہتے ہیں
 امنی سوچی ہو تم کو آشکباراں نکلوں سے بہتے ہیں یہی ہی آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
 عذو کے ہو لیجئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

ابھی آئے ابھی جاتے ہو جاناکس کو کہتے ہیں یہ آنا ہی تمھارا تو نہ آنا کس کو کہتے ہیں
 کرم بکھا ہی اس کو تو جلا نا کس کو کہتے ہیں یہی ہی آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
 عذو کے ہو لیجئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

جو کہتا تھا بڑی اور غیر کے گھر محفل آرائی تو ہنس کر مالتے تھے مجھ کو ٹھہرتے تھے سوائی
 لگے اب بحث بھی کرنے جتا کر اپنی دانائی کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں سوائی
 بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہنا کہ ہاں کیوں ہو
 چلا جادو نہ جب قہر نہ اس کے برو غالب کرے گی کیا اندر پھر خاک تیری گفتگو غالب
 سر بزم اس سے ہے فائدہ کیوں بدو غالب نکالا چاہتا اور کام کیا طعنوں سے تو غالب
 ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

روایت (۱)

(۷۴) سب ملتوں کے ساتھ مراعات چاہیے آپس میں اتحاد ہو وہ بات چاہیے
 رندی و زراہی میں مساوات چاہیے مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے
 بھوں پاس آنکھ قبلہ حاجات چاہیے
 رخ کے قریب زلف کی ظلمات چاہیے دن سے ملی جلی ہوئی یہ رات چاہیے
 ہر شو کا اس کی منہری سے اثبات چاہیے مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے
 بھوں پاس آنکھ قبلہ حاجات چاہیے
 مصروف آپ مشوق بھائی میں تھے عمر بھر مطلق نہ تھی کسی دل مظلوم کی خبر

بیٹھے ہیں اب تو ہاتھوں سے تھامے ہوئے جبکہ عاشق بٹسے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر

آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

جرات تو دیکھ اس دل کو تاہ دست کی اس نامراد نے کبھی ہمت نہ پست کی

اب غم ہو نیست کا نہ خوشی اس کو ہست کی دے داد ای فلک دل صہرت پرست کی

ہاں کچھ نہ کچھ تلافی مکافات چاہیے

صورت کو ان کی روح جب لب پنی ترس گئی نہ بیر کار گر نہ ہوئی کوئی دید کی

اس سے زیادہ شکل رسائی کوئی نہ تھی سیکھے ہیں مہر خوں کے لیئے ہم مصوری

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

یہ لوٹتا ہو ثروت و اقبال و جاد کو کرتا ہوں غافل اس سے دل عیش خواہ کو

سمجھا نہیں ثواب کبھی اس گناہ کو مے سے غرض نشاط ہو کس رو سیاہ کو

اک گو نہ بیخودی نگھے دل ات چاہیے

بیکار شہیں ہم وہ محرک اگر نہ ہو ق مرزا یہ راز وہ ہو جو پاتے ہیں از جو

اسی کا سب ظہور عدم سے ہو جان لو نشو و نما ہو اصل سے غالب فروع کو

قاموشی ہی سے نکلے ہو جو بات چاہیے

ہر لغ کی ہو لغ جہاں میں فصاحت جدا ہر گستاخ نے پائی ہو آب ہوا جدا

ہر گل کی بوجہ ایڑوں اور اوجہ راہی رنگ لالہ و گل و فسرین بوجہ اوجہ

ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے

سر میں اگر خودی ہو نہ لے نام بے خودی خود ہیں ہی تو نہ کر ہو میں خام بے خودی

کر جہدہ شکر کا جو ملے جام بے خودی سر پائے خم پہ چاہیئے ہنگام بے خودی

رو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہیئے

قائم ہو ایک حال پہ کس طرح آدمی کرنی ہو راہ طواسے جذب و سلوک کی

ہر فعل کی ہو حالت موجودہ مقتضی سر پائے خم پہ چاہیئے ہنگام بے خودی

رو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہیئے

خالی نہ ہو حقیقت عرفاں سے کوئی بات انسان حرف حرف سے پیدا کرے نکات

نظارہ صفات سے ہو جائے محو ذات یعنی بحسب گردش پہیمانہ صفات

عارف ہمیشہ مستی و ذات چاہیئے

(۷۵)

ذرا سی جان تن میں ہو فدا کرنے کو ہوں وہ بھی رگوں میں جو لہو تھا ہی سرشک لالہ گوں وہ بھی

جگر رکھتا تھا لیکن اب ہی با حال ہوں وہ بھی بساط عجز میں تھا ایک لک قطرہ خون وہ بھی

سورہ تھا ہی بانداز چکین سرنگوں وہ بھی



یہ کیا کم مہربانی ہو کہ ٹالا بات کو اس نے
خدا نا خواستہ دل سے نہ وہ روٹھا نہ ہم کوٹھے
وگر نہ مفت میں لینے کے دینے پر گئے ہوتے
ہے اس شوخ سے آزر وہ ہم چندے تکلف سے

تکلف پر طرف تھا ایک نہ از جنوں وہ بھی

نکالے کو نسے ارمان دل آخر مقدر نے
طبیعت کو ذرا ابھھاؤ سا ہی اس قصور سے
کہ ہم ہوں منتظر پیاب اجل کی آمد آمد کے
خیال مرگ کیا تسکین دل آزر وہ کو بخشے

مرے دام تمنائیں ہو اک حیدر زبون وہ بھی

مشرکِ نوح بنانے سے تو تھا یہ مدعا ہمد
مگر اس سے تو سوئے قلب نہ دنا ہو گیا ہمد
کہ دل کی آگ اس پانی سے کم ہو گی فراہم
نہ کہ تماشائے نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمد

کہ ہو گا باعثِ افزائشِ دردوں وہ بھی

بگاہی زور بازو پر جہاں تک اپنے اتراؤ
بہر قل یا وہ اس کے جوہر کو نہ چمکاؤ
کہ وہ تعریف اپنی سرخرو اس کو بٹھہراؤ
نہ اتنا بے ریش تیغ بھاپہ ناز و مہراؤ

مرے دریائے مینابی میں ہو اک موجِ خوں وہ بھی

نوح کیا سوال اس سے اگر اکے ور کا کیجے
سو خالی دکھاتا ہی جو عرضِ مدعا کیجے
مناسب ہو کہ اشکِ حسرت واراں پیا کیجے
مخِ عشرت کی خواہش ساقی گردوں کیا کیجے

لیجے بیٹھا ہو اک ڈوچار جام و از گوٹھ بھی

آئینہ و بیم میں مرزا ہوں کہ سے سرگرداں نہیں آئے ہیں تائیں سے ملنے کا کوئی سااں
 کسی صورت میں شکل دیکھتے ہوئی بھی آساں مے دل میں ہو عاشق وصل و شکوہ ہواں
 خدا وہ دن کہے جو اس میں یہ بھی کہوں وہ بھی

نکالے گی نہ چکر سے ہمیں گردش زمانے کی یہ گردش جس قدر بھی ہو سزا ہو دل لگانے کی
 نہیں پر اب کوئی صورت نہیں آرم پانے کی غم دنیا سے گریا پی بھی فرصت سرٹھانے کی
 فلک کا دیکھنا تقریب تیر سے یاد آنے کی

اُسے اپنی تپش کا حال کچھ لکھ تو دیا یارب مگر خط کو مرے وہ پڑھ بھی لے اُمید کیا یارب
 جلا ہی دے کہ سو زل تو ظاہر ہو یا یارب کھلے گا کس طرح مضمون مے مکتوب کا یارب
 قسم کھائی ہو اُس کا فونے کا فذ کے جلانے کی

اگر آہ آتشبار نالہ آتش افشاں ہو نہیں چارہ کہ عالم آشکارا راز پنہاں ہو
 دباؤں یہ دہتی آگ کیونکر عقل حیراں ہو لپٹنا پر نیاں میں شعلہ آتش کا آساں ہو
 دے شکل ہو حکمت دل میں سوز غم چھپانے کی

کوئی بیکار اُن کا جانب گزار جانا تھا گلستاں کو مگر اس رنگ سے مقل بنا تھا
 گلوں کو بھی تو اپنے زخم خور دوں میں لانا تھا انھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھنا تھا

اُٹھتے سیر گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

مقدہ ہی میں تھا کچھ تجھ سے فسوں ساز پر مرنا بد انجامی تھی اپنی خوبی آغانہ پر مرنا
مناسب تو نہ تھا اس ظاہری انداز پر مرنا ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا
ترا آئنا نہ تھا ظالم مگر ٹہپ جانے کی

غمِ دوراں کے شکووں سے جھپٹ کھل گئی اپنی طبیعت کی وہ قوت اور وہ جولانی غلط نگلی
حسینوں کی اُٹھائے بات کس کو تاب ہو اتنی لکھ کو بوجہ حادث کا تحمل کر نہیں سکتی
مری طاقت کہ ضامن تھی تبوں کے نالٹھانے کی

زمانے میں نہیں سچی محبت کا نشان غالب جھپٹتے ہیں غلصہ دست لب ہر کہاں غالب
بیانِ حال میں صراحت مرزا کی زباں غالب کہوں کیا خوبی اوضلاع ہمارے زماں غالب
بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی بھی بارہائی کی

۶۶

نڈاں سے بھی زیادہ ہر ایہ مکان ہو اک قید میں پڑے ہیں مصیبت میں جان ہو
یہاں نقطہ خیال زمیں کا نشان ہو کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہو
جس میں کہ ایک ہفتیہ مور آسمان ہو

سیارے گھومتے ہیں فلک پر ترسے لیے اسباب اور کچھ بھی نہیں ان کی سیر کے

چکر دیئے ہیں چرخ کو تیری تلاش نے
ہر کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے

پر تو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہو

بیچارہ دل حوادثِ دنیا سے ہی بہ تنگ
ہو کیوں نہ چور چور کہ کھایا ہی سخت سنگ

اس سنگ نے کچھ ہم سے ہی میری عقل دنگ
حالانکہ ہی سیلی خار اسے لالہ رنگ

غافل کو میرے شیشے پہ محو کا گمان ہو

اپنا تو دل تھا آگ سے گویا بھرا ہوا
کہ تا قیام بھڑوہ اس آتش کدے میں کہا

خالی تھا سوزِ عشق سے ہاں دل قریب کا
کی اس نے گرم سینہ اہل ہوس میں جا

آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہو

کچھ بات جھک کے کان میں کہنا سہا نہ تھا
آہر کوئی سبب بھی تھا دامن کی آڑ کا

اب تم ڈھٹائی سے تو نہ جھٹلاؤ بر ملا
کیا خوب تم نے غیر کو بوس نہیں دیا

بس چپ ہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہو

آنکھیں لگی ہیں جانبِ در انتظار میں
تصویرِ ساخوش ہی شوقِ نگار میں

آیا ہو گشتِ کر کے ابھی خار زار میں
بیٹھا ہی ہو کہ سایہ دیوارِ یار میں

فرماں والے کشورِ ہندوستان ہو

غم نے لہو پلانے کا اچھا صلا دیا
اک داغِ جاں گدازِ جگر پر لگا دیا

اس داغ نے تمام جگر کو حبلہ دیا ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کیس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہو

اس پر چڑھتے نہیں وہ قہر کی نظر ظاہر ہوا نہیں ہی بھروسہ رقیب پر
مدرن اکا بخت بر سر یاری ہی سربہر ہو جائے اعتماد و فاداری اس قدر
غالب ہم اس میں غش ہیں کہ نامہربان ہو

(۷۸)

یا تو میں کرتا تھا غم سے آہ و فاداری ہائے مائے اور نہ کہ تانا تہا کچھ غم گساری ہائے مائے
یادم آخر جانی مشروط یاری ہائے مائے درد سے میرے ہو تھکونے فزاداری ہائے مائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شکاری ہائے مائے

دل کا دل ہی میں ہا کچھ بھی نہ نکلا حوصلہ پست ثابت ہو گیا الفت میں تیرا حوصلہ
منہ چھپا یا مجھ سے بس اتنا ہی تھا کیا حوصلہ تیرے دل میں گر نہ تھا آشوب غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غم گساری ہا مائے

عہد تجھ سے زندگی بھر کے لیے تو لیا کیا خبر تھی زندگی بھلے گی تیری سہ و فا
مانے آیا مری تفتدیر کا لکھا ہوا عمر بھر کا تو نے پیمان وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں تھی پاداری ہائے مائے

اٹھ چکے ہیں جبکہ سامانِ بھٹائے زندگی ہو پھر اس سے کیا نئی کیا دل کو بھائے زندگی
 کون مر کر جیسے چوٹھے میں جاے زندگی نہ ہر گزتی ہو مجھے آبِ دہو اسے زندگی
 یعنی تجھے تھی اسے ناساز گاری ہائے

نازکی سے یاد کیا تھا تر از رخِ پھول سا صورتِ برگِ خزاں یا اب ہو مر جھایا ہوا
 کس ہونے کو گلِ تر تجھ کو پترِ مرگ کیا گلِ فشانِ ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا
 خاک پر ہوتی ہی تیری لالہ کاری ہائے

تجھ کو رہنا تھا ہائے دیدہ مناک میں یا مناسب تھا بنانا گھرِ دلِ صد چاک میں
 خوشبختِ داری سے تیری آگیا دمِ ناک میں شرمِ رسوائی سے جا چھینا نقابِ خاک میں
 ختم ہو الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے

کامیابی اب کہاں نہ بات ہی او دل گئی وہ بہارِ عاشقی وہ رونقِ محفل گئی
 عہدِ لینے کی وہ ساری سببِ لا حاصل گئی خاک میں ناموس پہبانِ محبت مل گئی
 اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے

منہ چھپایا خاک میں کیوں آخر آیا کیا خیال کیا کسی پر ہو گیا ظاہر ترے دل کا خیال
 جیکر رسوائی کا تھا ظاہر منہ تجھے اتنا خیال کیوں مری غنوارگی کا تجھ کو ۱ یا تھا خیال
 دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے

ادچھے اوچھے وار جب اس نے لگا سے بار بار
 دکھ گئی نازک کلائی اور بار بار ویشل ہوا
 پھر بھلا کس طرح نکلے اپنے دل کا مدعا
 ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
 دل پر اک لگنے نہ پایا زخم کاری ہائے

کر دیا جو بے طرح رنج و الم نے خستہ حال
 موت کا آنا کھٹن ہی اور جینا ہی ویاں
 صبح کرنا شام کا فرقت زدہ کو ہر حال
 کس طرح کاٹے کوئی شبہائے تابہ بزرگال
 ہو نظر خو کر و اختر شماری ہائے

کون جواب سننے والا کس سے کہیئے اپنا مال
 دور کیجئے کس کی صورت دیکھ کر دل کا مال
 کوئی دیکھے تو مری حیران نصیبی کا کمال
 گوش محروم پیغام چشم محسوس و خمال
 ایک نسل نس پر یہ نا اُمید داری ہائے

نام کو مشہور دنیا میں ہوا بے نام و ننگ
 حال مرزا دیکھ کر ال جہاں ہونے ہیں دنگ
 دل میں باقی تھی ابھی صحرا فردی کی اُننگ
 عشق نے پکڑا نہ تھا غالب بھی حشت کلا رنگ
 رہ گیا تھا دل میں کچھ ذوق خواری ہائے

(۷۹)

کیوں قید زندگی سے دل اتنا اُداس ہے
 جیسا بس سے چھوٹنا ہے تو پھر کیا ہر اس ہے
 کہتے ہیں جس کو موت وہ ہر وقت با پس ہے
 گشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے

تسکیں کو دے تو یہ کہ مئے کی آس ہو

پھرتا ہی رات دن یہ پریشاں ادھر ادھر
اس کو نہیں قیام کبھی ایک حال پر
وحشتِ نوح کے حال سے اور غفلت اس قدر
لیتا نہیں مرے دل آوارہ کی خبر

اب تک وہ جانتا ہی کہ میرے ہی پاس ہو

جہات کو دکھائی نہ اس درد کی جھلک
محروم اس مرنے سے رہے سر بسر ملک
ہوں اس عطائے خاص سے منتِ کفر تک
کیجے بیان سرور تب غم کہاں تلک

ہر ہو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہو

ہوتا ہی صحبتوں ہی سے انساں بُرا بھلا
صحبت ملی بھی اُس کو مگر کیا اثر کیا
ہونا تھا آشنائی دل سے حق آشنا
ہو وہ غرورِ حسن سے بیگانہ وفا

ہر چند اس کے پاس دلِ حق شناس ہو

سودائی ہیں جن کو یہ صہبائے اجتناب
انساں کو چاہیے کہ پیئے جائے بے حساب
کرتا ہو خوب جذبِ طوبات آفتاب
پی جس قدر طے شبِ مہتاب میں شراب

اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہو

مہرِ زرا پھر ہو دشت میں چاروں طرف آس
روقتِ فزا و ہاں ہو درختوں کی صفِ آس
دُور نہیں ہی باعثِ قدرِ صدقِ آس
ہر اک مکان کو ہو مکیں سے شرفِ آس

مجنوں جو مر گیا ہی تو جگمگ آداس ہی

(۸۰)

میری سخنوری پہ عبث قیل و قال ہو مطلب کی میرے پاسے کوئی کیا مجال ہو
کہتا ہوں سیکھا اور زبان میری لال ہو گر خامشی سے فائدہ اخفاے حال ہو
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی مجال ہو

اجاب چپ ہیں سن کے دل ار کا گلہ دروڑ باں ہی چرخِ ستم کا رکا گلہ
سننا ہی کون یا رِ جنا کا رکا گلہ کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ
دل فرو جمع و خروچ زبان ہاے لال ہو

دارفہ دل کو کب سے ہو ارمان دید کا آنکھیں حری ہوں کاش کبھی جلوہ آشنا
مشکل تجھے نہیں کہ حجابات دے اٹھا کس پہرے میں ہی آئینہ پر دار کو خدا
رحمت کہ عذر خواہ لب بے سوال ہو

پروا اُسے کسی کی ہو کیا وہ تو ہو غنی پر خاش ہو کسی سے اُسے یہ ہو بد ظنی
روکے ہوئے حجاب ہی یا پاک دامنی ہی ہو خدا نخواستہ وہ اور دشمنی
ای شوقِ مفصل یہ تجھے کیا خیال ہو

خوشبوئے مصطفیٰ سے معطر ہی یہ مکان جس پر رو دیکھتے رہتے ہیں نسِ فغان

اس کے طواف میں ہو شب و روز آسمان مشکیں لباس کعبہ علی کے قدم سے جان

نافِ زمین ہو نہ کہ نافِ عزال ہو

گردش کا میری اور ہی کچھ رنگِ تنگ ہو گردوں بھی دیکھ کر مری حالت کو تنگ ہو
جوشِ جنوں میں یہ تک و دو کی اُمنگ ہو وحشت پہ میری عرصہ آفاق تنگ ہو

دریا زمین کو عسوقِ انفسال ہو

مہرِ ناز کی طرح نفیس کو سمجھائیو اسد اس خواب پر نہ بھول کر اترائیو اسد
دھوکہ نہ دواہم سے کہیں کھائیو اسد ہستی کے مست فریب میں آجائیو اسد

عالم تمام حلقہٴ دایم خیال ہو

(۸۱)

غیر سے تجھ کو محبت ہی سہی تجھ سے اغیار کو الفت ہی سہی

مجھ پر اغیار کو سبقت ہی سہی عشقِ مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی

میری وحشت تری شہرت ہی سہی

کونسی ایسی خطا کی ہم نے جس سے لائق نہ ہے محفل کے

بے سلسلہ کچھ تو لگا سے رکھئے قطع کیجئے نہ نساقِ ہم سے

کچھ نہیں ہی تو عداوت ہی سہی

ہو کہاں کی یہ بھلا دانا ئی کیوں ہو مرغوب تھیں تنہائی
 نہ جنونی ہوں نہ میں سودائی میرے ہونے میں ہو کیا بوائی
 اور وہ مجلس نہیں خلوت ہی ہے

عالم کن کو دستاں سمجھو اس سے ملتا ہے سبق انسان کو
 بھول کر غیر کا احسان نہ لو اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
 آگہی گر نہیں غفلت ہی ہے

ہو کہاں مثل شر اس کو قیام گرم رفتار یہ رہتی ہو صدام
 نہ توقف اور نہ دم بھر آرام عمر ہر چند کہ ہو برق خرام
 دل کے غم کرنے کی فرصت ہی ہے

رات دن عشق کا دم بھرتے ہیں رنج و ایزد اسے نہیں ڈرتے ہیں
 اُن پہ مرنے کے لیے مرتے ہیں ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں
 نہ سہی عشق مصیبت ہی ہے

شاوہیں دور میں تیرے اجلاں اور ناشاد و حزیں ہیں اشرف
 اس قدر دین نہ ہو گی اسراف کچھ تو دے اور فلک نا انصاف
 آہ و فریاد کی فرصت ہی ہے

اجڑ میں غم کو ترے پالیں گے داد بھی اس کی کبھی پالیں گے
جس طرح ہو گا یہ دن ٹالیں گے ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے

نئے نیازی تری عادت ہی سہی

کیا عجب ہو کہ وہ تھراے اسد کچھ کرے رحم ترس کھائے اسد
یہی ہرزا کی بھی ہوائے اسد یار سے چھپڑ چلی جائے اسد

گر نہیں مل تو صبرت ہی سہی

(۸۲)

آواز سے رات غیر سحر تک کسائیے دل کھول کر مذاق برابر کھائیے
پاک خموش مجھ کو جو چاہا کھائیے اُس یزیم میں مجھے نہیں بنتی چھائیے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہو ائیے

بن کر فقیر میں ترے در پر اگر گیا دربان مجھ کو دیکھ کے غصے میں بھر گیا
چپ چاپ ہیں جو تیری گلی سے گزر گیا دل ہی تو ہی سیاست درباں سے ڈر گیا
میں درجاؤں در سے ترے بے صدا کیے

آئی ہے پھر چن میں بہا بر خستہ پی اس مہمان کی مجھے خاطر عزیزا
قصہ ہوا ہونہر ریائی کا آج طو کرتا پھروں ہوں خرقة و سجادہ بہن ڈ

مَدّت ہوئی ہی دعوتِ آب و ہوا کیے

ہو دستیاب آدمی کو گرچہ عمرِ خضر لاکھوں ہی پائیں ایک نہ دو گرچہ عمرِ خضر

وہاں کبھی نہ لے اُسے دو گرچہ عمرِ خضر بے صرفہ ہی گزرتی ہی ہو گرچہ عمرِ خضر

حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے

ہٹا این اس کو سمجھتے رہے فہم سب مال اس نے ہضم کیے بے ہوش ہم

اب وہ جواہرات کہیں ہیں نہ زرد نہ سیم مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ ای لیئم

تو نے وہ گنجائے گراں مایہ کیا کیے

دن رات ہی ہماری بُرائی کی جستجو پھرتے ہیں مارے مارے تجسّس میں کو بکو

ہٹان اٹھائے تھے ہیں ہنگامِ گشتگو کس روز ہمیشہ نہ تراشا کیے حدو

کس دن ہمارے سر پہ نہ آ رہے چلا کیے

خرپڑی کہاں سے اُسے ہمیشہ یہ خو ہرگز کسی حسین کو زیبا نہیں یہ خو

لٹاٹھا پیشتر تو نہ وہ مہمبیں یہ خو صحبت میں غیر کی نہ پُری ہو کہیں یہ خو

دینے لگا ہی بوسے بغیر التجا کیے

ہوں ہیں یوں تو اور بھی دنیا میں زینیں لیکن نہیں ہر سادہ دل ایسا کوئی حسین

ہمد میں تو اس کو کہوں گا نہ ہم نشین صد کی ہی اور بات مگر غو بُری نہیں

بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے

سوزِ امانے عرضِ حال کا پایا جواب کیا لوگے تم اپنی بات کا اچھا جواب کیا
چاہو نہ تم جواب تو اس کا جواب کیا غالب تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے

(۸۳)

وحشتِ اشرفیاتِ بہانِ خراب ہے مثلِ شرر قیام کی یہاں کس کو تاب ہے
اس ہ گزریں جو ہو وہ پادر کا ہے رفتارِ عمر قطع رہ اضطراب ہے

اس سال کے حساب کو برقِ آفتاب ہے

ہیں نرم مویں تنگ نرا لے بہار کے ہر جامِ پیرِ شراب گل تر ہو دیکھ لے
مُرخِ چین کا ہے بیڑی پر گماں مجھے مینا سے موی سر و نشاطِ بہار سے

بالِ تدر و جلوہ موجِ شراب ہے

تبادلِ کوشوقِ اک نغمہِ التفات کا معلوم تھا نہ حال اُن آنکھوں کی گھات کا
طو ایک تیر میں ہوا قصہ حیات کا زخمی ہوا ہی پاستہ پائے ثبات کا

نہ بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے

دہرِ خراب ہیں ہی خرابات کی صفت مرنے ہو میکشوں کو تو مستوں کو تہنیت

جاگیر یہ وہ ہے کہ اٹھیں کوہی تو لیست جاداد یادہ نوشی زنداں ہو پیش بہت

خافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

نارِ نظر کو کرتی ہے اس کی چمک فنا اس پر نگاہ ڈالے کسی کو ہوتا کیا

اساں نہیں ہے مہرِ درختاں کو دیکھنا نظارہ کیا حریف ہو اس برقی حسن کا

جوشِ بہارِ جلوے کو جس کے نقاب ہے

پہلے ہی کچھ تو شوق میں تھا حالِ دل نہیں دیدار سے تو اور بھی اس کا بڑھا جنوں

اب اور ہی کچھ اس کو تمنا ہے کیا کہوں میں نامہِ ادا دل کی تسلی کو کیا کروں

مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کا میاں ہے

جھڑتے ہیں پھول یوں تو لبِ راز دار سے ہنسنے لگیں گل مرے لیے کیا کم ہیں خاں سے

یہ اور بات چیت کرے اس نکار سے گزرا اسدِ مسرتِ پینا م یار سے

قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

۸۴

وہ اگر میری تمنا پر ترس کھا جائے ہے سامنے آنکھوں کے برقی حسن چمکا جائے ہے

خود بخود آنکھوں کے آگے خیرگی چھا جائے ہے دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پر شک جائے ہے

میں اُسے دیکھوں بھلا کب ٹھہرے دیکھا جائے ہے

لا انیں سکتی ہو ہرگز تابِ آتش کوئی شہ
ہوتے ہی دو آتشہ تیزاب ہو جاتی ہو
سوز پہاں بڑھ کے قصہ خود بخود کرے گا
ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گوندیشے میں ہو

آگینہ تند ہی صہبا سے پگھلا جائے ہو

تھا مناسب کوئی تدبیر ایسی دشمن کی کمرے
گفتگو میں تانا دہ ہر بار بے باکی کرے
کیوں نہ دل اس کا بڑھے جب دگرزاتی کمرے
غیر کو کیونکر وہ یارب منع گستاخی کمرے

گر حیا بھی اس کو آتی ہو تو مٹا جائے ہو

صبر کب تک کیجئے اور کب تک غم کھائیے
تا بکی حالِ دل پر درد سے دکھ پائیے
دل کو ضبطِ نالہ کی تدبیر کیا بتلائے
شوق کو یہ لبت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہو

کیا مسرت خیر ہو ای دوسرت تیری بزمگاہ
تو جہاں ہو پھر وہاں غم با نہیں سکتا ہو
واہ ہوتی ہو وہاں جا کر اگر کرتا ہوں آہ
دو چشم بد تری بزمِ طرب سے واہ واہ
نغمہ ہو جاتا ہو داں گر نالہ میرا جائے ہو

ہم یہ کب کہتے ہیں ظاہر ہو کوئی اندازِ عشق
یا ہمیں دنیا کہے وارفہ و جانبِ عشق
کیا کریں جب بدحوای اپنی ہو غمازِ عشق
گرچہ ہو طرزِ تغافل پر وہ دایرِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہو

دشمنوں کے حال پر وہ آج کل ہو مہرباں کچھ ہماری بھی سنے اتنی اسے فرصت کہاں
وہ ہو اور آٹھوں پہرا غبار کی دلدریاں اس کی بزم آریاں سنکر دلِ بنجور یہاں
مثل نقشِ مدعا سے غیب پر پٹھا جائے ہو

اک تو قدرت ہی نے اس کو ناز نہیں پیدا کیا اور اس میں تھا ہی کیا ناز و نزاکت کے سوا
اور سونے پر مسہا کا عشق کا انا ہوا ہو کے عاشق وہ پری سرخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہی جتنا کہ اڑتا جائے ہو

دیکھیے تصویر کی آنکھیں بھی افسوں ساز ہیں اور عشقِ لب میں ظاہر جو ہر اعجاز میں
اللہ اللہ ایک کھینچنے میں بھی سوانا ساز ہیں نقش کو اس کے مصوٰر پر بھی کیا کیا ناز میں
کھینچتا ہی جس قدر اتنا ہی کھینچتا جائے ہو

رکتے ہیں قزاق سے اجابِ وطنِ انصاف دیکھیے اس سبکی کی بھی کہیں ہوتی ہو حد
پیرہنِ لائی ہو کیا رنگِ اذلہ الصفا سایہ میرا مجھ سے مثل دو دو بھاگے ہو آمد
پاس مجھ آتشِ بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہو

(۸۵)

جان شادی کی تننا میرے آبِ گل میں ہو کچھ تننا اور ہی لیکن دلِ بسمل میں ہو
کیا کروں تدبیرِ ارب جانِ اک مثل میں ہو سادگی پر اس کی مرجانے کی سرشار میں ہو

بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کف قاتل میں ہو

دل سے دل کو راہ ہو مجھ کو یقیں ہرگز نہ تھا گفتگو کی آج کچھ اس نے تو عقدہ کھل گیا

کوئی میرے جی سے پوچھے اس کی باتوں کا مزا دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میسے دل میں ہو

قطع مجھ سے کر چکے وہ دوستی کا سلسلہ اُن کی بزمِ عیش کے قابل کہاں میں غمزدہ

پھر بھی ہر دم کچھ نہ کچھ رہتا ہی میرا تذکرہ گرچہ ہو کس کس بُرائی سے ولے با اینہم

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہو کہ اس غفل میں ہو

تو اگر چھا جائے گی ہم پر مصیبت ٹھائے گی جب نہ ہوگا شغل دل پر اک قیامت آئے گی

زندگانی بے مزہ کر کے مزا کیا پائے گی بس ہجومِ نا اُمیدی خاک میں مل جائے گی

یہ جو اک لذت ہماری سچی بے حاصل میں ہو

ہم تو کرتے سر کے بل چل کر رہ مقصود طو بیٹھنے کا ضعف کرتا ہو تقاضا پڑی بہ پڑی

پاؤں نے پکڑی زمینیں بنجیر پا ہو کوئی شو رنج رہ کیوں کھینچئے واما ندگی کو عشق ہو

اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہو

دل قیہ وسیع کا عیش کی منزل سہی ہم نے لومانا کہ ہم جلنے ہی کے قابل ہی

سوزِ غم رگہائے تن میں خون کے شال سہی جلوہ زار آتش و دُرخ ہمارا دل سہی

فتنہ شور قیامت کس کے ہونے میں ہو

تھا تو نے نزدیک منزلِ قابلِ قہر و عتاب پھر کیا اک بے گنہ کو کیوں گرفتارِ عذاب
اس مصیبتِ کمال اس کو کہ حالتِ ہجرِ خراب ہو دلِ شوریں غالبِ طلسمِ بیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہو

خالی نہ تیری چشمِ کرم کی نظر گئی چمکی مثالِ برقِ ادھر آئی ادھر گئی
پینے ہی تک نہ صرف یہ آکر گزر گئی دل سے تری بجھا ہر گرتاک اُتر گئی
دونوں کو اک دایمِ رضا مند کر گئی

وہ دورِ جامِ محو نہ وہ محو پرستیاں وہ بزمِ دل رہا ہو نہ ستا فی دلتاں
مرفوش کہاں خفا سے ہیں اب تو سرگراں وہ بادِ شبانہ کی سرستیاں کہاں
اُٹھتے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

ات سے آزد تھی دل بے قرار میں پر ہوں تو اڑ کے جا پیے بزمِ نگار میں
رکھ بیٹھ گیا ہوں میں اس رہ گزار میں اڑتی پھرے ہو خاکِ مری کوئے یار میں
بار سے ابدا ہی ہوا۔ ہو بس بال و پر گئی

بلکہ لہجائے ہم کو نہ پر وازِ نقشِ پا گھر کر رہا ہو دل میں ہر اک نازِ نقشِ پا

دلکش ہو کتنی طرزِ فسوں سا نہ نقشِ پایا
دیکھو تو دل فریبی اندازِ نقشِ پایا

موجِ خرام یا رہی کیا شکل کستری گئی

تھی خاص یہ روش کبھی مردانِ کار کی
یہ وضع ہر وضع نے اب اختیار کی

جاتی رہی تمیز ہی اغیار و یار کی
ہر بواہوس نے حسن پرستی شعار کی

اب آبروئے شیوہ اہلِ نظر گئی

عالم ہی اور ہی ترے حسنِ شباب کا
شکل ہو دیکھنا رخِ پُر آب و تاب کا

بے سود و رایگاں ہوا اٹھنا حجاب کا
نظارہ نے بھی کام کیا وہاں نقاب کا

مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

جانا وہ مجھ سے ہاتھ چھڑا کر غضب ہوا
ہر چند تم نے وعدہ فردا کیا تو کیا

دُشوار ہو گیا دل مضطر کا تمنا
فردا و دسی کا تفرقہ یکساں بارش گیا

کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

موتِ نرا کی طرح دیکھتے تھے شادماں تمہیں
پیری میں بھی جہان نے پایا جواں تمہیں

لیکن غمِ عالم نے کیا خستہ جاں تمہیں
مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں

وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

(۸۷)

رہنے کو کیا بُرا ہے جو جنت میں گھر لے
پھر تو جہاں جہاں ہو وہاں تو اگر لے
آرام دل کو جلوہ رخ دیکھ کر لے
تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر لے
عورانِ خلد میں تری صورت گھر لے

اس طرح کہ چپا کے خیر و فن بعدِ قتل
طاہر نہ ہو ہوا ہے کہ ہر دُعا بعدِ قتل
قاتل اگر ہو تو نظر و فن بعدِ قتل
اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دُعا بعدِ قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر لے

بھولا ہی پیکی بھی تو وفاداری قدیم
ایسا گیا کہ جا کے وہیں ہو گیا مقیم
ظالم کے انتظار میں ہو حالِ دل ستیم
تجھے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہو اگر نامہ بر لے

مشہور ہے جہاں میں اثر جذبِ عشق کا
صحرا میں کھنچ کے ناقہ لے لے چلا گیا
اُس جذب کا ہمیں نہیں بے وجہ ادعا
تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غم نہاں سے گر لے

ٹوکی ہیں اُن کے ساتھ بہت ہم نے منزلیں
لیکن نہ پیشرو کبھی مانیں گے ہم آغوش
اس رہ میں راہبر کی ضرورت نہیں ہیں
لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں

مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

نام خدا تم آج ہو ساقی جامِ جہنم اغیار اور حریف ہیں اس بزم میں ہم
دیتے ہو ہم کو موت و نہار کسی سے کم ساقی گری کی ہنرم کرو آج ورنہ ہم

ہر شب پیہا ہی کرتے ہیں جو جس قدر ملے

موت ہوئی ہمیں ہنر نہ کا کچھ پتا اس آستان کے خاک نشینوں میں بھی تھا
وہ بھی وہیں ملے گا جہاں ہو گا رہنا اسی سا کھارن کو چہ دلدار دیکھنا
تم کو کہیں جو غالب آشفۃ سر ملے

*

(۸۸)

اس طرف کچھ ناتوانی اور ہو اُس طرف زعمِ جوانی اور ہو
گر نہ ہی ناہربانی اور ہو کوئی دن گر زندگانی اور ہو
اپنے ہی میں ہم نے ٹھانی اور ہو

میرے سینے پر ہو گلخن کا گماں ہو زبانِ شمع کی صورتِ زباں
کیا بتاؤں اپنے دل کی گرمیاں آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہو

ہنشیں ان سے سفاقت کیا کریں حکم یہ ہو نام بھی سیرا نہ لیں

کیجئے اب کس طرح راضی انہیں بارہا دیکھی ہیں ان کی رہنمائی

پر کچھ اب کے سرگرائی ادھر

ایچی کو کیا زوال اور کیا خطر صاف کہہ دے گا بیان ہی ہوں اگر

ہو رہا کیوں تامل اس قدر دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ ہر

کچھ تو پہنچاںم زبانی اور ہو

دور میں ہیں چرخ گرداں پر نجوم رات دن ہیں دائرہ محور نجوم

دہر میں ہیں وجہ خبر و شر نجوم قاطع اعمار ہیں اکثر نجوم

وہ بلائے آسمانی اور ہو

اچکا ہے غم تشریب اختتام ٹوٹے دالا ہو کوئی دم میں ام

منتظر رہتا ہے صبح و شام ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام

ایک مرگ ناگہانی اور ہو

(۸۹)

کچھ دہاں کی خبر نہیں آتی کیوں صبا راہ پر نہیں آتی

کوئی تدبیر کر نہیں آتی کوئی اُمید بر نہیں آتی

کوئی صورت نظر نہیں آتی

چرخِ آزار کے ہو کیوں درپڑی چین دیتا نہیں مجھے ہی ہی
 ہوتی ہو اپنے وقت پر ہر شئی موت کا ایک دن معین ہی
 نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

دل ہی جب گم ہو دل لگی کیسی پاس تھا جب تو کچھ اُننگ بھی تھی
 کچھ ہیں اب تو ہو گئے رُمٹی آگے آتی تھی حالِ دل پہنشی

اب کسی بات پر نہیں آتی
 حسن بندوں کا ہو ریاضتِ زہد ہندگی اور نیک سیرت و زہد
 زیورِ عبد ہو عبادتِ زہد جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد

پر طبیعتِ ادا نہیں آتی
 ہونے دو حسرتوں کا دل میں غم وہ بگڑ جائیں گے اگر کہدوں
 اپنے دل میں ہو اور ہی مضمون ہو کچھ ایسی ہی بات جو چپٹیں
 ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

میرے نالے کہیں ٹھہرتے ہیں جا کے روزان کے کان بھرتے ہیں
 خوش تو ہیں وہ مگر مگرتے ہیں کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں
 میری آواز گر نہیں آتی

دُکھ سے فرصت جو میں ذرا پاتا چیر کر سینہ تجھ کو دکھلاتا
عقل ہوتی تو خود سمجھ جاتا داغِ دل گر نظر نہیں آتا

بو بھی اس چارہ گر نہیں آتی

اوشکایتِ عبث تغافل کی کیا کہیں کچھ خبر نہ اس نے لی
جب ابھی خود خبر نہیں اپنی ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

روز کے غم سے جان پر پہنچی یارب اس سے نجات کب ہوگی
ہو گیا سیرِ زندگی سے جی مرے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہی پر نہیں آتی

ہوش میں تم جو آؤ گے غالب پسند مکرنا اسے پاؤ گے غالب
حق کو کیا منہ دکھاؤ گے غالب کہے کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرمِ تم کو مگر نہیں آتی

❖
(۹۰)

نالہ و آہ میں دھرا کیا ہو حاصلِ گریہ و بُکا کیا ہو
اس تڑپنے سے مُدعا کیا ہو دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہو

آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہو یہاں دل کو شوقِ جلوہ یار اور وہاں پر وہ مایہ دیدار
ان کو ہی بات بات پر انکار ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار

یا الہی یہ ماحیرا کیا ہے

غیر کب تک کہے گا حالِ دروں آپ کب تک سنیں گے مضمون
ہو چکی انتہائے ضبط و سکون میں بھی منہ میں زبان کھتا ہوں

کاش پوچھو کہ عسا کیا ہے

کہتے ہیں واقفانِ غیب و شہود ایک ہیں عبد و عابد و معبود
آخر ان کا ہی اس سے کیا مقصود جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجد

پھر یہ ہنگامہ ادا کیا ہے

جگھٹے کیسے عاشقوں کے ہیں اور معشوق کس کو کہتے ہیں
حسن کے پھر یہ کیسے جلوے ہیں یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں

عشوہ و غمرہ و ادا کیا ہے

ایک سے ایک نازیں کیوں ہے دام بردوش ہر حسین کیوں ہے
فکرِ صیدِ دلِ حسنین کیوں ہے شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے

بگم جو چشم سرمہ سا کیا ہو

کس لیے پھول رنگ لائے ہیں کیوں یہ لالے نے دلغ کھائے ہیں

کس نے یہ تازہ گل کھائے ہیں سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں

ابر کیا چسپز ہو ہو کیا ہو

ہیں محبت کے بھی نرالے بھید آہ فتنہ ہو اس میں نالہ نشید

یاس کو شرف اور اجل کو نوید ہم کو ان سے وفا کی ہو امید

جو نہیں جانتے دنا کیا ہو

دیکھ کسی کو دیا تو کیا ہو گا تیرے حق میں بہت بُرا ہو گا

بد نتیجہ بُرائی کا ہو گا ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا

اور درویش کی صدا کیا ہو

کب یہ مکر اختیار کرتا ہوں کب دُعا بار بار کرتا ہوں

طرز دشمن سے عار کرتا ہوں جانِ تم پر نثار کرتا ہوں

میں نہیں جانتا دُعا کیا ہو

فصلِ موشا ہو گود ہیں غالب شعر کہتا ہو دلنشین غالب

ہو مگر رند بالیقین غالب میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب

مفت ہاتھ آئے تو بڑا کیا ہی

(۹۱)

ای چارہ گرو تم انہیں سمجھا کے تو ہو گئے اور ساتھ لیئے قرن آمد بھی ہو گئے
اظہارِ تمنا سے مگر بات ہی کھو آئے کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالب ہو گئے
اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہہ دو آئے

احسانِ اجل ہی جو ذرا دے مجھے مہلت ہو اس کے نظارے کی تمنا دمِ جلت
وہ دیکھ تو لے آنکھ سے اپنی مری حالت ہو کشتکشِ نزع میں ہاں جذبِ محبت
کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے دیکھنے کو آئے

آکر مرے گھر بھی وہی وحشت ہو وہی رم آتے ہی اجازت کے تقاضے ہوئے ہم
میشکل ہو قیام ایک جگہ کا انہیں اگم ہو صاعقہ و شعلہ و سیلاب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں میری آنا نہیں گئے

تربت میں مری آکے نہ بھاگینگے نکیرین مردہ بھی مجھ پا کے نہ بھاگینگے نکیرین
پرستش سے بھئی گتا کے نہ بھاگینگے نکیرین ظاہر ہو کہ گھبرا کے نہ بھاگینگے نکیرین
ہاں منہ سے مگر بادہ ووشینہ کی ہو آئے

ہیں تیغِ بکف کون جو پھرتے ہیں اکڑتے یہ کون ہیں جو وعظ میں دنیا سے ہیں لڑتے

در پردہ کوئی اور ہی ہم کس سے بگڑنے جلا دے طے ہیں نہ واعظ سے بھگڑنے

ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

ہم ہوں تو ہر انسان ہیں دے طعنہ نایافت ہاں اہل طلب کون سنے طعنہ نایافت
ہم کم ہوئے اور ختم ہوئے طعنہ نایافت ہاں اہل طلب کون سنے طعنہ نایافت

دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھوئے

ہم وہ نہیں ناکامیوں کے نام سے بیٹھیں اندیشہ مایوسی انجام سے بیٹھیں
رج سفر و سختی احرام سے بیٹھیں اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں

اس در پہ نہیں یا تو کیسے ہی کو ہو آئے

اُس شوخ کے لانے کی تو کرنے گئے تدبیر اور واں ترے رونے کی لگے کھینچنے تصویر
دوبنی ہوئی تقدیر سے اُلٹی ہوئی تاثیر کی ہم نفسوں نے اثر گریہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے

ک لطف ہاں عید کا دن ات ہی غالب کیا جلسہ یا ران خوش اوقات ہی غالب
منا کے لیے وہ در حاجات ہی غالب اس انجمن ناز کی کیا بات ہی غالب
ہم بھی گئے واں اد تری تقدیر کی و آئے

(۹۲)

جب سے رنگِ بہار طاری ہو کچھ عجب کیفیت ہماری ہو
پھر ہوشِ چشم تر سے جاری ہو پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہو

سینہ جو بآئے زخمِ کاری ہو

پہلے بیکارِ محض تھا ناخن اب مگر کام دے گیا ناخن
داغِ دل کی طرف بڑھا ناخن پھر جگر کھودنے لگا ناخن
اب فصلِ لالہ کاری ہو

پھر عبادت کا ہو نیا انداز اور ہی سمتِ رخ ہو وقتِ نماز
سُن کے نائقے کی دل ربا آواز قبلہ مقصدِ نگاہِ نیاز

پھر وہی پردہٴ عمارتی ہو

ہو کے گاہک بنے ہیں سودائی دیدہٴ دل کو کچھ نہ سیدہٴ آئی
رہ گئی ان کی ساری دانائی چشمِ دلال جنسِ رسوائی

دل خریدارِ ذوقِ خواری ہو

بل کے دونوں نے ہو یہ ٹھہرائی ایک عالم بنے تماشا ئی
دونوں ذلت کے ہیں تنائی وہ ہی صد رنگِ نالہ فرسائی

وہ ہی صد گونہ اشکباری ہو

تنگ ہوں ہجر جاں گزار سے پھر عشق ہی اس قدر گزار سے پھر
مست ہوں چشمِ نیماز سے پھر دل ہوا ہی حرامِ ناز سے پھر
محشرستان بے قراری ہو

حُسن پھر ترکِ تاز کرتا ہی پھر درِ فتنہ باز کرتا ہی
نُونِ اہلِ نیاز کرتا ہی جلوہ پھر عرصِ ناز کرتا ہی
روز بازارِ جاں سپاری ہو

لاکھ صدے سنئے گزرتے ہیں جان اُس پر نشانہ کرتے ہیں
پھر دم اُس پُر دغا کا بھرتے ہیں پھر اُسی بے وفا پر مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہو

ن

اے ہیں دادخواہ اہلِ نیاز ہیں جفا پیشہ گوشِ بر آواز
ظاہر اہلِ حسنِ عشق کے راز پھر کھلا ہی درِ عدالتِ ناز
گرم بازارِ فوجِ مداری ہو
ہر زبِ دست ہو گیا ہی شیر زیرِ دستوں کو کر رہا ہی زیر

عدل و انصاف میں نہ کیوں ہو دیر ہو رہا ہی جہان میں اندھیر

زلف کی پھر سر مشتمل داری ہے

پھر کیا دل نے یوں بیاں احوال رو دے سن کے حاکم و عمال

سیر اجلاس پھر ہی قال و مقال پھر دیا پارہ حب گرنے سوال

ایک فریاد و آہ و زاری ہے

ابھی ثابت نہیں جفا کا سبب نہ ابھی ہی ثبوتِ قہر و غضب

دیکھیے ہو معاملہ طو کب پھر ہو سے ہیں گواہ عشق طلب

اشکباری کا حکم جاری ہے

عشق انصاف پر اگر آیا بال کی کھال ہی رنگائے گا

دیکھیے اس کا ہو نتیجہ کیا دل و نگران کا جو مقدمہ تھا

آج پھر اس کی رو بکاری ہے

یہ مضر احوال تو یقیناً غالب ہو سے منسوب تم کہیں غالب

دل گیا ہی کوئی حسین غالب بے خودی بے سبب نہیں غالب

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

(۹۳)

کی سرکشی تو فرطِ ندامت سے خم ہوئے اپنی قسیوں سے خجل دم بدم ہوئے
حد سے بڑھے تو موردِ رنج و الم ہوئے بے اعتدالیوں سے کسبِ سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

لالے پڑے ہوئے ہیں ہمیں اپنی جان کے کب تک ہیں گے دکھیئے ظلمِ آسمان کے
چکے نہ ہم نے کچھ بھی منے اس جہان کے پنہاں تھا دامِ سختِ قریبِ آسمان کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

اب کیا ہیں پہلے کیا تھے یقینہً طویل ہو ہم ہیں بھی کچھ اسی میں بھی قالِ وکیل ہو
ہر روزِ انحطاط ہو مہلتِ تسلیل ہو ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہو
یاں تاک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

مستور پر وہ ہائے خفا میں ہیں اس قدر آنکھوں کے سامنے ہیں اور آتے نہیں نظر
گویا گئے ہیں ہستی موہوم سے گزر سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہو کیا خبر
وہ لوگ فتنہ رفته سہرا پا الم ہوئے

وہ کون ہو کہ جس نے ستایا نہیں ہمیں حیراں ہیں تیرے سامنے کس کس کا نام لیں
کیا کہیے جو فلک نے نکالی ہیں کاوشیں تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہریں

تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے قسم ہوئے
 گوجرم عرضِ حال میں کاٹی گئی زباں
 چھوڑا مگر نہ حسرتِ دل کا بھی بیاں
 تحریر بھی کیا کیئے وحشت کی داستان
 لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
 ہر چند اس میں باتھ ہمارے قلم ہوئے
 یالٹ ملک پہنچے ارادے تھے عشق کے
 یا گھٹکے دل میں رہ گئی سب جوصلے گھٹے
 ڈر سے کیا تباہ و فنا خود کو آہ نے
 اللہ سے تیری تندہیِ خو جس کی ہم سے
 اجڑا رنالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے
 ہو کس طرح سے کوئی فرومایہ فردِ عشق
 دشمن کا جوصلہ ہو کہ سہ جائے درِ عشق
 ہوتا ہو کوئی جان چرا کر بھی مردِ عشق
 اہلِ ہوس کی فستح ہو ترکِ نبردِ عشق
 جو پاؤں اٹھ گئے وہی ان کے علم ہوئے
 مجبور کر دیا ہو ودیعت سے پار نے
 آنا پڑا وجوہ میں گویا اسی لیے
 ہوتا بھرا ہوا جو نہ دل دم نہ مارتے
 نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
 جو واں نہ کھنچ سکے وہ یہاں آکے دم ہوئے
 دل کو لگی ہوئی تھی یہاں صحنِ جوشِ کی
 اور دل لگی کی بھی ہمیں عادتِ قدیم تھی
 صحرایہ کی طرح اُن رسیِ مفلسی میں بھی
 چھوڑی آسماں ہم نے گدائی میں ل لگی

سائل ہوئے تو عاشق اہل کرم ہوئے

❦

(۹۴)

گھر گھر نشاط و عیش کا جوش و خروش ہو بزمِ طرب کہیں ہو کہیں ناؤ نوش ہو
اور یہاں دُورِ غم سے پراگندہ ہوش ہو ظلمتِ کدہ میں میسے شبِ غم کا جوش ہو
اک شمع ہو دلیلِ سحر سو خموش ہو

ہو چونکہ دردِ ہجر میں دنوں کا ایک حال ممکن نہیں کہ ایک سے ہو ایک کو طلال
باہم نہیں ہو رشکِ حسد کا کوئی خیال فی مَرَدُہ وصال نہ نظارہ جمال
مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہو

کم کر دیا ہوش نے ساقی کا اجتناب سرکا ہو آج رخ سے ذرا گوشہ نقاب
وہار سے ہو دیدہ مشتاق کامیاب مرنے کیا ہو حُسنِ خود آرا کو بے حجاب
ای شوق ہاں اجازتِ تسلیم ہوش ہو

اس کے گلے کا بار جو وِرتیں ہوا گویا صدف کا اختِ قسمت چپک گیا
اک شک و رہی ہو صدف کا تو ذکر کیا گوہر کو عقدِ گردنِ خواہاں میں دیکھنا
کیا اوج پر ستارہ گوہر فروش ہو

ہو شکر کی جگہ کہ نہیں ہم وہ می پرست داؤ گھونٹ میں نہیں نہ ہے ہوش پاؤ دست

اچھا کیا تمھارے تصور نے بند و بست دیدار با وہ حوصلہ ساقی نگاہ مست
بزم خیال میکدہ بے خروش ہو

ن

کرتی تھی مجھ کو قلت می یا تو مضحل
کردار سے ہوں اپنی پیشیان منقل
یا اب خیال بادہ کشی بھی ہو جاں گل
ای تازہ واردان بساط ہوائے دل
زنہار اگر تھیں ہوس ناؤ و توش ہو

مجھ کو کچھ آپ اپنے اگر خمیر خواہ ہو
تم بھی کہیں نہ میری طرح سے تباہ ہو
سنبھلو ذرا جو طالب امن و پناہ ہو
دیکھو مجھے جو دیدِ عبسرت نگاہ ہو
میری سُنو جو گوشتِ حقیقت نبوش ہو

اس بزم میں نہ پاؤ گے کچھ غیر گری
مجھ پر گزر چکی ہو جو میں نے تمھیں کہی
جاتی رہے گی عقل سراسر رہی سہی
ماتی بجلوہ دشمن ایمان و آگہی
مطرب نہ نہ رہن تمکین و ہوش ہو

کہتے ہیں جس کو اہل جہاں محفل نشاط
رونی کو اس کی لفظ بہ لفظ ہو انحطاط
اک خواب خوش سے بڑھکے نہیں میں میں نشاط
یاشب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط
دامان باغبان و کف گل فروش ہو

چاروں طرف لفظ چائے پیئے ہو رنگ
بجائے شورِ قفل میں سنا سے جل ترنگ
اودل میں اہل بزم کے اک بوشِ ارا رنگ
لطفِ خرام ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
ہے جہنمِ نگاہ وہ فردوسِ گوشتِ ہی

ای انساط و پیش کا منظر تو بزم میں
پیدا ہی لطفِ گردشِ ساغر تو بزم میں
کچھ نیست کا مزہ ہی میسر تو بزم میں
یا صبح و دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نہ وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہی

حالت ہی اور کچھ نظر آتی ہی بزم کی
روقت ہی اس جگہ بھی گویا ہوئی نہ تھی
مخل جو تھی بھری ہوئی سنسان ہو گئی
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہی سو وہ بھی تموش ہی

تہنرانے کی نہ کوئی کمی عرضِ خیال میں
تا ہو نہ ہستا کوئی مح کے وبال میں
اک درہی بکھرا ہوا اُس کے تعال میں
آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں

غالب صریحاً نہ لوائے سرودش ہی

(۹۵)

انہیں ان کو نقیب چاہ کا میری نہ سہی
جان لیکر بھی اگر قدر نہ کچھ کی نہ سہی
وہ جو کہتے ہیں آہیں جان نہیں ہی نہ سہی
نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی

امتحان اور بھی باقی ہی تو یہ بھی نہ سہی

میرے حصے میں نہیں گل نہ سہی خار تو ہو
دل میں اک صورت یاوگل و گلزار تو ہو
گو مسرت سے ہوں محروم غم یا تو ہو
خار خار الم حسرت دیدار تو ہو
شوق گلچین گلستان تسلی نہ سہی

کیا کوئی فرض ہی ہر روز اُسے آئے ہی بنے
اپنے ہاتھوں سے ہمیں جام پلائے ہی بنے
وہ نہیں ہونے ہو مگر آج اُسے ہی بنے
میری پستان خم کو منہ سے لگائے ہی بنے
ایک نگر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

اپنے دیوانے کی گو اس نے کی قدر تو کیا
جوش و خشت دیا اُس کا ستارہ چمکا
اپنی آنکھوں کا بیاباں نے بہنا یا تارا
نفسِ قیس کہ ہی چشم و چراغ صحرا
گر نہیں شمع سیہ خانہ لیلی نہ سہی

روکتے ہیں مجھے احباب فدا و ناحق
ہر گھڑی جب مجھے گھوٹیں تو نہ کیونکر مطلق
سازِ عشرت ہی نہیں باعثِ رونق مطلق
ایک ہنگامہ پہ موقوف ہو گھر کی رونق
نوحہ غم ہی سہی نغمہ شادی نہ سہی

دیدہ عقل پہ حاسد کے پڑا ہی پروا
کر دیا ہی مرضِ رشک و حسد نے اندھا
مطلب پنا آئے سمجھاؤں بھی تو حاصل کیا
نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

گہ نہیں ہیں مرے اشعار میں مستی نہ ہستی

تم سے مرزا جو کہیں اس کو نصیحت سمجھو
ہیں جو ہمدرد تو یہ ان کی عنایت سمجھو
پیش جو آئی ہی بہتر یہی حالت سمجھو
فرصت صحبتِ خواہاں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی غالب اگر عمرِ طبعی نہ ہستی



(۹۹)

کبھی کیا تھا نہ ظالم نے اس طرح کرم آگے
ہمارے سائے سے پہلے تو کرتا تھا وہ دم لگے
نہ کی تھی تیغِ سیر قل گاہ یوں علم آگے
عجب نشاط سے جلاو کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سایہ سے سرپاؤں سے دو قدم آگے

مرے ہی جھلے ہیں آئے زمانے کے غم و کلفت
مرے ہی اسطے پیدا ہوئے ہیں ماتم و حسرت
خوابوں سے زمانے کی ہی کہاں مجھے فرصت
دُھانے تھا مجھے چاہا خراب بادہ الفت

فقط خراب کھابس نہ چل سکا تم آگے

ہمارے دل کی مٹادی غمِ فراق نے ہستی
بسی بسائی ہوئی حسرتوں کی اجڑی ہو ہستی
کچھ اب تو ہمت و طاقت میں تہرکی اتنی ہستی
غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عیش کی مستی

وگر نہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے

بتائیں کیا کہ تنہا ہمارے دل کی ہو اسکیا
لگی ہو دھن کہ شیں خود جواب کچھ نہ کچھ اس کا

دیا ہی نامہ مگر دل کو ہر کچھ اوہی سہوا خدا کے واسطے داد اس جنوں ثوق کی دینا
 کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ برسے ہم آگے
 تجھارے چھونے سے زخم میں آگے ہیں بلا کے تجھارے چھونے میں آگے نہ جیتے جی کبھی چھوٹے
 ہمارا دل ہی کچھ اُبھرا ہوا تھا کیا کہیں تم سے یہ عمر بھر جو پریشاں بناں ٹھانی ہیں ہم نے
 تجھارے آئے وہی طرہ ہا سے غم بہ غم آگے
 بہت دنوں تو ہم اس امر کے بہت سہ پہ دیو ہم اشکوں پہ بہا ہیں کہ قصہ ہی کہیں طو
 ابلہ ہی ہستی کا عقدہ کھلا کہ یہ ہی کسی شے دل و جگر ہیں افشاں جو ایک شے غوں ہی
 ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو ہم آگے
 وہ اشکات تم صبر کیا یہ کہ بہا تے ہیں غالب غصیب ہونے کی میرے خوشی نہاتے ہیں غالب
 لانے خاک میں کج کہاں وہ آتے ہیں غالب قسم جبارہ پہ آتے کی میرے کھاتے ہیں غالب
 ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

(۹۶)

آہ کرنے سے غصیب اس کا سوا ہوتا ہی انا کہ کرتا ہوں تو سرگرم جھٹا ہوتا ہی
 لب ہلا نا سبب ترک و فنا ہوتا ہی شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہی
 یہ بھی منت کہہ کہ جو کہیے تو گلا ہوتا ہی

تنگ ہوں کب تک بٹایا کروں میں جو رہ جھٹا کو نساکلم ہی جو آپ نے مجھ پر نہ کیا
بے سبب تو نہیں اشکوں کا مئے تار بن جھٹا پڑ ہوں میں شکوے سے یوں آگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھپیڑیئے پھر دیکھیئے کیا ہوتا ہے

دل غم دوست کی ہی چین تمنا یہ تو ہم جو شاکی ہوں تو وہ اور ستائے ہم کو
کاش آگاہ وہ اسرار شکایت سے نہ ہو گو سمجھتا نہیں پر حسن تلافی دیکھو
شکوہ ہو رہے سرگرم جھٹا ہوتا ہے

کر دیا روز کی گردش نے اسے خستہ حال پاؤں بھی اب تو اٹھانا ہو اسے سخت خیال
ہو گیا خلون کو اندازہ رفتار محال عشق کی راہ میں ہی چرخ کو کب کی چال
خستہ و جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

ہم یہاں تک ہوئے غم گر بیاد و ستم دیر ہوتی ہی جفاؤں میں تو ہوتا ہی الم
دل کو تو تازہ جراحات کی خواہش پیہم کیوں نہ ٹھہریں ہر فن ناوک بیدار کہ ہم
آپ اٹھا لاتے ہیں گرتیر خطا ہوتا ہے

بخت برگشتہ نے لینے ہی نہ دی ہم کو پناہ رکھتے اور کاش نہ ہم اپنی بھلائی پہ نگاہ
کام سب ٹوٹے تدبیر سے ہوئے اپنے تباہ خوب تھا پہلے ہی سے ہوتے ہم اپنے بد خواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے

ڈر سے شکوہ نہیں کرتے ہیں کہ ہو ترکِ ادب نا توانی کی ہو آخر کوئی حد بھی یارب

نارنائی بھی ہو دشوار دم رنج و تعب نالہ جاتا تھا پرے عیش بریں سے اور اب

لب تک آتا ہی جو ایسا ہی رسا ہوتا ہی

طبع قدرت نے مجھے دی ہو عجیبِ دو فن میں جو چاہوں سرقطاس کھلا دوں گلشن

راگ لاسکتا ہی کیا مجھ سے کوئی مرغِ چین خامہ میرا کہ وہ ہی بارہدِ بزمِ سخن

شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہی

ذات کو تیری کیا حق نے پناہِ عالم تیرا سا پسِ مخلوق پہ ہی ابرِ کرم

اہلِ دنیا کو ترے فیض سے ہی عیشِ بہم او شہنشاہ کو اکبِ سپہ و مہرِ سلم

تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہی

معضِ افسانہ ہیں شاہانِ سلف کے قصے بیچ ہیں شوکتِ اقبال میں تیرے آگے

کچھ ٹھکانا ہی بھلا جاہ و چشم کا تیرے ساتِ اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے

تو وہ لشکر کا ترے فصل بہا ہوتا ہی

اگر دیکھتا ہی ترے دیکے فلک ہی یہ حال ذرہ ذرہ ترے دروازے کا خورشیدِ مثال

ماہِ کمال کو جیسے سائی میں حاصلِ ہیکال ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہی ہلال

استاں پر سے مہِ ناصیب ہوتا ہی

بند ہیں مرغِ چین مجھ سے خوش الحانی میں کچھ نہ کچھ نغمہ سرا ہوں جو پریشانی میں
ہو ترا لطف مدِ طبع کی جولانی میں میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزلِ خوانی میں

یہ بھی تیرا ہی کرمِ ذوقِ سنرا ہوتا ہے

کہیے کیا چرخِ تنگوار کو ہی نا انصاف ذکر کیا غیر کا اپنے بھی ہیں ہزار کے خلاف
کوئی ہمارے نہیں قاف سے لیکر تا قاف رکھو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف

آج کچھ دردِ مرے دل میں سوا ہوتا ہے

✽

(۹۸)

ہلائے دہراؤ بے باکیوں کی خو کیا ہے لٹکائے سامنے انسان کی آبرو کیا ہے
کلامِ ہشک یہ دشمن کے رو برو کیا ہے ہر ایک بات پہ کہتے ہو غم کہ تو کیا ہے
تجھیں کہو کہ یہ اندازِ گفت گو کیا ہے

نگاہِ گرم سے ظالم نے جس کو دیکھ لیا جلا کر اس کو کیا خاکِ دم میں سرتاپا
کمال یہ ہے کہ کرتا ہے آگ سے ٹھنڈا نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا

کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہے

برائیوں کے ہماری سبق ہزار وہ ہے یقین ہے کہ نہ فقروں میں آؤ گے اس کے
خیال اس کا نہیں ہے کہیے وہ جو چاہے یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخنِ تم سے

وگر نہ خوفِ بد آموزی عبد کیا ہی

نہ دے گا کامِ رفوگر یہاں ترا کچھ فن
اٹھا کے طاق میں رکھ اپنے رشتہ و سوزن
سرسبکِ چشم کے تاروں سے جل چکا دامن
چپکا رہا ہی بدن پر لہو سے پیرا ہن

ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہی

رہا نہ تن ہی تو دل کا کہاں پتا ہوگا
یقین ہی جسم سے پہلے ہی مٹ چکا ہوگا
سوائے خاک یہاں دستیاب کیا ہوگا
جلا ہی جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کر دیتے ہو جو اب را کھ جستجو کیا ہی

غلط کہ رہتا ہی جو پائے فخرِ قاتل
کہیں گے ہم تو کہ ہی اس کی دھڑلا حائل
بہتے ہیں شکِ یگن گل کے کیا جگر کیا دل
رگوں میں دھڑتے پھرنے کے ہم نہیں قاتل

جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہی

جو ہی توفیقِ زہاد کو ہی اس کی تمیز
کہ کس کو کہتے ہیں غلمانِ عو رہی کیا چیز
ہیں غرض نہیں کوئی عنسلام ہو کہ کنیز
وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشتِ عزیز

سوائے بادۂ گلفام و مشکبو کیا ہی

چڑھاکے ساغر و مینائے مرنہ ہوں سرشار
سبو بھی منہ سے لگا کر نہ سیر ہوں زہن پار
یقین کیجئے میں نام کا نہیں میں جو خوار
پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دودھ پار

پیشینہٴ وقتِ دُکوزہ و سبوحیا ہے

ہمارے حال پران کو کہیں نظر ہو بھی اور التفاتِ مریضِ فراق پر ہو بھی

نیچہ خاک نہ ہو گا اگر خسبر ہو بھی رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی

تو کس اُمید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

عروجِ طالعِ غالب اگر اسے بھاتا حسد کی آگ میں حلسہ نہ یوں بھینکا جاتا

نہ پھر یہ شعر وہ صرصر از زبان پر لاتا ہوا ہے شہ کا مصاحب پھر سے ہی اتراتا

وگر نہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

(۹۹)

تابِ الم اب مجھے زہنا نہیں ہے قابو میں مرے دل اٹکا نہیں ہے

آہِ فدا دل پر اختیار نہیں ہے آگہ مری جان کو تر نہیں ہے

طاقتِ بیدارِ انتظار نہیں ہے

دل کو تو قابو میں اپنے لیے لیا پہلے کہتے ہیں فرمائشِ جانِ جانِ کج ہم سے

لطفِ ملے گا بھلا کب عیشِ اس کے دیتے ہیں جنتِ حیاتِ ہر کے بدلے

نشہ بہ اندازہٴ نجا نہیں ہے

چھائی ہے کچھ اس طرح کی یکسی اب تو روتا ہوں ہمرازی کوئی نہ ہو دل

شکوہِ قیہوں کا کیا کیا تیرا گلہ ہو گر یہ نکالے ہو تری بزم سے مجھ کو

ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہو

وجہ بھی تو چاہیے کچھ رنج کی آخر کونسی شے میں ہو پایا عاجز و قاصر

چاہو جو تم جان بھی کر سکتے ہیں حاضر ہم سے عبت ہو گمانِ رنجشِ خاطر

خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہو

غفلتِ دل سے بھلا کیا پائے معافی اس میں ہی غنی ہو سب دلیہ معافی

اس کو سمجھ منزل و ماوائے معافی دل سے اٹھا لطیف جلوہ ہائے معافی

غیر گل آئینہ بہار نہیں ہو

اس پہ کیے ہیں نے برسوں تک تھامنے سُن کے ہمیشہ مگر کچھ ٹالا ہی ہوتے

طالعِ خفہ مرے کچھ تو ہیں جاگے قتل کا میرے عہد تو کیا ہو بارے

وائے اگر عہد استوار نہیں ہو

تو نے یہ کیا زہ کی ٹھہرائی ہو غالب چال یہ صوفیانے تری پائی ہو غالب

جام و سہو کا تو تو سودائی ہو غالب تو نے قسم میکشی کی کھائی ہو غالب

تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہو

زائے بھر کے رنج و غم ہیں اور تنہا مراد دل ہو (۱۰۰) گل مجھ سے اس کوہ گراں کا سخت مشکل ہو
 بڑھایا پوچھ اتنا سسے زانو سر بھی مائل ہو
 ہجوم خم سے یاں تک سرنگونی کچھ کو چال ہو
 کہ تار دہن و تار نظر میں فرق مشکل ہو

مجھے ای چارہ گرد نظر راحت نہیں تن کی
 منے لوں تو اگر کاٹے رگیں بھی میری گئی دن کی
 سینے جا زخم دل پر روانہ کر کچھ طعن دشمن کی
 رفوئے زخم سے مطلب ہو لذت خم سنوں کی
 سمجھیو میت کہ پاس درد سے دیوانہ غافل ہو

گلستاں میں گروہ و فتن افزائی کرے غالب
 تو نور اس کا عطر گیس کو بینائی کرے غالب
 عجیب کیا ہوئے خوش ہونر آؤ سودائی کرے غالب
 وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالب
 چکنا غنچہ نگل کا صدائے خندہ دل ہو

بی

(۱۰۱)

جس روز کہ تو سیر کو گلزار میں آوے
 گل تازہ کھلے بہت گل خار میں آوے
 بالیدگی سوکھے ہوئے اشجار میں آوے
 جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
 جاں کا لید صورت دیوار میں آوے

گلشت میں پیدا ہو عجب لطف کا منظر
 لے بڑھکے بلائیں تری ہر شاخ گل تر
 گل تیرے قدم لینے کو ہو فرش زمیں پر
 سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر

تو اس قد و لکش سے جو گلزار میں آوے

مانا کہ غم و ہم سے دل زار کھلا ہو برسا دیئے ترگاں نے جو دریا بھی تو کیا ہو
آنکھیں بھی ہو روئیں تو کیا فخر ہو اور تب ناز گرا نہا گئی اشک بجا ہو

جب نخت جگر دیدہ خونبار میں آوے

ہر چہز ہوا جو شش فرو مجھ کو ستا کر کچھ دل کو ہوئی راحت و تسکین بھی دم بھر
وہ بات بھی کر جس سے ملے لطف مکر دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ سنگد

کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آئے

اعجاز کا رنگا پنے جو دکھلائے اشارہ بیجان کو جاندار بنا جائے اشارہ
جادو سے غضب کھئے کیا ٹوٹھا سے اشارہ اس چشم فسون گر کا اگر پائے اشارہ

طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آئے

مصرف و عاؤں میں ہیں کس سے یارب تاہر ہنہ پا گزرے کوئی پاس سے یارب
تکے ہیں پڑے راہ عجب پاس سے یارب کانٹوں کی نہاں سوکھ گئی سپاس سے یارب

اک آبلہ پا وادی پر خار میں آئے

آیا مرے آغوش میں کبہ تن نازک کس دن ہوا راحت کا سببہ تن نازک
پھندے میں ہو یوں غیر کے ابہ تن نازک مرجاؤں کیوں شکستے جبہ تن نازک

آغوشِ خیمِ حلقہ زار میں آوے

پہنائے ہوئے دستِ طلب ہیں سرسبز دیکھا ہو زمانے میں انھیں غمِ ابری اکثر

انساں کیلئے حرص ہی دشمن ہو قوی تر غارت گردِ ناموس نہ ہو کر ہو بس زر

کیوں شاہِ گلِ بلغ سے بازار میں آوے

اما کہ جنوں کا ہو تجھے جوشِ فراواں باقی ترے ہاتھوں سے ہی حبیبِ داماں

یوں ٹکڑے اڑانا تو نہیں ہو تجھے شایاں تب چاکِ گریباں کا مزہ ہو دلِ ناواں

جب اک نفس اچھا ہوا ہر تار میں آوے

کیا حالِ تپِ سوزِ دروں کہیے زباں سے لگ جائے کہیں آگ نہ گرمی کے بیاں سے

بہتر کہ نہیں ہی رہے اہلِ جہاں سے آتشِ کدہ ہو سینہ مرا راتِ نہاں سے

اے آوے اگر معرضِ اظہار میں آوے

مقرر کی طرحِ سحر کی قسم اس کو سمجھیے مصنوں ہو اگر روح تو جسم اس کو سمجھیے

افسوں اے ٹھہرائے اہم اس کو سمجھیے گنجینہٴ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے

جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

(۱۰۲)

اندھو خیمِ سحر یا رکِ خال اچھا ہو اس کے ابرو سے نہ خنجر نہ ہلال اچھا ہو

مہر کچھ ہی تو ذرا قبل زوال اچھا ہی
حسن مہ گرچہ بہنگام کمال اچھا ہی

اُس سے میرا مہ خورشید جمال اچھا ہی

مفت کے مال کے اس درجہ ہیں خواہاں کہ ہوا
وہ ہی دانو اسی گھات میں ہیں شام و بچا
چاہتے ہیں کہ رقم کوئی ملے خاطر خواہ
بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہی ہر وقت گوا
جی میں کہتے ہیں کہ مفت اُسے تو مال اچھا ہی

کب میسر ہوا جمشید کو پہا نہ نیا
دور میں تادم آخر دہی اک جام ہا
دل سے اترا جو بہاں دُور کیا پھینکیا
اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا

ساغر جم سے مرا جام سفال اچھا ہی

کر دیا ہی غم ہجراں نے مرا سینہ شوق
نام ہی نام ہی اب جان کا باقی ہی رہا
رنگ ہوتا ہی مرا یوں تو غم و درد سے فاق
ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہو منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہی

ان کے ہاتھوں سے کسی کو بھی نہیں پہنچا فیض
دین و ایماں کے یہ شبنم ہیں تو پھر کیا فیض
بندگی کر کے بھی دیکھا تو نہ پایا یا فیض
دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض

اک برہمن تے کہا ہی کہ یہ سال اچھا ہی

فن ہی وہ چیز کہ فرہاد کی دی بات بنا
دور نہ شیریں سے کرے بات یہ ہیں کامنہ تھا

بس ہنر میں تھی اُسے شوق وہ کام آہی کیا
ہم سخن پیشے نے فرما دو شیریں سے کیا
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہی

اصل محبوب ہے ای کاش ہمارا ہو جائے
دور جلدی کہیں یہ پردہ دوئی کا ہو جائے
بزد ہو داصل کل ایک ہی لفتنا ہو جائے
قطرہ دریا میں بول جائے تو دریا ہو جائے

کام اچھا ہی وہ جس کا کہ مال اچھا ہی

کل کے دروازے سے چوچا ہے گدا ملتا ہی
اور جو ملتا ہی تو باچون و چرا ملتا ہی
در بدر بھیک اگر مانگیے کیا ملتا ہی
بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہی

وہ گدا جس کو نہ ہو خوشی سوال اچھا ہی

اب اس کو خدا رکھے سرا سرا سر سبز
اس چین میں ہے یہ شک صنوبر سر سبز
بود اس کا چین زار مقدس سر سبز
خضر سلطان کو رکھے خالق اکبر سر سبز

شام کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہی

کٹ رہے ہیں اسی امید میں مرزا کے بھی دن
صرف اسی آسیرے پر ہی دل مضطرب ساکن
پیشو رہو نہ ہو کب ہی تسلی ممکن!
ہم کو معلوم ہی جنت کی حقیقت لیکن

دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہی

(۱۰۳)

ہم ہیں شاکِ ساقیِ گلجام کے اہلِ محفل ہوں مُتِ انعام کے
حوصلے پورے ہوں خاصِ جام کے غیرِ لبِ محفل میں بوسے جام کے

ہم رہیں یوں تشنہ لبِ پیغام کے
ظلم سے خالی ہو کوئی کہ نہ مہ درپے ایذا ہیں اہلِ شہر و دہ
تم سے کیوں پڑتی مرے دل میں گرو خشکی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ
ہشکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے

دل میں اس ناوکِ فتن کے ہو گرو یہ کمان اپنی کیے رہتا ہونہ
ناگ میں سب کی ہو کہ ہو یا کہ نہ خشکی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ
ہشکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے

تم جوابِ خطِ ماہیں دو یا نہ دو ہم کو حاصل ہو غرض ہو دل کی جو
اس بہانے نام لکھا جائے تو خط لکھینگے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

جوشِ مستی میں کیا طوفِ حرم خشتِ خم پر کی ادا رسمِ سلم
زہد میں رندی سے بھی چوکنے ہم راتِ پی زہرِ مہ پہ ڈاڑھِ صعدِ م

وہوئے دھبے جامہٴ احرام کے
 تھی بلا اپنے لیے اپنی نظر
 ہتکنڈوں کی اس کے تھی کس کو خبر
 اپنے ہاتھوں خود تھیں پہنچا ضرر
 دل کو آنکھوں نے پھنسا یا کیا مگر
 یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دم کے
 ہو چکا ظاہر دعاؤں کا اثر
 سب تھے مصر و فیہ عاشق و مہر
 شاد بکھرتے ہیں طیبہٴ چارہ گر
 شاہ کے ہو غسلِ صحت کی خبر
 دیکھیے کب دن پھریں حمام کے
 پوچھ لو موزا سے اپنا مشنلا
 شغل ہو سکتا ہو کیا بے کار کا
 روگ ہی کچھ دل کو بیڈب لگیا
 عشق نے غالب نیچا کر دیا
 در نہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

✽

بہر شجر نے نئی قبا پائی (۱۰۴)
 بوئے گل کو صبا اڑا لائی
 گل نرگس نے پائی رعنائی
 پھر اس انداز سے بہا لائی
 کہ ہوئے ہر وہ تماثائی
 نظر آتے نہیں خس و خاشاک
 ہو صفائی سمیت تابہٴ خاک

ہر چین ہو غبار و گرد سے پاک دیکھو ایسا کائن خطہ خاک

اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

اؤں کی ہی بہار سبز ہے پر گل چمکتے ہیں صورتِ اختر
کہیں بے ساختہ نہ پھر کیونکر کہ زمیں ہو گئی ہی سرتاسر
روکشِ سطحِ چرخِ مینائی

ابرِ باران نے آبپاری کی قوتِ نامیدہ کو حرکت دی
نظر آتی ہو شاخِ شلخِ ہری سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی

ہو گیا روئے آب پر کانی

سبز نعلِ بچھائی سبزے نے کھل کھلاتے ہیں ہر طرف غنچے
پھول بھی شاخِ شلخِ پر پھولے سبزہ و گل کے دیکھنے کے لیے
چشمِ نرگس ہوئی تماشائی

بزمِ عالم ہو مودے کی نظیر جھوم کر چھا گیا ہی ابرِ مطہر
مست پھرتے ہیں سب صنیر و کبیر ہی ہوا میں شراب کی تاثیر

بانِ نوشی ہی بادِ پیانی

شاد ہر نہا ہی ہر گھڑی غالب کہ دُعا کا رگر ہوئی غالب

عام ہی عیش و خرمی غالب کیوں نہ دنیا کو ہون خوشی غالب
شاہ دیندار نے شفا پائی

۱۰۵

نہ چلی سحر بیا فی میری ہیچ نکلی ہمہ دانی میری
بھول کر بات نہ مانی میری کب وہ سنا ہی کہانی میری
اور پھر وہ بھی رہا فی میری

درد و دل ای ستم انگیز نہ پوچھ حال چشم غضب آئینہ نہ پوچھ
زخم نوکِ مرثہ تیز نہ پوچھ خلشِ غمزہ خونریز نہ پوچھ
دیکھ خوں نابہ فشتانی میری

مجھ کو اپنا ہی نہیں مائے خیال دوستوں تک کہاں جائے خیال
کس طرح ان کا مجھے آئے خیال ہوں زخود رفتہ بیدائے خیال
بھول جانا ہی نشانی میری

ہو حریف اپنا بھی کتنا بودا جھکو جس بزم میں پایا نہ جما
میری ہر بات میں ضد ہو گیا مقابل ہی مقابل میرا
رک گیا دیکھ روانی میری

جبکہ نظروں میں سبک ٹھہرا ہوں کیوں ترے ٹل پہ گراں آتا ہوں
 کیا حقیقت ہی مری میں کیا ہوں قدیر سنگ سر رہ رکھتا ہوں
 سخت ارزاں ہو کرانی میری

کیوں نہ بے ساختہ چکر کھاؤں گردش دہر سے ہو حال زبوں
 غیر ممکن ہو کہ ٹھہروں دم لوں گرد باد رہ بے تابی ہوں
 مصرعہ شوق ہی بانی میری

موشگافی کا مجھے دعویٰ تھا عقدہ موسے کمر ہی نہ کھلا
 تھا غلط زعم ہمہ دانی کا دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا
 کھل گئی پہچانی میری

خط جو لکھتا ہوں تو خاصہ طوفاً بات کرتا ہوں تو دیوانہ وار
 کیا مجھے یاد کریں گے غم خوار کیا بیاں کر کے مراد و نیکیاں
 مگر آشفۃ بسیانی میری

بش مہر ترا ہوئی طاقت غالب قلبا بدیں نہیں میں غالب
 خاک میں نیستی کا اپنی طالب کردیا ضعف نے عاجز غالب
 ننگ پیری ہی جوانی میری

رگِ ہمری تشترِ فساد کی بھوکی ہو جلدِ رواں تیغِ یہ حسرتِ ہو گلو کی
راحتِ ہی جراحِ است کو روانی سے بھوکی جس زخم کی ہو سکتی ہو تہِ بیرِ افو کی

لکھو بچھو یا رب اسے قسمت میں عدو کی

وہ دن گئے تھیں خون سے جب پنی گیس پیر اور آنکھ سے تھا خون کے اشکوں کا قطر
خونِ جگرِ دول تو ہوا رزقِ نفسِ کر اچھا ہی سرِ انگشتِ حسنی کا نصیب

دل میں نظر آتی تو ہوا اک بوندِ بھو کی

ناحق ہی قیامت کا تھیں خوفِ ابھی سے کچھ ظلم بھی کرتے ہو تو سہمے ہوئے جی سے
کرنے دو اگر کرتے ہیں شکوہ یہ کسی سے کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے جھوگی سے

یاں تو کوئی سُنا نہیں سنا دیا دسو کی

جب رخ نہ کیا ہو ترے تیروں نے ادھر کو کاٹا نہ ہو شمشیر نے سودا بھرے سر کو
کیا لطف ملے زبیت کا پھر ایسے بشر کو دشمن نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو

خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

مرزا غمِ دنیا سے رہا موت کا طالب چاہا کہ کرے ترک کہیں جانِ یہ قالب
ماصل ہوا مطلوب نہ برا سے مطالب صد جیت وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب

حسرت میں ہے ایک بتِ عربہ جو کی

۱۰۶

حسن ہی کا دل کو سودا چاہیے اشتیاقِ رشے زیبا چاہیے

رات دن شوقِ تمنا چاہیے چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے

یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

نشہ ہوتا ہی کسبِ ن کو سن رہا کچھ نہ ساقی کے سوا آئے نظر

لاکھ یہ پلٹتے رہیں آنکھوں پہر صحبتِ ندائے سے جب ہو خدا

جائے واپس کو کھینچا چاہیے

پاکے شمرہ چاہ کا دلِ بھول ہو گیا ہو دردِ غم سے مضمحل

اب تو یہ ہی اور دردِ حالِ سل چاہئے کسریے کیا سمجھا تھا دل

باکے باس سے بھی سمجھا چاہیے

مجرموں سے پردہ ہی دیوانگی یہ تنافر اور یہ ہم خانگی

ہم سے چھپنا ہی کوئی فرزانگی دوستی کا پردہ ہی بگائگی

منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

موت کا پاتا ہوں جو یا غیر کو رشک نے میرے ڈبویا غیر کو

رات دن کا غم ہو گویا غیر کو دشمنی نے میری کھو یا غیر کو
کس قدر دشمن ہو دیکھا چاہیے

پند میں ناصح نے بھی کر لی ہوس قید سے یاروں کیل کی ہوس
بار بار ہم نے بھی کر دیکھی ہوس اپنی سوای میں کیا چلتی ہوس
یار ہی ہو گا مہ آرا چاہیے

کب ہی مایوسوں کو اُمید نہید گوش زد ہوان کے کیونکر نہید
کچھ نہ پوچھو سرتوں کا اپنی بھید منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
ما اُمیدی اس کی دیکھا چاہیے

پیرزن نادم تھی اپنے قصد سے منہ تھا کیا اُس کا کہ وہ یونکے
آہی تھی یہ صدائے غیب سے غافل ان مہ طاعتوں کے واسطے
چاہئے والا بھی اچھا چاہیے

یہ فیسی اور تلاش خال و خد جستجوئے نازنین سروق
اس جنوں کی بھی ہوتا کوئی حد چاہتے ہیں غور دیوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

(۱۰۸)

کس طرح طو ہو رہ عالم امکاں مجھ سے میں تھکا ماندہ ہوں اور دور ہی جاناں مجھ سے
 ذرہ ذرہ دم وحشت ہو گریزاں مجھ سے ہر قدم دور ہی منزل ہو نمایاں مجھ سے

میری رفتار سے بھاگے ہی بیاباں مجھ سے

جبکہ دیباچہ سے کھٹکتے ہیں مضامین یکسر پھر یہ فرصت ہی کسے پیٹھ کے دیکھے دفتر
 اور ہی دام میں ابھی ہوئی ہی اپنی نظر درس عنوان تماشا بہ تغافل خوشتر
 ہو نگہ رشتہ شیرازہ مرگیاں مجھ سے

کیا کہوں کیسے بسر ہوتی ہیں غم کی راتیں میرے احبابیاں کی مجھے تکلیف نہ دیں
 بیکسی کامری اندازہ اسی سے کر لیں وحشت آتش دل سے شبِ تنہائی ہیں
 دود کی طرح رہا سا یہ گریزاں مجھ سے

میرے ماتم میں وہ جب آٹھ پہر ہو گریاں پھر خود آرائی و زینت کا وہ ساماں کیاں
 مٹ گئی سرمہ کی تحریر کہ ہیں آنکھ واں غم عشاق نہ ہو سادگی آموزِ بتاں
 کس قدر خانہ آئینہ ہی ویراں مجھ سے

چونکہ ہی دشت مرے پاؤں سے آغشتہ بخوں ذرے ذرے کو یہ دعویٰ ہے کہ میں غمگین ہوں
 کیوں چمکتے ہوئے چھالوں کو جو اہر نہ کہوں اثرِ آبلہ سے جادہ صحرائے جنوں

صورتِ رشتہ گوہرِ چرخِ افاغ سے

کاش ہر اک شب غم میں یہی بے ہوشی ہو تاکچہ آرام سے یہ ہوشِ باگز سے تو
اس نے تو خوب ہی پہچانی ہو راحتِ دل کو بے خودی بسترِ تہیدِ فراغت ہو جو

پڑے سایہ کی طرح میرا شبستاں مجھ سے

منہ قفل پہ ہیں آنکھ کے اراں سائے لکے ستریزِ نظر ہو تو کروں نطائے
تین گلیں سے کم تھکوا نہیں ہو پیارے شوقِ دیدار میں گر تو مجھے گردن مائے

ہو نگہِ مثلِ گلِ شمع پریشاں مجھ سے

کیا شبِ تار نے ڈھائی ہو قیامت ہو ہو چھوڑ دی سایہ نے بھی میری فاقیت ہو ہو
کتنی پر خوف ہو منزلِ گہِ فرقت ہو ہو بیکسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت ہو ہو

سایہ خورشیدِ قیامت میں ہو پنہاں مجھ سے

ادہِ حسن سے غیروں کو تو یوں مست کرے تشنہ لب رہیں دیدار کے جو طالب تھے
خوب نصاف کیا ساتی ہو شوقِ تو نے گردِ دشنِ ساغرِ صدفِ جلوہ رنگیں تجھ سے

آئینہ داری یک دیدِ حیراں مجھ سے

اگِ سینہ ہر زائیں بھڑکتی ہو اسد دیکھ کر برقِ جے دور سرکتی ہو اسد
دل میں بھی آتشِ جاں سوز دہکتی ہو اسد نگہِ گرم سے اک آگِ شپکتی ہو اسد

ہو چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

(۱۰۹)

دل میں وہ درد کہ جو اس کو دکھائے نہ بنے حال اپنا وہ زبوں جس کو چھپائے نہ بنے
بارغم میں نہ گرائی کہ اٹھائے نہ بنے نکتہ چیں ہی غم دل اس کو سنائے نہ بنے

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

گو بظاہر نہیں کچھ اس کا بلاناہ شکل ڈر مگر یہ ہو کہ ہٹ میں ہو وہ اپنی کامل
کہیں ہونا نہ پڑے اس کے نہ آنے سے فحل میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر ای جذبہ دل

اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

لذتِ جور و جفا کو کہیں وہ شوخ نہ پائے ضد نہ چڑھ جائے کہیں ایسی کہ پھر دل دکھائے
ہاتھ دانستہ کہیں ظلم سے ظالم نہ اٹھائے کھیل سمجھا ہی کہیں چھوڑ دے بھول نہ جائے

کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

خود تو رسوائے جہاں ہی یہ بد ذات مگر نیک نامی کو کہیں تیری نہ پہنچائے ضرر
راز داری کسے کہتے ہیں اسے کیا ہی خبر غیر پھر تا ہی لیے یوں ترے خط کو کہ اگر

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہو تو چھپائے نہ بنے

شاخ ہی تک ہی گل تر کا شگفتہ رہنا ہاتھ گلچیں کا پڑا اور وہ پرمردہ ہوا

چشم بد و روہ نازک ہیں کہیں گل سے سوا اس نراکت کا بُرا ہو وہ پھیلے ہیں تو کیا

ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

نور یہ مہر میں یہ مہ میں ضیا کیسی ہو کس کی بوہر گلِ نو خاستہ میں مخفی ہو
ہر طرف طرفہ تماشا ئے نظر بست ہی ہو کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہو
پروں چھوڑا ہو وہ اس نے کُٹھائے نہ بنے

غم سے گھل کر جگر و دل مرے اشکوں میں بہے میں نے اب تک تو ستم وعدہ خلافی کے سہم
منتظر کیوں ہوں تمہارا کوئی اب کدھ کہے موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ بہے

تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

ہیں برے پیچ میں تقدیر سے ہم آئے ہوئے بات بنتی نظر آتی نہیں تدبیروں سے
کر دیا ہی ہیں مجبور بہت قسمت نے بوجھ وہ سر سے گرا ہو کہ اٹھائے نہ اُٹھے

کام وہ آن پڑا ہو کہ بنائے نہ بنے

عشق کی خاک کے کوئی ستایش غالب الاماں قہر اس برق کی تابش غالب
بارہا کی ہو یہ ہرزانے گزارش غالب عشق پر زور نہیں ہو یہ وہ آتش غالب

کہ لگائے نہ لگے اور چھبائے نہ بنے

آیا ہرزا کو جسے دیکھتے ہی غش غالب تم نے دیکھا نہیں وہ شعلہ سرکش غالب

باب الفت میں عبث تم ہو مشوش غالب
عشق پر زور نہیں ہی یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے

*

شبِ فراق میں راحت دے بے حساب تھے
لگی ہو آگ جو سینہ میں اس کو آب تو دے
نجات غم سے وہ پردہ نشیں شباب تو دے
وہ آگے خواب میں تسکین اضطراب تو دے
وے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

جواب غیظ و غضب سے ہر ایک کو دینا
ہو ایک آن میں و نون جہاں سے کھوینا
وہ بھر کے سانس جگر میں چھری چھو دینا
کرے ہو قتل لگا وٹ میں تیسرا رو دینا
تسری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے

لگا کے منہ سے عطا کوئی جامِ کراہم کو
امیدوار نہ یوں صبح و شام کراہم کو
جواب تلخ ہی سے شا دکام کراہم کو
دکھا کے جنبش لب ہی تمام کراہم کو
نہ دے جو پوسہ تو منہ سے کہیں جواب دے

خیال چھوت سے بچنے کا ہو نہ عادت ہو
نہ اجتناب کسی سے نہ کچھ عداوت ہو
ہمیں سے اک تجھے پرہیز اور کراہت ہو
پلا دے ادکسا ساقی جو ہم سے نفرت ہو
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب دے

شب س کی بزم سے اغیار یوں لہلہ گئے کہ پاؤں اٹھ گئے اور چوڑھی وہ بھول گئے
 قبول خدمتِ مرزا ہوئی وہ غول گئے اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں بھول گئے
 کہا جو اس نے مرے ہاتھ پاؤں داب توئے

*

(۱۱۱)

اُدھر ناگفتہ بہ حالے بون و خوارِ بستر ہو ادھر ہوئے تن خود میرے حق میں غارِ بستر ہو
 دل بے تاب مضطرب باعثِ آزارِ بستر ہو پیش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہو
 مراسرہ شیخ بالمش ہے مرا تن بارِ بستر ہو

حقیقت اشک کی اور دل کی تم سے کیا ہیں ہو مگر ماں مختصر سن لو کہ وہ کیا شی ہو یہ کیا شی
 ہمارے ناز پروردوں میں ہیں تو نہاں ہو شرکِ سہرہ صحرا دادہ نور لبین و ہن ہو

دل بے دست و پا افتادہ بر خورِ دایہ بستر ہو
 زہے قسمت کہ تم یوں بے بلائے مسیے گھر آؤ مرے بیت الحزن کے جاگ اٹھے ہیں نصیبِ ناتو
 مرض کا اپنے بڑھ جانا مبارک ہو گیا مجھ کو خوشا اقبالِ بخوری عبادت کو تم آئے تو
 فردغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہو

ہوا اندھیر گھر میں کیا بلا فرقت کی ات آئی در و دیوار پر ہو کس غضب کی تیرگی چھائی
 مگر ماں گھر نے بستر کی بدولت و ششی پائی بہ طوفاں گاہ خوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی

شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بسترِ
 خدا کا شکر ہو تقدیر ہو جاگی ہوئی اپنی پھر اس کے خواب میں آنے کی حسرتیں ہیں ہوتی
 بنائیں کیا بھی گل ہی تو وصلِ یار کی شب تھی ابھی آتی ہو بالشمس کی نفی مشکلیں کی
 ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بسترِ
 ہوا ہو مبتلا مرزا عجیب آزار میں غالب رہا کچھ بھی نہ باقی اس کی جانِ زار میں غالب
 نہیں ٹھنے کی بھی طاقت اب بن بزار میں غالب کہوں کیا دل کی کیا حالت ہو ہجرِ یار میں غالب
 کہ بیانی سے ہر اک تارِ بسترِ غارِ بسترِ

(۱۱۲)

بنی ہو یا تاب نہ گئے کہیں ان بن نہ ہو جائے محبت کی جگہ نفرت ٹھکے پرفن نہ ہو جائے
 رہا غرہ تو میرا نفس ہی رہن نہ ہو جائے خطر ہو رشتہ الفتِ رگ گردن نہ ہو جائے
 غرور و دوستی آفت ہو تو دشمن نہ ہو جائے
 کمالِ فصلِ گل کہتے ہیں اس کو میرزا غالب کہ ہو ہر شجر پہنچے ہوئے گل کی قبا غالب
 سرگین کھلیں دو چار گل تو کیا مرزا غالب سمجھ اس فصل میں کوتاہی نشو و نما غالب
 اگر گل سرو کے قامت پہ پیرا ہن نہ ہو جائے

کیا جانے اصول ہو نہیں ہو
آہنگ بھی کوئی طی نہیں ہو
باقاعدہ کوئی شے نہیں ہو
فریاد کی کوئی لہ نہیں ہو

نالہ پابند فی نہیں ہو

گلشن کو غرض نہیں جوڑے
کیا معنی ہیں پھر کدے مڑے
کشکول کا کام کیا نہ لیں گے
کیوں بولتے ہیں باغبان تو بنے
گر بارغ گداے ہو نہیں ہو

جلوہ تیرا ہی چارہ سو ہو
ہر ایک کو تیری جستجو ہو
تجھ سے ہی گلوں میں رنگ ہو
ہر چند ہر ایک شے میں تو ہو

پر تجھ سے تو کوئی شے نہیں ہو

بے جا ہو خودی و خود پرستی
اک ہم و خیال ہو یہ بستی
لاشی ہو یہ اوج اور پستی
ہاں کھا یومت فریب ہستی

ہر چند کہیں کہ ہو نہیں ہو

پروستہ ہر ایک شے ہو ضد سے
ہوتی ہو نشاط بعد غم کے
خواہاں ہو اگر الم سے چھوٹے
شادی سے گزر کہ غم نہ ہو دے

اردی جو نہ ہو تو دی نہیں ہی

کچھ وہم مگر تجھے ہی زاہد انکار شراب سے ہی زاہد

ملتی یہ شے کسے ہی زاہد کیوں ردِ قرح کرے ہی زاہد

موی یہ مگس کی قی نہیں ہی

مرا ترا ہم قدم ہو غالب دھیان اس کو یہ مہدم ہو غالب

دم کہتے ہیں جس کو دم ہو غالب ہستی ہی نہ کچھ عدم ہو غالب

آخر تو کیا ہو ای نہیں ہی

*

(۱۱۲)

کچھ رشک قیبوں ہی سے تنہا نہیں کرتے اپنی بھی نظر سے انھیں دیکھا نہیں کرتے

جان آئے جو لب بھی تو پردہ انہیں کرتے ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے

مرتے ہیں ولے اُن کی تمنا نہیں کرتے

وہ غیر جو کہتے ہیں یہ کہنا ہی زبانی لیکن ہی قیبوں سے لگاؤ کی نشانی

ہم سے کوئی آسان ہیویں بات بنانی در پردہ انھیں غیر سے ہی ربط نہانی

ظاہر کا یہ پردہ ہی کہ پردہ انہیں کرتے

قابو نہ کسی شخص کا تم پر ہی نہ بس ہی مانو تو یہ مرا کی نصیحت تھیں بس ہی

باز آؤ اگر مہر و وفا سے کھیں من ہو یہ باعثِ فویدہ یں اربابِ ہوس ہو
غالب کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کہتے

۱۱۵

مرے سبب سے یہ خستہ جگر ہو کیا کہیے غریب کشتہ تیغِ نظر ہو کیا کہیے
فریبِ حسن سے یہ بے خبر ہو کیا کہیے دیا ہو دل اگر اس کو بشر ہو کیا کہیے
ہو ارقیب تو ہونا نہ ہو نہ بر ہو کیا کہیے

بدن سے جان کسی طرح جائے بن نہ ہے فراقِ جسم کا صدمہ اٹھائے بن نہ ہے
مگر میں تو یہ پھر کئی مستائے بن نہ ہے یہ صدمہ کہ آج نہ آئے اور آئے بن نہ ہے
فضائے شکوہ ہیں کس قدر ہو کیا کہیے

ضرور ہو کوئی موجودگی کا اس کی سبب اسی کو گشت میں پایا وہاں گئے ہم جب
کچھ اور شغل ہی اس کو نہیں ہو رُز و شب رہے اویں گہر و بیکہ کہ کوئے دوست کی اب
اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہو کیا کہیے

ہمارے سر پہ تھا جب تاجِ شباب کا آسیب نہ راہِ عشق کا سد چھا کبھی فراز و نشیب
اس اک گمان سے جاں ہول کو شکریہ نہ ہے کرتہ کہ یوں سے رکھا ہو ہم کو فریب
کہ بن کہے ہی انھیں نب خبر ہو کیا کہیے

ہمارے درد و الم کا ہوا کسبِ ن کو خیال بلا کے گھر بھی پونجی نہ وجہ رنج و ملال
وہ بے سمجھ نہیں یہ بھی ہو ایکساں کی چال سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں ہر ش حال
کہ یہ کہے کہ سیر رہ گزر ہو کیا کہیئے

تمہارے افس و محبت کا ہو عجبِ حوال کہ بات بات میں ہو دوستوں سے رنج و ملال
تمہیں سے ہم بھی گروں تو ہو نباہ محال تمہیں نہیں ہو سیرِ رشتہ وفا کا خیال
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہو مگر ہو کیا کہیئے

کبھی کیا بھی جو کچھ عرض حال دل ہم نے تو مسکرائے کہا کیوں ہوئے ہو دیوانے
فصل ہو جیئے ہر وقت دوبہ و اُن سے اُنہیں سوال پُچھ جنوں ہو کیوں لڑیئے
ہمیں جواب سے قطع نظر ہو کیا کہیئے

کسی کو ہم سے اگر شکاف ہو کیا کیجے حسد کی آگ گزشتہ زن ہو کیا کیجے
جہان کی یہی رسم کہن ہو کیا کیجے حسدِ سزائے کمال سخن ہو کیا کیجے
ستم بہائے متلع ہنر ہو کیا کہیئے

کئے جہان میں ہر ایشکل اُس کے دن ہزار عیب لگاتے ہیں اُس کو بد باطن
بُرا بُرا اُسے کہتے ہیں سب جوان و مومن کہا ہو کس نے کہ غالب بُرا نہیں لیکن
سوائے اس کے کہ آشفۃ سر ہو کیا کہیئے

جب تک زاد تھا کب تھی پریشانی مجھے
کھینچ کر زنداں میں لائی میری جولانی مجھے
تھی عدم میں ہر طرح حاصل تن آسانی مجھے
دیکھ کر دہ پرہ گرم دامن افشانی مجھے

کر گئی وابستہ تن میری عریانی مجھے
یوں مرا سینہ دیائے وہ مری قسمت کہاں
اور گلے پر اس کے ہاتھوں ہو یوں خجروں
اور کیا اس کے سوا ہوش نصیبی کا نشان
بن گیا تیغِ گدا و یار کا سنگِ فساں
مر جا میں کیا مبارک ہو گراں جانی مری

رات دن آتا ہو جب بس کا تصور پڑی پڑی
ہوں اسی دھن میں یہی مجھ کو لگی رہتی ہو
مجھ کو عرضِ حال میں مانع نہیں پھر کوئی شے
کیوں نہ ہو بے التفاتی اس کی خاطر جمع ہو

جاننا ہو مجھ پر کس شہنائے پہنانی مجھے
میری بربادی تو قدرتی تقدیر کی ہی تھی
اس پطرہ یہ ہوا گھر کی بلا سر پڑ گئی
یہ ہونی اچھی عنایت کا تب تقدیر کی
میرے غم خانے کی قسمت جب تم ہونے لگی
لکھ دیا منجملہ اسبابِ ویرانی مجھے

ملتی جلتی ہو فناں اس کی مری فریاد سے
شوق سے سنتا ہوں اپنا ہم نوا پا کر اسے
ڈال رکھا ہو پریشانی میں اس کے ہم نے
بدگماں ہوتا ہو وہ کافر نہ ہوتا کا مشکے

اس قدر ذوقِ نواسے مرغِ بستانی مجھے

چرخ کے ہاتھوں نہ پایا جین میں جب تک جیا داؤں جب اس کا چلا کچھ ظلم ہی مجھ پر کیا

تنگ آکر زیست سے جامِ اجل آخر پہنچا واسے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا

لے گیا تنہا گورینِ وقِ تن آسانی مجھے

یہ قریبِ روسیہ یوں ہی اگر دوساڑی جھوٹ پر رغبت لائے گا کہ خود مبار پڑی

منتظر رکھنا کسی کو یہ بھی کوئی ناز ہی وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہی

تم نے کیوں سوچی ہو میرے گھر کی بھائی مجھے

چاہیے بھائی سے یوں بھائی کو ہر زادوستی ہو جو اس کو خرمی تو خرمی ہو اس کو بھی

جس طرح غالب نے کی اس شعر میں ظاہر خوشی دی مے بھائی کو عن نے از سر نو زندگی

میرزا یوسف، یوسف غالب یوسف ثانی مجھے

*

(۱۱۵)

خود فراموشی ہوئی وقتِ مسرت کب مجھے دل ہی جب لال ہو پھر فرحت کیا مطلب مجھے

لب پر اس کا نام تھا کچھ در پہنچا جب مجھے یاد ہی شادی میں بھی ہنگامہ یار ب مجھے

سچا زابہ ہو اہی خندہ زیر لب مجھے

کہہ گیا دل رفیع دل سے ہو گیا رنج و عن کر رہا ہی پریش احوال ہر غصہ بہن

باتیں جاتی ہی ہوتا ہوں کوئی حرف نہ سن
ہو کشادہ خاطر و ابستہ در رہن سخن

تھا طلسمِ قفلِ ایجب خانہ مکتب مجھے

اک طرف چپکا پڑا تھا کیا نے زنداں میں تھے
کیوں نہ آئیں یاد دہانہ کردہ دن آرام کے
مہلت اب ہم بھر نہیں آوارگی دشت سے
یارب اس اشتعل کی داد کس سے چاہیے

رشتہ سائیش پہ ہوں زندانیوں کی اب مجھے

رات دن رہتی ہو اکھڑے لوں اک جئے توں
حال دل بھی ہو گیا ہو کثرتِ غم سے زبوں
عمر گزری ہو کہ میں اس فن کا خو کردہ ہوں
طبع ہو مشاق لذتہائے حسرت کیا کروں

آرزو سے ہو شکست آرزو مطلب مجھے

مجھ سے فرماتے تھے طنز اکیوں تم ایسے ہو گئے
کیا ہوا مرزا بھیس دیوانے کس کے ہو گئے
اب تو حضرت کیلئے نمودوں یہ تھر سے ہو گئے
دل لگا کر آپ بھی غالب بھٹی سے ہو گئے
عشق سے آئے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

(۱۱۸)

نکالِ علم اہل انجمن کی آزمائش ہو
ہر کا امتحان ہوا اہل فن کی آزمائش ہو
ہر اک خوشن و مشتاق کہن کی آزمائش ہو
حسن و رشاد میں اہل سخن کی آزمائش ہو
چمن میں خوشنویان چمن کی آزمائش ہو

محن میں ہر گرفتار محن کی آزمائش ہو گداز و سوز میں شمع لگن کی آزمائش ہو
 نفس کی قید میں مرغِ چین کی آزمائش ہو قد و گیسو میں قیس کو بہن کی آزمائش ہو
 جہاں ہم ہیں وہاں اور سن کی آزمائش ہو

بہیں ایسا نہ ہو محنت ہو اس کی رائیگاہ نہ جئے خوں ہو جئے شیر کے بدلے واں آخر
 غم شیریں سہمے گا کس طرح وہ نیم جاں آخر کریں گے کو بہن کے حوصلے کا امتحاں آخر
 ہنوز اس خستہ کے نیرِ فتن کی آزمائش ہو

سُنی ہو اس نے کب مقرب کی آہِ سحر گاہی گنگھا کر پوئے یوسف اس نے کب بس کی خوشی چاہی
 ہوئی ہو اور ہی مطلبِ کنناں کی طرف راہی نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی
 اسے یوسف کی پوئے پیرین کی آزمائش ہو

یہ کیا کرتے ہو تم ضبط و تحمل کے غلط دعوے یقیں جاؤ کہ ہوش اڑ جائیگے جب اس کو بھوگے
 جسے دعوئے ہوا ہلِ بزم میں بے سنبھل بیٹھے وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کہ غافل تھے
 شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہو

نشانی دو ہیں جس کو بھی اڑائے اس کا تیرا کر تو پھر شکافِ راندازی میں اس کی کچھ کیوکر
 کہاں کو کھینچنا ہی اُس کا اکلِ صانِ آدم ہے ہے دل ہی میں تیرا چھا جگر کے پار ہو بہتر
 غرض شستِ بٹناؤں لگن کی آزمائش ہو

بظاہر تو یہ دونوں ایک ہی سبت ہیں سودائی مگر ریم پرستش مختلف دونوں نے ٹھیرائی
 عبت گردن ہر اکے رشتہ الفت میں بندھوائی نہیں کچھ سجدہ و نماز کے پھندے میں گیرائی
 دفا داری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہو

نیچہ ناشکیبائی کا آخر کیا ہوا غافل تر پنے سے کہیں آسان ہو سکتی ہو بہ مشکل
 نہ ہو جائے کہیں تجھ پر کوئی تازہ بلا نازل پڑا رہا دل وابستہ بیانی سے کیا حاصل
 مگر پھر تاب زلف پر شکن کی آزمائش ہو

ہمارا قصہ تھا چکھیں کسی دن ہم بھی اس سم کو مرہ لینے نہ پائے خود بخود گھٹنے لگے ہم تو
 نہاں کا ذکر کیا اس کا اثر آگے تو پڑھنے دو رگ پڑی میں جلتے نہ ہر غم تب کھینچے کیا ہو
 ابھی تو تلخی کام و دہن کی آزمائش ہو

سنا تو ہوا انھوں نے یہ ارادہ کر لیا غالب کہ وہ مرزا سے عہد و پیمان غالب
 گلاب کھینچے یہ چرخ لائے رنگ کیا غالب وہ آئیں گے مے گھر وعدہ کیسا دیکھا غالب

نئے فتنوں میں اب چرخ کہن کی آزمائش ہو

۱۱۹

اگر وہ روٹھتا ہو کب منا یا جائے ہو مجھ سے سر رہا بھی جاتا ہو تو کنیا جائے ہو مجھ سے
 غرض جتنا مانتا ہوں بگڑتا جائے ہو مجھ سے کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گڑ جائے ہو مجھ سے

بھائیں کر کے اپنی یاد شرملائے ہو مجھ سے

نظر آتا ہو خوابِ صبح تو قبیر اٹھی ہو بگڑ جاتا ہو بن کر کام کیا تقدیر اٹھی ہو

مرے سب کام اٹھے ہیں میری تدبیر اٹھی ہو خدا یا جذبہ دل کی مرے تاثیر اٹھی ہو

کہ جتنا کھینچتا ہوں او کھینچتا جائے ہو مجھ سے

اُسے کیونکر سناؤں حالِ دل ہو سخت حیرانی پریشانی کا مضمون اور بیان میں ہو پریشانی

کھلائے دیکھئے کیا گل میرے قاصد کی دانی وہ بدخوا اور میری داستانِ عشق طولانی

عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہو مجھ سے

یہ میری سرگردشتان کے لیے جھوٹی کہانی ہو انھیں سننے سے نفرت ہو یہاں طعنی لسانی ہو

مجھے دشوار اپنے دل کی کیفیت بتانی ہو ادھر وہ بدگمانی ہو ادھر یہ ناتوانی ہو

نہ پوچھا جائے ہر آن سے نہ بولا جائے ہو مجھ سے

ہماری بہت امید و تھوڑی بدولت ہو قضا کا سامنا ہو کیا بلا ضعفِ نفاہت ہو

خیالی زندگی ہو ورنہ کیا جینے کی صورت ہو سنبھلنے دے مجھے ایسا اُمید ہی کیا قیامت ہو

کہ دامنِ خیال یا رچھوٹا جائے ہو مجھ سے

گوارا دل کو یہ کب ہو کہ نکھیں اس کو اس دینِ تقاضا رشک کا یہ ہو وہ آنکھوں میں ہے ساکن

وہ جب جلوہ نما ہوگا تو ہوگا عشر کا وہ دن تکلفِ برطرفِ نظارگی میں بھی ہو ہی سیکن

وہ دیکھا جائے کب ظلم دیکھا جائے ہو مجھ سے

سوچ رکھا تھا میں نے عشق کو کٹ ل گئی دل کی کہاں کٹ ل گئی یہ تو مصیبت پر گئی مٹی

نہ کیا مجھ کو اس کی معرکہ آرائیوں کی بھٹی ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نہر عشق میں نہی

نہ بھاگا جائے ہو مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہو مجھ سے

مجھے آتا ہے یہ خوابے یاشاں کیا نظر غالب بنے گی دیکھیے کیسی دل بے تاب پر غالب

یہ کیوں اس شکست ہو خون مرزا کا جگر غالب قیامت ہو کہ ہوئے مدعی کا ہم سفر غالب

وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہو مجھ سے

❖

ردش میں جو ہو گنبدِ خضر امرے آگے (۱۲۰) فانوسِ خیالی کا ہو نقشِ امرے آگے

دارِ ارض کو اک گیند کا رہتا امرے آگے بازِ بچہ اطفال ہو دنیا امرے آگے

ہوتا ہو شبِ روزِ تاشا امرے آگے

بالبلہ ہو گنبدِ گرداں مرے نزدیک فدے سے بھی کمتر ہو بیاباں مرے نزدیک

شعبہ نیرنگی و دورانِ مرے نزدیک اک کھیل ہو اورنگِ سلیمان مرے نزدیک

اک بات ہو اعجازِ مسیحا مرے آگے

ارض ہیں او نام تو اجسام ہیں مستو ہو نام ہی نام ان کا حقیقت ہیں سب دور

ہر رنگ میں موجود ہی صرف نایک وہی نور جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور

جز وہم نہیں رستی اشیاء مرے آگے

اُڑتا ہی بیابان کا خاکا مرے ہوتے اٹھتا ہی بگولے پہ بگولا مرے ہوتے

اشکوں سے ہی سیلاب کا نقشبنا مچے ہوتے ہوتا ہی نہاں گردیں صحر امرے ہوتے

گھسٹا ہی جہیں خاک پہ دریا مرے آگے

دیکھے تو کوئی دل کا ٹپنا ترے پیچھے کیا کہنے گزر جاتی ہی کیا کیا ترے پیچھے

جیسا مجھے دُشوار ہی گویا ترے پیچھے مت پوچھ کہ کیا حال ہی میرا ترے پیچھے

تو دیکھ کہ کیا رنگ ہی تیرا مرے آگے

ہوتا ہوں میں جس وقت میرا ہے سرشار اُٹھتے ہیں حجابات عیاں ہوتے ہیں سراسر

ہی نشہ سے وابستہ گہر ریزی افکار پھر دیکھیے اندازِ گل افشانی گفتار

رکھ دے کوئی پیانہ و صہبا مرے آگے

رہتا تھا شنب و روز اسی بات پہ جھگڑا ذکر اس کا کرے کوئی مجھے کب تھا گوارا

اب لاکھ کوئی ذکر کرے کچھ نہ کہوں گا فزیت کا گماں گزرے ہی بین شک سے گزرا

کیونکہ کہوں لو نام نہ اس کا مرے آگے

اسلام ہو مانع جو مجھے دُور کے لے کفر ہر خندِ عقیدت سے جگہ آنکھوں میں نے کفر

حاضر ہے خدمت کو کمر باندھ لئے کفر
ایساں مجھے روکے ہو جو کھینچے ہو مجھے کفر
کبہ مرے پیچھے ہو کیسا مرے آگے

یہ وہ ہوں کہ جس کام کو چاہا نہ رکھا کام
اس شوخ کے آگے نہ چلا پر نہ چپ لا کام
حیرت ہو کہ کیوں اپنی تمنا میں ہوں نا کام
عاشق ہوں مہشوق فریبی ہو مرا کام
مجھوں کو بُرا کہتی ہو لیسی مرے آگے

وقت میں گزرتے تھے جو سوطح کے صدمے
کرتا تھا دھار و روح کہیں جسم سے نکلے
اب ان سے جو ملنا ہوا دی جان خوشی سے
خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شبِ بحرِ اَل کی تمنا مرے آگے

موجود ہو جو سوزِ دروں کا ش یہی ہو
ہو جس قدر آبِ حیاتِ جنوں کا ش یہی ہو
اب تک ہو جو کچھ حالِ نبوں کا ش یہی ہو
ہو موجزنِ اک قلزمِ غل کا ش یہی ہو
آتا ہو ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

ظاہر ہو نزاع میں بھی دافعِ غم ہو
اٹھواتے ہو کیوں پاس سے کیا یہ کوئی تم ہو
عہدہ کہ یہ ہوتا وہ دم مرگِ ستم ہو
گو ہاتھ کو جنبش نہیں لکھوں میں تو دم ہو
رہنے دو ابھی ساغرِ دینا مرے آگے

وابستہ ہو اس ذات سے جو ناز ہو میرا
اس امر میں ہر زاویہ ہم آواز ہو میرا

ہم کار ہی اور ہندم و دمناساز ہی میرا ہم پیشہ وہم مشرب و ہمارا ہی میر
غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

(۲۲۱)

امید کیا ہی جو کچھ اپنا ماجرا کہیے ہماری بات کو کب آپنے سنا کہیے
کروں جو شکوہ تو پھر کیا مری خطا کہیے کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے
تھیں کہو کہ جو قسم یوں کہو تو کیا کہیے

اگرچہ حسن کے جو رجو جہا ہی پور ہیں حسین انھیں سے تو آراستہ نہ رہیں
خدا نخواستہ کب یہ تمھارے جو ہریں نہ کہیوں سے پھر تم کہ ہم ستم گویں
مجھے تو غواہی کہ جو کچھ کہو حجب کہیے

جو آشنا ہو وہی آشنا کے گھر جائے نہ بڑھ سکے گا قدم کوئی غیر اگر جائے
جھے ہو جس سے تعلق وہ بے خطر جائے وہ نیست تر سہی پر دل میں جبکہ تر جائے
نگاہ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے

ہزار سینے کو چھلنی بنائے زخم سناں کٹا و دل میں مگر تیر کو جو دخل کہاں
کھلا ہوا ہو جو راحت ہو وہ راحت جاں نہیں فریہ راحت جو راحت پیکان
وہ زخم تیغ ہی جس کو کہ دل کٹا کہیے

بشر کو چاہیے جو صاف سینہ کیلئے سے
 برا ہی ظلم و ستم کو ہو ظلم کے بدلے
 مزا تو یہ کہ بن جاؤ دوست دشمن کے
 جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنیے
 جو ناسنرا کہے اس کو نہ ناسنرا کہیے

کبھی جو بیٹھ بھی جاتے ہیں ہم غزل لکھنے
 تو بار بار تقاضے یہ ہوتے ہیں دل کے
 کہ آج خوب ہی جی بھر کے دیے دکھڑے
 کہیں حقیقتِ جاں کا ہی مرض لکھیے
 کہیں مصیبتِ ناسازی دوا کہیے

کبھی بیانِ لالِ دلِ سزیں کیجئے
 کبھی فغانِ جہاں سوزِ دانتیں کیجئے
 کبھی روایتِ ہجرِ بستِ حسین کیجئے
 کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجئے
 کبھی حکایتِ صبرِ گریزِ پا کہیے

نجاتِ غم ہے جو ہے اس کو اور کیا دیجئے
 نثار کیجئے دل کو یہی صلا دیجئے
 جو سہرا اُسے تو جلاؤ کو دُعا دیجئے
 رہے نہ جان تو قاتل کو خون بہا دیجئے

کئے زبان تو خنجر کو مر حبا کہیے

جو یار پاس نہیں ہو خیالِ یار تو ہو
 تصور اس کا شبِ غم میں غمگسار تو ہو
 یہ اک فریقہ تسکینِ جانِ زار تو ہو
 نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہو

روانیِ روش و مستی ادا کہیے

جو فرش گل نہیں چاہی تو سبز زار تو ہوا
چمن نہیں تو مرا سینہ داغدار تو ہوا
جگل نصیب میں پئے نہیں ہو خار تو ہوا
نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہوا
طراوت چمن و خوبی ہوا کہیے

نجات غم سے نہ ہوگی یقین تھا غالب
مقامِ شکر ہو میرے ٹلی بلا غالب
بہی ہو مسکِ منزل بھی میرا غالب
سینہ جبکہ کنارے پہ آگیا غالب
خدا سے کیا ستم و جور نا خدا کہیے

(۱۲۲)

با آبرو تو خلق میں کیا خاک ہو گئے
تھے غرقِ بحرِ سرم کہ پیراک ہو گئے
مشہور اک زمانہ کے چالاک ہو گئے
رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے
دسوئے گئے ہم تنے کہ بس پاک ہو گئے

تھی خوشی کی چاٹ بیڑب لگی ہوئی
پینے میں ہم نے آٹھ پہر کچھ کسی نہ کی
آخر کو رنگ لاکے رہی اپنی مفیسی
صرف بہائے ہوئے آلاتِ خوشی
تھے یہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

لچھے نہیں ہو اب تو ذرا بھی کسی سے تم
ہر اک سے پیش آنے لگے دل لگی سے تم
جا جا کے اب تو تھے ہو ہر آدمی سے تم
رسوائے دہر کو ہوئے آوارگی سے تم

بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

جن کو نہیں ہو عاشقی و عشق کی خبر
اوتے ہیں متعرض وہی تاثیر آہ پر
گلشن میں دیکھئے اثر آہ الحذر
کہتا ہو کون نالہ لبیل کو بے اثر

ہر دے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

دل میں وہ آگ کتنی کہ سراپا بھلا دیا
ہستی کو عاشقوں نے دیا خاک میں ملا
پایا انھوں نے زندگی شمع کا مزا
پوچھے ہو کیا وجود و عدم اہل شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

کرتے تھے جی ہی میں مریخ و غم گلہ
تھا عالم خیال ہی میں دم بدم گلہ
جرات جو پھر بڑھی تو ہوا ہم کو سہم گلہ
کرتے گئے تھے اس کے تغافل کا ہم گلہ

کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

مرزا جو دل تھا اس کے لیے جئے بود و باش
کرتے ہی قتل اس کو کیا پہلے پاش پاش
ظالم نے خود ہی کرو یا پردہ ستم کا فاش
اس رنگے اٹھائی کل اس نے ہند کی لاش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غم ناک ہو گئے

مجھ کو غم سے رہا کرے کوئی غم گساری ذرا کرے کوئی

لاکھ دعوے کیا کرے کوئی ابن مریم ہوا کرے کوئی

میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

حلقہ زلف چلتی زنجیر دونوں ابرو ہیں خنجر و شمشیر

جلوہ حسن وہ کہ برق نظیر چال جیسی کڑی کمان کا تیر

دل میں ایسے کے جا کے کوئی

میرا قاتل مہی نگار سہی دو جہاں میں قصور وار سہی

خوں بہا اس کے سر ہزار سہی شرع و آئین پر مدار سہی

ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

اس کی محفل تمام گونگی ہو کچھ کہے کس کو تاب اتنی ہو

لب ہلائے مجال کس کی ہو بات پرواں زبان کشتی ہو

وہ کہیں اور شنا کرے کوئی

ذکر ہوتا ہی جا بجا کیا کچھ غور کرتے ہیں آشنا کیا کچھ

کہہ گیا دل کا اندھا کیا کچھ بسا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

جو لڑے اس سے تم لڑو نہ کبھی رکھو آزاد زندگی اپنی

کیا ضرورت جواب دینے کی نہ سنا کر بُرا کہے کوئی

نہ کہو گے بُرا کرے کوئی

کوئی تم کو جو دے اذیت بھی درپنہ انتقام ہو نہ بھی

رہنمائیِ خلقت ہو اچھی روک لو گے غلط چلے کوئی

بخش دو گے خطا کرے کوئی

جو بظاہر ہیں خرم و خورند وہ ہیں ناشاد تم سے بھی نہ چند

ہو دیر احتیاج کس پر بند کون ہو جو نہیں ہو حاجتمند

کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیوں نہ شکوہ کریں غدر سے کھینچ لایا ہو دشت میں گھر سے

رہ گئے اُمیدِ خاک رہ پھر سے کیا کیا خضر نے سکندر سے

اب کسے رہنا کرے کوئی

ان سے جب تانک میٹھی غالب شکوہ سنجی کی تو رہی غالب

حق ہو ہر زاکی غاشی غالب جب توقع ہی اٹھ گئی غالب

کیا کسی سے گلہ کرے کوئی

(۱۷۳)

فلک کے جوڑے غم کیا ہی اور ہم کیا ہی یہ میری تاک میں اور رہی ستم کیا ہی
جو مویں کی ہو سلامت تو پھر الم کیا ہی بہت سی غم گیتی شراب کم کیا ہی
غلام ساقی کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہی

تھارے قول ہیں کیا چیز اور قسم کیا ہی مال اس کا ستم ہی تو یہ کرم کیا ہی
ذلیل ہو گا کسی دن اُسے بھرم کیا ہی تمھاری طرز و روش جانتے ہیں ہم کیا ہی
رقیب پر ہی اگر لطف تو ستم کیا ہی

بچو پیوں کے خیالات خام ہیں بے سود نہ سعد و نحس نہ ان کے شکنجے کا وجود
کسی پہ کھل نہیں سکتی مشیتِ مسبود لکھا کرے کوئی احکامِ طالعِ مولود
کسے خبر ہی کہ واں جنبشِ ستم کیا ہی

کرے حلف سے بھی وہ بہت جو ترکِ روجھا مجھے یقین نہ آیا نہ آئے گا اصلا
خدا سے منحرف اور منکر جزا و سزا نہ حشر و نشر کا قائل نہ کیش و ملت کا
خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہی

ہوئی ہو ہر سیماں کی عدل سے محکم دکھائی دیتا تھا عالم یہ جام پر تھا بھرم
انہیں صفات سے دونوں کا ہو جو وجود ہم وہ داد و دید گر انما یہ شرط ہی ہمدم

وگرنہ مہر سلیمان و جام جم کیسی ہی

بلا کسی نے کہا ہر کسی نے دام اُسے
 کسی نے دی اُسے تہ تیغ نیشِ عقرب سے
 کھلے نہ جب تو ممّا اُسے نہ کیوں کہیے
 کٹے تو رات بچ کاٹے تو سانپ کہلائے

کوئی بتاے کہ وہ زلفِ خمِ بخم کیا ہو

جھپیٹنے کا اردو زبان میں بانی
سخن وروں میں ہی مرزا دہ غرود لاشانی

یقین ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

۱۲۵) ہوں کیونکہ خوشی نکلی نہ دل سے بچ و غم نکلتے
 یہ سب نکلتے مگر افسوس کیونکہ یہ اہم نکلتے
 ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر تم نکلتے
 پوری حسرتیں نکلیں نہ ارمان یک قلم نکلتے

بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ہوا جلا د کو کیا وہم ر و سا کس لیے خنجر
 نہیں تھا ہوا بانی کہ خنجر لب ہی کرے تر

بہر جب تکٹ خوں قاتل کے سر ہوں ہا کیونکر
 ڈبے کیوں میرا قاتل کیا ہے گاں گی دن پر

وہ توں جو پھر ترے عمر بھر لیں وہ ہم سب کے

نوٹ اس غلام کے کہ اگر شرفیاب احمد سید بنار صاحب کے ہاتھ سے بیڑا دوڑے تو پہلے حصہ اول میں خط اول اور دوسرے حصہ میں خط ثانی
بکرا رہیں درج ہیں۔

کبھی ہم بھی تھے تیرے سایہ دیواریں اکں رسائی پر ہماری شک تے تھے سبائیں جن
ہمیں جب نے اٹھوایا دے سے یاد ہو وہ دن نکلتا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

ترے گیسوے پیچاکے مقابل کب تے اقد تھا زمانہ فنی مگر اک فتنہ ششرا سے سمجھا
غینمت ہو کہ اس پیچیدگی نے رکھ لیا پردا بھر م کھل جائے ظالم تیرے قامت کی واری کا
اگر اس طرہ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

عجیب کیا ہو ہمارا خط اگر اس کو پسند آئے پھڑک جائے عبارت کچھ کر اور قدر فرمائے
نہ پہونچیں ہم تو کیا تحریر ہی اپنی پہنچ جائے مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

ہوئی ہر رنگ میں جب پیر بخانہ کو ناکامی نہ دور جام سے حاصل ہوا کچھ غیر بدنامی
نظر جھٹائی و کشوں کے طرف میں غامی ہوئی اس ور میں منسوب مجھ سے یادہ آشنائی
پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جام جم نکلے

کریں کیا خاک جرات حالِ رد و غم ٹٹانے کی کہاں بہت کسی کو اپنے زخم دل دکھانے کی
کریں کیا شکوہ کچھ حالت ہی ابتر اوزمانے کی ہوئی جن سے توقع خوشی کی داو پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستہ تیغ الم نکلے

اگر ہم شمع سوزاں ہیں تو وہ آتش کا پر کالہ جانا خاصہ اس کا ہماری زندگی جلنا
اسی کا پر توہ ہے اپنا سامان بھاگویا محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا

اسی کو دیکھ کر جینے ہیں جس کا فر پہ دم نکلے

بہر منبر کیا کرتا تو ہی میری کا بسیار واعظ بیانِ حرمت میں ہی مشہور جہاں واعظ
ہی حیرت ہے مرزا کو بھی کیوں پہنچا وہاں اعظ کہاں بیجانہ کا دروازہ غالب و کہاں اعظ

پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

(۱۲۶)

ساقی سیاہ مست ہے تو لطف خاک ہے قصہ ہی پھر تو پینے پلانے کا پاک ہے
ساقی کی آنکھ پر لٹ صہبا کی تاک ہے مستی بہ ذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے

موجِ شراب یک مرثہ خواہناک ہے

رہتی ہے اس کو خنجر و پیکان کی جستجو آنکھوں پہر ہو ذوقِ جراحت کی گفتگو
ہر دم سنان و تیر کا نقشہ ہے روبرو جز زخمِ تیغِ تار نہیں دل میں آرزو

جیسا خیال بھی ترے اکتوں سے چاک ہے

وادیِ تنگ بے ہیں بھاتا نہیں اسد نظروں میں اپنی دشتِ سہانا نہیں اسد
مرزا بھی ماہِ چارہ بتاتا نہیں اسد جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسد

صحرا ہماری آنکھ میں ایک مشت خاک ہے

*

(۱۲۶)

اُس کی ہوا میں ہر گلِ تر دلِ نگار ہے رخ کا پسینہ روکشِ عطر بہا رہی
بوسے بدن سے باوصبا مشکبار ہے جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے
نافہ دماغ آہوئے مشکِ تارا ہے

دلِ جلیتہ جی اٹھائے گیا سر پہ باڑق ہم خاک ہیں ملے تو ہوا انتشارِ شوق
کیونکر ضنائے دشت نہ ہو اب تکارِ شوق ہی ذرہ ذرہ تنگی جاسے غبارِ شوق

گردِ ام یہ ہی وسعتِ صحرا نکار ہے
آنکھوں سے کون پرورشِ ہی چھپا ہوا کس کے خیالِ دید میں سکتہ سا ہو گیا
کیوں اس طرح کیا ہی تہیہ تلاکش کا کس کا سراغِ جلوہ ہی جہت کو یا خدا
آئینہ فرشتش جہتِ انتظار ہے

ہی بس کہ شوخ چشمِ بڑا مدعا علیہ تسلیم کیوں کرے گا خطا مدعا علیہ
دے گا جواب دیکھیے کیا مدعا علیہ دلِ مدعی و دینِ بنا مدعا علیہ
نظارہ کا مقدمہ پھر رو بکا رہی

تیارِ سفر میں ہی غنچوں کو بیچ و تاب پاور کا بپ ہیں یہ گلوں کو ہوا اضطراب

پتے اتر کے شلخ سے کرتے ہیں پاترا ب چتر کے ہر شبنم آئینہ برگ گل پر آب

ای عند لیب وقت و دایع بہار ہو

ہو کیوں نہ انتظار سے دل بنگلی مجھے نسکین اس خیال ہی سے ہو پڑی مجھے

ایفا کی گونہیں ہو کچھ امید بھی مجھے بیچ آپڑی ہو وعدہ دلدار کی مجھے

وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہو

اب تک تو مہر کی بھی نہ تجھ پر پڑی نظر ذروں کی آنکھیں دیکھ کہیں ہوں نہ پردہ ہو

لیلیٰ نہ پھرنا چاہیے بیباک اس قدر بے پردہ سوئے اوری جنوں گزرنہ کر

ہر ذرہ کے نقاب میں دل بے قرار ہو

بے کار ہو مرقع دل واہ کیا کہی آنکھیں کھلی ہوئی ہوں تو ہوا سے آگئی

ہو پاس ایسا آئینہ اور پھر یہ مگر ہی دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی

ای بیدار غ آئینہ تمثال دار ہو

اٹھنے کو ہی مہن سے عملداری نیناں سنا بھی پھر نہ آئے گا تجھ کو نظر بہاں

غافل یہ کثرتِ خس و خاشاک پھر کہاں ای عند لیب یک کفِ خس بہرِ آشاں

لموت ان آمد آفصل بہار ہو

مردار کی طرح کچھ بھی نہیں س کو احتیاط یہ ٹمکدہ اور اس میں یہ فرحت یہ انبساط

یہ جوشِ حرص اور قویٰ میں یہ انحطاط غفلتِ کفیلِ عمر و آسہِ ضامنِ نشاط

ای مرگِ ناگہاں تجھے کیسا انتظار ہو

❖

(۱۲۸)

تو وہ حسین ہو کہ خود آرا کہیں جسے شاہانِ حسن تاجِ سرا پہنا کہیں جسے
ہو اور کون حسن میں یکتا کہیں جسے آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

حیران ہو جو الفتِ حسن و جمال میں اک انقلاب ہو دلِ خستہ کے حال میں
سکتہ ہوا تصویرِ ذوقِ وصال میں حسرت نے لارِ کھانری بزمِ خیال میں
گلدستہ نگاہِ سویدا کہیں جسے

دل کو کیا ہو عشق نے کس غم میں مبتلا کرتے ہیں اس کو بہم ورجا رات دن فنا
آنکھوں کو کس نے شوقِ فطر کا لگا دیا پھونکا ہو کس نے گوشِ محبت میں خود را
افسونِ انتظارِ تمنا کہیں جسے

کیونکر جنون و جوشِ وحشت کو ٹالے وحشی کو کس طرح دیمِ غبتِ تنہا لے
دل کا غبار اور تو کیونکر بٹا لے سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالے
وہ ایک مشتِ خاک کہ صحر ا کہیں جسے

آنکھوں میں ہو سمایا ہوا بحر ہیکراں اس زور کا ہی مد و تلاطم کہ الاماں
 دنیا کا حال کیا ہو اگر اٹک ہوں واں ہی چشم تر میں حسرت دیدار سے نہاں
 شوقِ عنان گسینستہ دریا کہیں جسے
 بھلی ہوئی ہو چاندنی یا تیرہ ابر ہو دونوں ہیں بے طرح متقاضی کہ می پیو
 ہوتی نہیں بسرِ جو شبِ غم شراب دو در کا رہی شگفتن گلہائے عیش کو
 صبح بہارِ پنبہ مینا کہیں جسے
 جس کے بُرائی دل میں ہوا چھا وہ کیا کہے کچھ ہی گلہ نہیں ہی اگر ناسنرا کہے
 مرزا سے صبر سیکھ کہ دنیا بھلا کہے غالب بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے
 ایسا بھی کوئی ہی کہ سب چھا کہیں جسے

(۱۲۹)

سا مانِ مرگ پہلے مہیا کسے کوئی پھر تجھ سے گفتگو کی تمنا کرے کوئی
 بیٹھا خاموش یوں تجھے دیکھا کسے کوئی جب تاکِ ہانِ خم نہ پیدا کرے کوئی
 مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن اکرے کوئی

کیونکر ہو خاکِ عاشقِ جانبار سے مفر اس کو ہوا لیے ہوئے پھرتی ہو دوش پر
 وادیِ نجد پر ہی نہیں صرف منحصر عالمِ غبارِ وحشتِ مجنوں ہی سرسبز

کب تک خیال طرہ لیلیٰ کرے کوئی

پڑ مر دہل میں تھی جو تنائے التفات
آخر وہ آج کہتے ہوئے آئے التفات
لیکن یہ جان لیں ہی وولائے التفات
افسردگی نہیں بل فرائے التفات

ہاں در دین کے دل میں مگر جاگے کوئی

کتنے ہیں صبر و ضبط میں آٹھوں پہر مجھے
دل کھول کر نہانے دے اب شکستے مجھے
چھوڑاں نصیحتوں کو نہ ٹھونٹاں قدر مجھے
رونے سے ای ندیم ملامت نہ کر مجھے

آخر کبھی تو عقدہ دل واکرے کوئی

دخستگی ہزار طرح رونما ہوئی
با اینہما انھیں نہ توجہ ذرا ہوئی
میں نے قبا جو چاکٹ کی کیا خطا ہوئی
چاکر جگر سے جبے پریشن وا ہوئی

کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی

واوی کے سامنے ہی چین کا چرل غل
باد بہار کا نفس سر دے ہی غل
کیونکہ نہ رنگ گلشن جنت ہو دست گل
نخست جگر سے ہی رگ ہر خار شل گل

تا چند باغبانی صحر اکرے کوئی

تیری شعل حسن ہواک تیر حشیم دوز
مطالع نہیں ہی آنکھ کو تاب نظر منور
ہم دیکھیں کس طرح تجھے اسی مہر نیم روز
ناکامی نگاہ ہی برق نظارہ سوز

تو وہ نہیں کہ تجھ کو متاثر کرے کوئی

وحشتِ ندوں کو کیا خیرِ فرق پاؤ دست اطفالِ گم و سرہین ہیں اپنی منہست
سہو چٹنے کا مفت میں ہوتا ہی بند و بست ہر سنگِ خوشت ہی صدفِ گوہرِ شکست

نقصان نہیں جن سے جو سودا کرے کوئی

ہم چاہتے ضرور کچھ اپنے خدا سے عمر بڑھ جاتی شاید اور دعا و دولت سے عمر
تنگ آگئی مگر ترے عہد و فاسد سے عمر سربر ہوئی نہ وعدہ صبر آتا سے عمر

فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

آوارگی و دشت ہی وحشت ہے کاشغل حسرت کشی ہو ضعیف کے ہونے کا شغل
دامانِ جیب کھلا رہا بھی ہو مرے کا شغل بیکاری جنوں کو ہی سرپیٹنے کا شغل

جب تک ٹوٹ جائیں پھر کیا کرے کوئی

بیکار ہی سخن سے طبیعت کا خیر و میز انشاؤا خیر سے بے جا نہیں گمیز
بے سود ہو نتیجہ افکارِ طبع تیز ہو وحشتِ طبیعت ایجادِ داس خیر

یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی

روشن کلام و دہر سے کاغذ ہی اسد گویا چراغِ مرنے و بے نور ہی اسد
مردا بھی اب یہ کہنے پہ مجبور ہی اسد حسنِ فروغِ شمعِ سخن و دور ہی اسد

پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

*

(۱۳۰)

یہ داغ دکھا کر جو گلستاں میں ہنسا ہو عشاقِ دل افکار کے نزدیک خطا ہو
 نادم ہو کہ عرقِ عرقِ شرم ہوا ہو شبنم بہ گل لالہ نہ خالی ز ادا ہو
 داغِ دل پڑ در و نظر کا حیا ہو

ہو بوسے حنا سے یہ اٹھیں مستی بسیار مطلق نہیں حالِ دلِ غمگیں سے خبردار
 فرصت ہی نہیں اٹھوں کے نظار سے زہار دلِ خوشدہ کشمکشِ حسرتِ دیدار
 آنہ بدستِ بت بدستِ حنا ہو

کم آتشِ سوناں سے نہیں حسرتِ دل بھی جلتا ہی اپنا ہو تو مٹ جائے گی ہستی
 سینے میں تمنا نے عجب آگ لگا دی شعلے سے نہ ہوتی ہوسِ شعلہ نے جو کی
 جی کس قدر افسردگیِ دل پہ چلا ہو

تصویر کی کیا قدر کریں غیر ہیں بد ذوق ہم محو ہیں اس درجہ کہ رکھتا نہیں جہِ ذوق
 جاسکتا نہیں آنہ سے تا بہ ابد ذوق مثال میں تیری ہو وہ شوخی کہ بعد ذوق
 آئینہ یہ اندازِ گلِ آغوشِ کشا ہو

قری کی صداؤں سے ہو ہر سروِ سہی دنگ ببل کے اس انداز سے ہر غنچہ ہو دلِ تنگ

دونوں میں رخِ راسخ و نشِ پنهان کہ نہیں ہو سکتا
قری کین خاکسترو ببلِ قفسِ رنگ

ای نالہ نشانِ جگر سوختہ کب ہو

عادت نے تری ہست کیا ہستِ دل کو
مجبور بدلتا ہی پڑا حالتِ دل کو
بڑھنے نہ دیا دلولہ و جہراتِ دل کو
خونے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو
معتوقی و بے وصلگی طُرفِ بلا ہو

وہ لاکھ جفا ہیں کرے دے لاکھ اذیت
دُستوار ہو آسان نہیں ترکِ محبت
کچھ پاسِ باں ہو ہمیں کچھ پاسِ مرگ
مجبوری و دعوائے گرفتاری اُلفت
دستِ تہہ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہو

ہی قاتلِ عشاقِ پریشانِ گزشتہ
باقی ہو ابھی اس میں وہی شانِ گزشتہ
کبھی ہو عیاں قتل کے سامانِ گزشتہ
معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ
تینِ ستم آئینہ تصویرِ نسا ہو

نظروں میں شبِ تار سے بدتر ہو چکی
شائقِ ترے انوار کا دل بھی ہو جگر بھی
روشن ہیں ترے نور سے دیوار بھی ویر بھی
ای پر تو خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی
سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہو

تقدیر ہی قدرت نے یہیں ہی ہو کچھ ایسی
ہم پر نہ پڑی ہو نہ پڑے تیری تجلی

محروم بجز میرے نہیں جلوے سے کوئی اڑی پر تو غور شبید جہاں تاب ادھر بھی
 سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہو
 جاتا تو ہوں دنیا سے مگر بادلِ ناشاد کیا کیجیے بے وقت پڑی موت کی افاد
 ارمان بھرے دل کی بھی ہو تجھ سے ہی فواد ناکر گناہوں کی بھی حسرت کی طے داد
 یارب اگر ان کروں گناہوں کی سزا ہو
 ذوال زمانہ پہ جو مایل نہ ہو غالب یہ حسرت و حراماں کبھی حاصل نہ ہو غالب
 ہزار کے سوا غیر کا تامل نہ ہو غالب بیگانگی خلق سے بیدل نہ ہو غالب
 کوئی نہیں تیرا تو مری جان حسدا ہو

(۱۳۱)

غلمان کی شکل نہ صورت ہو عور کی سمجھے گا اس کو کیا کوئی ہو بات دور کی
 اک بہر امتحاں تھی ضیا کوہِ طور کی منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی
 قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی
 بہر نظارہ اہل جہاں کے جماؤ ہیں اندازِ ہوا دا ہو کر شمعے ہیں چاؤ ہیں
 پھولوں کی بھیاں ہیں بدن پر جو گھاؤ ہیں اکٹوں چکاں کفن میں ہزاروں بھاؤ ہیں
 پڑتی ہو آنکھ تیرے شہیدوں پہ عور کی

وہ مہکباں کی جس سے نہ لذت اٹھا سکو دیکھو نہ جس کو خود نہ کسی کو دکھا سکو
خود جاسکو جہاں میں نہ گھر بیٹھے پاسکو واعظ نہ تم دیو نہ کسی کو پلا سکو

کیا بات ہو تمھاری شراب طہور کی

پھر ہو رہا ہے مجھ کو قیامت کا سامنا ہو دغذغہ وہی جو کبھی زندگی میں تھا
یہ جان کر کہ آج ہو دن عدل و داد کا لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قائل کہ کیوں اٹھا

گویا ابھی سنی نہیں آواز صور کی

پھرتی ہو باغ باغ نہ غم ہو نہ کوئی سنج گانے لگی ترانہ نوبے رباب و صنج
گویا ملے گا اس کو زنگل سے کوئی گنج آمد بہار کی ہو چٹھیل ہو نغمہ سنج

اڑتی سی اک خبر ہو زبانی طہور کی

مانا کہ یہ نگاہ سے ڈلے ہوئے تو ہیں عزت کو لیکن اپنی سنبھالے ہوئے تو ہیں
اُمّ القریٰ کی گود کے پالے ہوئے تو ہیں گویا نہیں پروا کے نکالے ہوئے تو ہیں

کب سے ان بتوں کو بھی نسبت ہو دور کی

مڑے ہی تھے ملا ہو جنہیں یوں کھلا جواب دیکھیں تو دیتے ہیں نہیں پڑے سے کیا جواب
خطرہ نہیں کسی کو اگر مل گیا جواب کیا فرض ہو کہ سب کو ملے ایک سا جواب

آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

مِثْلِ زَبَانِ شمعِ زباں میں ہو وہ اثر پھونکا اُسے کسی سے ہوئے ہم سخن اگر
پر کالہ آگ کا بھیس کستا ہو ہر بشر گرمی اسی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

ہمزایہ شوقِ جج کا ہو جس طرح اب ہیں اُس وقت بھیس نہیں ملِ غالب جس پر ہیں
آخر یہ بات کہہ گیا وہ آکے جوش میں غالب گرا اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
جج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

*

(۱۳۲)

اس کو جو غم گردشِ ایام بہت ہو اس واسطے جو یا بے ہو و جام بہت ہو
مُوخواری و زندگی میں یہ بدنام بہت ہو غم کھانے میں بودا دلِ کام بہت ہو
یہ رنج کہ کم ہو مئےِ گلِ فام بہت ہو

مجھ رندِ بلا نوش کو چسکا ہو یہ مو کا ہو بانِ سرِ جوش ہی اس کی نہیں پروا
میں شوق سے لے لو گنا جو تلچھٹ بھی وہ بے گنا کہتے ہوئے ساقی سے جیا آتی ہو ورنہ
ہو یوں کہ مجھے دُرِ دتہ بہ جام بہت ہو

پنہاں نہیں لبِ دامِ گلستاں کی نہیں میں خطرہ ہی نہیں کوئی دلِ گوشہ گزین میں
پچھتے نہیں اب خارِ المِ قلبِ حزن میں فی تیر کماں میں ہو نہ صیا و کیس میں

گوشہ میں نفس کے مجھے آرام بہت ہی

لاہج سے جو تکلیف عبادت کی اُٹھائی اس عابد ناداں نے عبرت عمر گنوائی

کیا فائدہ اعمال میں جب ہو نہ صفائی کیا نہ ہد کو مانوں وہ نہ ہو گرچہ ریائی

پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہی

آزادہ روی شیوہ بتاتے ہیں انسان سلوم نہیں سمجھے ہیں کیا جی میں نہ ناداں

آنا تو ہو ہی نہیں سکتے کسی عنوان میں اہلِ خرد کس روشِ خاص پٹاڑاں

پابستگی رسم و رہ عام بہت ہی

پینے میں لگے باغِ گلِ عام کے دھبے ان سے غلِ آجائے نہ ارکانِ میراج کے

فرصت میں نہ راہِ چھوڑ کے دھولان نہیں پہلے زعفران ہی پہ چھوڑ دھتے کیا طوفِ حرم سے

آلودہ یہ مہِ جامہٴ احرام بہت ہی

تردید نہ کی اس کی کبھی میں نے کہا جو مجھ پر وہ عنایت کی نظر رکھتے ہیں سب تو

حیرت ہو یہ برتاؤ ہوا درِ وصل نہ پھر ہو ای قہر گرا بگئی نہ بنے بات کہ اُن کو

انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہی

میں یہ نہیں کہتا مجھے مرنا نہیں اور مرگ بیج جاؤں تو کچھ حرج بھی تیرا نہیں اور مرگ

حاشا کہ مجھے جان کی پروا نہیں اور مرگ غل ہو کے جگر آکھ سے ٹپکا نہیں اور مرگ

رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہی
 کیا دل کش و دھپ ہیں مزا کے ترانے بخشی ہی عجب طبع رسا اُس کو خدا نے
 مانا ہی اسے راہنما سب شعرا نے ہو گا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے
 شاعر تو وہ اچھا ہی پہ بدنام بہت ہی

(۱۳۳)

کیا کیجیے کہ دل ہی پریشاں کیے ہوئے آئینہ دار ہی مجھے حیراں کیے ہوئے
 ہو انتظار آمد جاناں کیے ہوئے مدت ہوئی ہی بار کو کہاں کیے ہوئے
 بوش قبح سے بزم چھا غاں کیے ہوئے
 دل کو تو چشمِ تر نے دیا اشکِ خوں میں کھو کیا خاک مجھ سے کوئی نیا انتظام ہو
 کردوں گا پیش کش ہی حاضر ہو گھر میں جو کرتا ہوں جمع پھر بگرِ نختِ نخت کو
 عرصہ ہوا ہی دعوتِ مرگاں کیے ہوئے
 مدت کے بعد جوشِ جنوں نے کیا کرم تاب سکون و صبر گئی دل سے یک قلم
 وحشت کی لکڑی دکھام نہ اب کر سکیں گے ہم پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہی دم
 برسوں ہوئے ہیں چپک گرہیاں کیے ہوئے
 سینے میں پھر وہ آگ بھڑکنے لگی کہ بس پھر جل کے خاک ہو گا تن زار مثلِ خس

پھر ضبط آہ پر نہ رہا دل کو دسترس پھر گرم نا لہائے مشر بہا رہی نفس
مات ہوئی ناو سیر چراغاں کیے ہوئے

کیا پوچھتے ہو کیا ہو غضب ہو بلا ہے عشق سر سے ملے گا نہ اب تاک ٹلا ہو عشق
دل کیا کہ اب تو درپئے جاں بر ملا ہو عشق پھر پریش جراحِ دل کو چلا ہو عشق
سامان صد ہزار نکداں کیے ہوئے

پھر دل میں شوقِ دید سے ہو دردِ جاگل پھر شکِ غم بھاؤں گا آنکھوں میں
دکھلاؤں گا وہ رنگ کہ مانی ہو مفصل پھر بھر رہا ہوں خاندہ مڑ گاں بخونِ دل
سازِ چین طرازیِ داماں کیے ہوئے

پیش آ رہا ہو عشق میں اک واقعہ عجیب بیٹھے بٹھائے پنپس گئے آفت میں و غریب
کیا دور ہو کہ دونوں میں پھر جائے عنقریب باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر قریب
نظارہ و خیال کا ساں کیے ہوئے

وحشت میں بڑھ رہی ہو رسدایوں کی ڈالت کے محلے کو کیا چاہتا ہو طو
کھل کھیلنے کے بتو قہارے ہیں پڑ بہ پڑ پھر دل طواف کوئے ملا مت کو جائے ہو

پندار کا صنم کون دیراں کیے ہوئے پھر اس دل غمیں کو ہی غمخوار کی طلب
پھر ہو مرین عشق کو تیار کی طلب

الفت کو پھر نہ گرنی بازار کی طلب پھر شوق کر رہا ہوں شہرِ پیدار کی طلب
 عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیسے ہوئے
 ہو رنگِ یوسے گل کا جو پیشِ نظر خیال گاشن میں جا کے مست ہو پھر سرسبز خیال
 گلگشت میں جما ہوا ہو پھر اُدھر خیال دوڑے ہو پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
 صد گلستاں نگاہ کا سا ماں کیسے ہوئے
 سمرنامہ اس کے خط کا ہو اس رجبِ لب جس کے ہر ایک حرف پہ ہیں جانِ دل فدا
 مضمونِ شوق دیکھئے لاتا ہو رنگ کیا پھر چاہتا ہوں نامہ و لہار کھولنا
 جانِ نذرِ دل فریبی عنوان کیسے ہوئے
 تسکینِ سیرِ باغ سے کیا ہوگی ہم نفس بے یار ہیں فطریں گل تر بھی خارِ خوش
 بے چین ہو رہا ہوں کہ دل پر نہیں ہویں مانگے ہو پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
 زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے
 بے وجہ تو نہیں ہوں میں آوارہ کو بکو پھر تا ہوں تیغِ زن کے تحس میں چارو
 تیغِ نگاہ کی ہو ان آنکھوں کو بستجو چاہے ہو پھر کسی کو مقابل میں آرزو
 سمر سے تیز دشنہ شکر کاں کیسے ہوئے
 مرغوبِ چشمِ شوق نہیں روئے ہر ماہ اس گل کی بزمِ پیش کی دل ڈھونڈتا ہوا رہ

کب سامنے ہو دیکھیے سانی کی جلوہ گاہ اک نو بہارِ نماز کوتاہ کے ہر پھرنگاہ

چہرہ فروغِ موسے گلستاں کیے ہوئے

تا چند انتظار کا کوکھ جھیسکتے رہیں کب تک رہیں چارہ احباب کے رہیں

تا چند یوں جدا درویدار سے رہیں پھر جی میں ہو کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں

سرنہیر بار منت دریاں کیے ہوئے

طاقت نہ وہ خیال میں باقی نہ اب رہیں وہ دن گئے کہ چین نہ پڑتا تھا یا رہیں !

رہتے تھے اس کی یاد میں و دل مٹھان جی ڈھونڈتا ہوا پھر وہی وصل کے ان دن

بٹھتے رہیں تصویرِ جاناں کیے ہوئے

کیا سہل بات تھی کہ یہ سیلاب رک سکے روکا یہ جوش جس نے وہ حرزا ہیں تو تھے

اب بھی ہیں اپنی آنکھوں میں رہا بھرے ہوئے غالب اب ہیں نہ چھیر کہ پھر جوشِ اشک سے

بیٹھے ہیں ہم تہیہ طوفاں کیے ہوئے

*

(۱۲۳)

جھاسے یا رتسلی ہو اک جہاں کے لیے خبر خوشی کی ہو آزادی و اماں کیے لے

ہوئی ہو وجہ تسلی و لپتیاں کے لیے نوید امن ہو بیدار دوست جاں کے لیے

رہے نہ طرزِ ستم کوئی اسماں کے لیے

غدا سے غم تو دل بے قرار و محزون ہو جگر کی تاک میں وہ دیدہ پرافسوں ہو
 پڑی وہ لوٹ کہ حالت مری دگرگوں ہو بلا سے گر شرہ یار تشنہ خوں ہو
 رکھوں کچھ اپنی بھی مرگاہِ خو پچکاں کے لیے

خطا معاف یہ ہو اتنا بس خلق اے حاضر ٹھہیں نہیں ہو ذرا بھی تو پاس خلق اے حاضر
 چھپے ہو تم ٹھہیں ہو ہر اس خلق اے حاضر وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے حاضر
 نہ تم کہ چور ہٹے غیر جا وداں کے لیے

یہاں تاک سے دل میں تھی ہی کثرتِ رشک کہ بات بات ظاہر اب علامتِ رشک
 کسی کو غیر کی راحت پہ ہوگی عادتِ رشک رہا بلا میں بھی میں مبتلا سے آفتِ رشک
 بلا سے جاں ہو ادا تیری اک جہاں کیلئے

وہ کشتی کہ جو قاتل سے اتان ہیں قریب انھیں کو اس سے جدا کر کہ ہو مجھے تسکین
 کبھی تو دُور سے ہو آزمائش ان کی کہیں فلکست دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
 دراز دستی قاتل کے امتحاں کے لیے

پڑا ہوا تو ہوں زنداں میں بستہ زنجیر قرینہ یہ تھا کہ کرتا نجات کی تدبیر
 مگر مجھے تو یہ دُھن ہو کہ گھر کوں تعمیر مثال یہ مری کوشش کی ہو کہ مرغِ اسیر
 کرتے نفس میں فراہم جس اشیاء کے لیے

پڑا ہوا تھا میں ہونی اس آستان پہ رمائے اس آرزو میں کہ دربان کو ترس آجائے
اسے بھی کوئی خصومت نہ تھی کہ مجھ کو اٹھائے گدا سمجھ کے وہ چپ تھامری جوشاں آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسیاں کیلیئے

سخن میں چاہیئے کوئی جدید طرزِ عمل کہ طبع تیز کا کچھ حوصلہ تو جائے غل
نہ کیوں ہو جدِ تغزل میں ہ کے جی بے گل بقدر شوق نہیں ظنِ تنگنا سے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلیئے

ملا ہی جو طرب و عیش اس کو قسمت سے بھلا وہ اس کے سوا ہی نصیب اور کسے
شا دیا حسد و رشک کو بھی قدرت نے دیا ہی خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہی عیشِ تھل جینِ خاں کے لیئے

یہ ذکرِ غیر مرے لب پر آگیا کس کا بھرا سرور سے دل اور جگر ہوا ٹھنڈا
مجھے بیان پر اپنے ہی وجد کیوں اتنا نیاں پہ بار بندایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری نیاں کیلیئے

ای کی شان کے شایاں ہو شانِ شوکتِ ملک اسی کے واسطے موزوں ہی جاہ و شہرتِ ملک
رہے ہمیشہ یوں ہی برقرارِ ثروت و ملک نصیرِ دولتِ میں اور معینِ ملت و ملک
بنا ہی چرخِ بریں جس کے آستان کے لیئے

ہر اک بندہ کے لیے عیش کی ہو افزائش خدا کے فضل سے آیا ہو دور آسائش
 نئے طریق سے ہر شے کی ہو زیبائش زمانہ عہد میں اس کے ہو محور آسائش
 بنیں گے اور ستارے اپنی سماں کیلئے

بھی تو مہ کی تہید و استراہی ہو نہ مہ لکھی گئی ہو نہ میں نے لکھی ہو
 ابھی کہاں مری طبع رسائے بس کی ہو ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہو
 سفینہ چاہیئے اس بحر بے کراں کے لیے

عجیب صنگ نکالا ہو مدح گوئی کا غزل سی شو میں کھایا ہو اس نے رنگ نیا
 طبیعت اس کی ہو جذبات پسند از ہر ترزا اداسے خاص سے غالب ہوا ہو نکتہ سرا
 صلائے عام ہو یا ران نکتہ واں کے لیے

(۱۳۵)

کم ہو غیروں سے اگر مہر و وفا اور سہی کوئی برتاؤ مروت کا نیا اور سہی
 میری ایذا سے جو دل خوش نہ ہو اور سہی میں ہوں مشتاق جفا چھ پہ جفا اور سہی
 تم ہو بیاد سے خوش اس سے سوا اور سہی

رات دن گریہ ہو اور آٹھ پہر نالہ و آہ سوگ تم نے تو کچھ اس درجہ منایا کہ پناہ
 مری جانے دو اگر مری گیا ہو گمراہ غیر کی مرگ کا غم کس لیے ای غیرت ماہ

ہیں ہوس پیشہ بہت وہ نہ ہوا اور سہی

کبر و نخوت کی مانے میں دہائی کیوں ہو
دل میں ناحق ہوس خام پکائی کیوں ہو
خود نما کیوں ہو غودی سر میں سمائی کیوں ہو
تم ہو بہت پتھر ہیں پندارِ خدائی کیوں ہو

تم خداوند سہی کس بلاؤ خدا اور سہی

یہ تو مانا کہ حسینوں کی نہیں کوئی کمی
آن بان ایسی کسی میں کبھی دیکھی نہ مٹنی
منہ حسینانِ ارم آکے ملائیں تو سہی
حُسن میں آپ بڑھ کر نہیں ہونے کی کبھی

عور کا شیوہ اندازِ واد اور سہی

کیا قیام اور قعود اور ہی سجدہ کیسا
سر مرا جھک نہیں سکتا ہی ترے در کے سوا
ٹھا جو بے چین تو بہر پھر کے ادھر ہی پہونچا
تیرے کوچے کا ہو مالِ دل مضطر میرا

کعبہ اک اور سہی قبل نما اور سہی

کیا انوکھا چین حسلہ بریں ہو واعظ
باغ دیکھے ہی نہیں تو نے یقیں ہو واعظ
تیری باتوں کا ٹھکانا بھی کہیں ہو واعظ
کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہو واعظ

خلد بھی باغ ہو خیر آب دہوا اور سہی

یاں تو دل کھول کے ارمان خالیں یارب
تنگی دہر کی کچھ داد تو پالیں یارب
سیر کا لطف تو جی بھر کے اٹھالیں یارب
کیوں نہ فردوس میں دوزخ بھی ملا لیں یارب

سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

کر دیا ہو غم ہجراں نے مرا حال زبوں بڑھتے بڑھتے خفان پہنچی ہو نوبت بہ جنوں
دیر مرنے میں لگے گی جو کھلائی انبیوں مجھ کو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں

زہر کچھ اور سہی آبِ بہتا اور سہی

طبع دیوان سے جو غالب نے فراغت پائی یار و احباب نے مرزا نئی آفت ڈھائی
کی غزل نظم تو یوں لب پہ شکایت آئی مجھ سے غالب یہ علای نے غزل لکھوائی
ایک بیدار اگر رنج فرزا اور سہی

(۱۳۷)

شکوہ درد بھی اک گو نہ خطا ہو تو سہی نالہ و آہ سے اظہار جفا ہو تو سہی
صبر میں اُنٹ بھی سنا فی رضا ہو تو سہی آپ نے مسکنی الضحیٰ کہا ہو تو سہی
یہ بھی یا حضرت ایوب گلا ہو تو سہی

ہمنشیوں کو ہو کیا میری مصیبت کی خبر کرتے ہیں صبر کی تقلید مجھے آٹھ پہر
دل ہی تو ہر مے سینے میں نہ کوئی پتھر بچ طاقت سے سوا ہو تو نہ پیٹوں کیونکر

لے غزل نمبر ۱۲- دیوان مطبوعہ میں نہیں ہوا، دوسرے مسئلے احمد اول تو موسومہ نواب بن الدین احمد صاحب ہیں، برج ہی ۱۲

ذہن میں خوبی تسلیم درضا ہو تو سہی

آس باقی ہو تو برسوں ہمیں بہلائے گی عمر
سبز باغ آٹھ پہن کر میں دکھلائے گی عمر
داد ملنے کے لیے گو پونہی "ٹڑپا"ئے گی عمر
ہر غنیمت کہ یہ اُمید گزر جائے گی عمر

نہ ملے داد مگر وزیرِ حُسن ہو تو سہی

کس کا چارہ فقط الزام سے ہتے ہیں بری
کون اٹھاتا ہو رضیوں کے لیے دوسری
منہ نہ کھلواؤ کہ احباب کی ہو ہر وہ درسی
دوست ہی کوئی نہیں ہو جو کرے چارہ گری

نہ سہی ایک متناسے دوا ہو تو سہی

ہم سے برتاؤ ہو جو کچھ اسی قابل ہم تھے
کہئے بد عہد و جفا کا رُسے کس منہ سے
بے مروت ہو وہ کیونکر کوئی انصاف کرے
غیر سے دیکھیے کیا خوب نبا ہی اس نے

نہ سہی ہم سے پر اس بت میں وفا ہو تو سہی

گو کہ واقف نہیں تقدیر کے احوال سے ہیں
خطِ قسمت نہیں پڑھ سکتا کسی حال سے ہیں
یوں لگاتا ہوں پتہ اپنے ہی افعال سے ہیں
نقل کرتا ہوں اُسے نامہ اعمال سے ہیں

کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہو تو سہی

جس طرح صبر سے ہر ڈانے گزاری غالب
زندگی کا ٹوٹی طرح سے تم بھی غالب
جان دتے ہی کسی روز بنے گی غالب
کبھی چل جائے گی کیوں کرتے ہو جلدی غالب

روح کلام غالب

۲۵۲

شہرہ تیزی شمشیر قصا ہو تو سہی

نوٹ: یہ غزل ۱۳۶۱ نواب احمد سعید خاں صاحب طالب رئیس دہلی کا عطیہ ہو فرماتے تھے کہ میں ہر وقت پھوپھا جان (غالب) کی خدمت میں حاضر باش تھا نیا کلام اپنی یادداشت میں لکھتا تھا اور مجلس بہ غزل ہو۔

قطعہ تاریخ تکمیل وراق ہوا

ظاہر ہوئے معانی حل ہو گئے مطالب
بولاسروش غیبی روح کلام غالب
۱۳۴۵ ۱۳۴۵

کی شرح نظم غالب تصنیف میں جو مرزا
جی میں خیال آیا تاریخ اس کی لکھیے

تمام شد
مطبوعہ نظامی پریس ہاؤس
(محمد اجدالدین پرنٹر)

LIBRARY

UNIVERSITY

روح کلام غالب

غزلیات غالب
ہم کی شعری تشریح

مصنف

مرتب و اشاعی

سید افتخار حسین زریں غالب ثانی مرا عزیز بیگ ہمارا مرحوم

شائع کنندہ: نشریات ادب ایکڈمی

بازار نمنا سہارن پور یو پی

۱۰۰ حقوق محفوظ ہیں

اشاعت اول :- ۱۹۳۵ء ۱۰۰۰

اشاعت دوم :- ۱۹۶۸ء ۱۱۰۰

قیمت مجلد :- تین روپے

کاتب :- عبدالمنان خوشنویس سہانپور

زیر اہتمام :- سید عزیز حسن نسیم جلال آبادی

نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند میں چھپی

ناشران ۹۶۰۰۰۰

نشریات ادب ایکڈمی بازار نخاسہ سہانپور

تعارف

غزائب کی تصانیف میں ان کے دیوان اردو کو مرزا میں ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے اور آج بھی مرزا کا درجہ سخنوری ہر طرح کی توصیف و تعارف سے بے نیاز ہے، یہی وجہ ہے کہ ۱۸۴۱ء سے ایک مرزا کے دیوان کے لاتعداد ایچے اور برے، سادہ و پُرکار نسخے شائع ہوتے رہے ہیں، اور یہ سلسلہ یہیں پر بس نہیں ہو جاتا بلکہ شاعرین و اہل قلم نے غالبیات کو ایک مخصوص ادبی موضوع بنالیا ہے۔ مختلف ادباء اور محققین نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق کلام غالب کو نئے نئے انداز سے پیش کیا ہے اور آج کلام غالب پر گراںمایہ کتابیں وجود میں آگئی ہیں!

روز روشن کی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ کلام غالب پر جو کتابیں اب تک منظر عام پر آچکی ہیں ان میں مولانا حالی کی ”یادگار غالب“ اور مولانا محمد حسین آزاد کی ”ابحیات“ کلام غالب کی قدر و منزلت کے عالیشان قصر کی سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں اسی سلسلہ کی ایک کڑی جناب مرزا عزیز بیگ صاحب مرزا سہا پنپوری کی شاہکار کتاب ”روح کلام غالب“ بھی ہے۔

”روح کلام غالب“ کے فاضل مصنف نے اس کتاب میں غالب کی تمام غزلوں کی تفہیم کچھ اس انداز سے کی ہے جیسے غالب کے کلام کی روح کھینچ کر صنفِ قرطاس پر منتشر کر دی ہو۔ یہ کتاب غالب کے کلام کی زبان شعری مکمل شرح ہے جس سے غالب کے اشعار کا مفہوم غالب کے ذہن میں کیا تھا بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

مرزا عزیز بیگ صاحب مرزا نے ۱۹۲۱ء میں یہ کتاب مکمل کر دی تھی لیکن جس طرح

مرزا غالب اپنی حیات میں خود اپنا دیوان شائع نہ کر سکے بالکل اسی طرح مرزا سہارن پوری بھی ”روح کلام غالب“ اپنی حیات میں زیور طبع سے آراستہ نہیں کر سکے بہر حال کتاب شائع ہونی تھی اور ہوئی مگر مرزا صاحب کی وفات کے بعد ۱۹۳۵ء میں ”روح کلام غالب“ زیور طبع سے آراستہ ہو کر کچھ ہی دنوں میں نایاب ہو گئی اور شائقین اس کے مطالعہ کیلئے تڑپتے رہے۔

اب جناب مرزا عزیز بیگ صاحب مرزا مرحوم کے وارثان کی کرم فرمائی سے نشریات ادب اکیڈمی سہا پور کو اس نادر و نایاب شاہکار کو دوبارہ شائع کرنیکی سعادت نصیب ہوئی۔ ارباب اکیڈمی جناب مرزا عزیز بیگ صاحب اور جناب مرزا سلطان بیگ صاحب وارثان مرزا سہا پور کے انتہائی شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اس کتاب کے شائع کرنیکی اجازت مرحمت فرمائی۔

”روح کلام غالب“ میں کچھ دلچسپ اور ضروری حاشیوں کا بھی اضافہ کیا گیا ہے وہ یہ کہ جن اشعار کی مرزا غالب نے خود تشریح کی ہے دج کر دی گئی ہے اور اکثر مشکل اشعار کے مطالب بھی تحریر کر دیئے گئے اسکے علاوہ ایک ضمیمہ بھی شامل کیا گیا ہے جس میں مرزا عزیز بیگ صاحب مرحوم کی وہ تفصیل جو انھوں نے مولانا جاتی، میر وحید کھنوی اور منشی حبیب الدین سوزاں کے کلام پر کی ہیں اور غیر مطبوعہ بھی ہیں شائع کر دی گئی ہیں۔

میں ان ارباب ادب کا نہایت ممنون ہوں جن کی ادبی کاوشوں کے نتیجے ترتیب خواشی میں میرے زیر مطالعہ رہے ہیں ان میں جناب پرتھوی چند ر مولف ”مرقع غالب“ کا نام نامی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

سید افتخار حسین زیدی

۱۵ جنوری ۱۹۶۸ء

مقدمہ طبع دوم

(حکیم مشرف مظاہری سہارنپوری)

غالب کا یہ اپنا خیال نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ ہے آدمی بجائے خود اک عمر خیال۔
اور اسی بنا پر وہ غلوت کو بھی انجمن سمجھتا اور بنا لیتا ہے لیکن کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنی
پہلو وار خصوصیات اور حیرت طراز فطرت کی بدولت بجائے خود ایک انجمن ہوتی ہیں۔ انھیں
لوگوں میں غالب بھی ہیں جن کی نظم نما مشنورا اور گونا گوں کمالات میں محصور شخصیت فرد واحد
کی نہیں بلکہ ایک وسیع ادارے اور قاب قضا کی کیفیت رکھتی ہے۔

اسد اللہ خاں غالب کے اشعار الہامی قسم کے ہوں یا اہمالی۔ طرز بیان ہو یا
تشبیہات و استعارات۔ فصائد ہوں یا خطوط فلسفہ ہو یا تصوف۔ مذہبی مسائل
ہوں یا اخلاقی قدریں سب میں انفرادی شانِ صحت مند حیرت۔ دل کش آن بان اور
آزاد روی ہے اور بلاشبہ اردو شاعری و نثر نگاری کے طویل و عریض میدان میں ان کا
کوئی حریف نہیں۔ _____ عرفان غالب کے سلسلے میں مولانا حالی اور
ان کے بعد اکثر قدما و اصحابِ علم نے بہت کچھ لکھا ہے مگر گزشتہ نصف صدی کے
دوران جس تسلسل۔ قریبے۔ محنت۔ علوم اور لگن کے ساتھ کام ہوا ہے وہ کافی حوصلہ
افزا اور لائقِ مدحِ تحسین ہے۔ اور یہ اہم سلسلہ قاضی عبدالودود۔ مولانا اقبال علی
حقی۔ مولانا غلام رسول جہر۔ آل احمد سرور۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی۔ خواجہ احمد فاروقی۔

مالک رام ایم اے۔ پروفیسر حمید احمد خاں۔ مولوی ہمیش پرشاد، عبادت بریلوی۔
 رشید احمد صدیقی۔ شوکت بزرگوری۔ ظانصاری۔ پرتھوی چندر اور کوثر جہان پوری
 وغیرہ حضرات کے طفیل جاری و ساری ہے۔ اس کا نتیجہ نہ صرف یہ کہ غالب غالبیات
 سے متعلق نہایت اہم سرمایہ معلومات جمع ہو گیا ہے بلکہ ممتاز شاعری۔ فلسفہ حیات
 نفسیات انسانی اور فن تنقید کے تحت اردو ادب میں معتد بہ افادی مواد کا اضافہ
 ہوا ہے اور ان دونوں امور کا ثمرہ تازہ اور مسرت آگس پہلو یہ ہے کہ اب دوسری
 زبانوں اور دوسرے ممالک کے محققین و اہل قلم بھی مطالعہ غالب اور اردو ادب و
 شاعری میں دل چسپی و انہماک سے حصہ لے رہے ہیں۔

تضمین کلام غالب۔ رباعی کی طرح تضمین بھی اپنے تقاضوں کے
 لحاظ سے مشکل ترین صنف ہے خصوصاً کسی دوسرے شاعر کے کلام کو تضمین کرنا۔
 کیوں کہ اس میں اصلی شعر کے اقدار کو برقرار ہی نہیں رکھنا پڑتا بلکہ کہیں ردیف اور
 کہیں ردیف و قافیہ دونوں کا پابند رہ کر طعنے مصرعوں میں اس کی توفیق کے ساتھ
 مقصود کلام کو نئے انداز سے نکھارا جاتا اور بیان کو زیادہ موثر بنانے کے لئے مزید
 دلائل و تشبیہات سے وسعت دی جاتی ہے۔ یہ صنف کتنی مشکل ہے اس کا محکم
 جواب اور قاطع ثبوت میر مہدی فرورج ایسے قادر الکلام و باصلاحیت شاعر اور
 غالب کو تضمین کرنے کا بیڑا اٹھایا لیکن چند گام چلنے کے بعد ہی انھوں نے محسوس
 کر لیا کہ اس کوہ کئی میں شاخ قدم قدم پر مٹے نفس نفس پر امتحان ہیں۔ نیز اس

تضمین کلام غالب کے لیے یہ موقوف ہے

عرصے میں انھوں نے جو کوشش کی تھی اس کے نتیجے پر جب ناقدانہ نظر ڈالی تو اس کو کسی درجے میں بھی اہم قرار نہ دے سکے اور خیال کیا کہ اگر فکر و تئیسہ فرما دے کلام کے یہ جوئے شیر مکمل بھی کر لی تب بھی وہ شیریں کے حصول کا ضامن کامیابی ذریعہ ثابت نہ ہو سکے گی۔ لہذا یہ سوچ کر کہ قلم مردے از غیب بروں آید و کارے بکند۔

اس معرکہ عظیم کو ہر کرنے کا خیال ترک کر دیا۔ اس نا کافی عزم اور شکستِ بہت کو ہم میر جبرجوع کی باصلاحیت شخصیت کی نقیص پر دال نہیں سمجھے کیونکہ بلاشبہ وہ اس کلام کے اہل بھی تھے۔ ان کا ارادہ نیک بھی تھا اور کلام غالب کی شرح کے لئے ان کی نگاہ انتخاب نے موزوں ترین راہ بھی اختیار کی تھی مگر قدرت اس کارنامے کا سہرا کسی اور ہی کیلئے مقدر کر چکی تھی اس لئے میر جبرجوع کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔

روح کلام غالب : میر جبرجوع کے بعد غالب کے وسیع حلقہ شاگردان میں نہ جانے کتنے اصحاب کے دلوں میں اس آرزو نے طوفان بپا کیا ہو گا مگر یہ قرۃ فال غالب کے پوتا شاگرد مرزا عزیز بیگ صاحب مرزا سہارنپوری (تمیذ حضرت سوزاں) کے نام نکل چکا تھا اور حق یہ ہے کہ انھوں نے بصورتِ احسن یہ حق ادا کیا۔ کلام غالب کی تشریح و توضیح میں غالب کے توانا طرزِ فکر اور حسن ادا کو ایک چابکدست مصور اور دقیقہ رس فنکار کی حیثیت سے مزید دلائل و ثبوتیں عطا کی اور ایک ایسا کارنامہ انجام دیا جس کی اردو، فارسی اور ہندی شاعری کی طویل تاریخ اب تک نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے اور جس پر اردو شاعری اور غالب نواز حلقہ بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

رکھیں غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف، جس وسیع پیمانے پر اور بالغ نظری سے غالب و غالبیات پر اہل قلم حق تنقید و تحقیق ادا کر رہے ہیں اور غالب سے متعلق معمولی سے معمولی واقعے کو منظر عام پر لا رہے ہیں اس اعتبار سے یہ امر انتہائی حیرت زار اور باعث افسوس ہے کہ مرزا عزیز بیگ مرحوم کی ”روح کلام غالب“ کو بجائے اسکے کہ اسکی کا حق قدر افزائی ہوتی اس کے ساتھ بے اعتنائی و بے نیازی کا وہ مظاہرہ کیا گیا ہے کہ غالبیات کا مطالعہ کرنے والے طبقے میں چند فیصد بھی اس سے واقف نہیں اور اس بے رحمانہ عدم التفات کے طفیل یہ پیکر خوبی ج

آفتاب لیکن اثر سحر نازد

حرف آخر وہ نظامی صاحب کے مقدمے میں آپ میر محمد روح اور رضا ”روح کلام غالب“ کی تقصیموں کا موازنہ ملاحظہ فرمائیں گے اسلئے میں اس سے صرف نظر کر کے اس سلسلے کی سب اہم کڑی اور تقصیم کا ایک نایاب نمونہ پیش کرتا ہوں یہ تقصیم مرزا غالب نے شاہ ظفر کی غزل پر کی ہے جو ۱۷ اپریل ۱۸۵۷ء کے ”اردو اخبار دہلی“ میں شائع ہوئی تھی اس تقصیم سے بخوبی واضح ہو جائیگا کہ مرزا عزیز بیگ مرحوم کی تمام تقصیموں کا معیار و وزن کیا ہے؟ اور کیا ”روح کلام غالب“ اردو ادب میں مقام رفیع پانے کی مستحق نہیں؟ اور کیا یہ تصنیف نادرہ ماضی کی طرح اب بھی گمنامی و بے اعتنائی کی نذر ہو جائے گی۔

غزلِ ظفرِ تضمینِ غالبؔ

گھستے گھستے پاؤں میں زنجیرِ ادھی رہ گئی مرگئے پر قبر کی تعمیرِ ادھی رہ گئی
سب ہی پڑھنا کاش کیوں بکیرِ ادھی رہ گئی کھینچے قاتل جب تری شمشیرِ ادھی رہ گئی
غم سے جانِ عاشق دگرِ ادھی رہ گئی

بیٹھ رہتا ایسے چشمِ پرِ غم اس کے روبرو کیوں کہا تو نے کہ کہہ دے کا غم اس کے روبرو
بات کرنے میں نکلتا ہے دم اس کے روبرو کہہ سکے ساری حقیقت ہم نہ اس کے روبرو
ہم نشیں ادھی ہوئی تقریرِ ادھی رہ گئی

تو نہ دیکھا مجھ پہ کیسی بن گئی اے رازدار خوابِ بیداری پر کب ہو ادھی کو اختیار
مثلِ زخمِ آنکھوں کو سی دیتا جو ہوتا ہوشیار کھینچتا تھا رات کو بس خواب میں تصویرِ ایا
جاگ اٹھا جو کھینچنی تصویرِ ادھی رہ گئی

غمنے جب گھیرا تو چاہنے یوں دلنواز مستی چشم سیرِ سہل کے ہوئیں چارہ ساز
تو صلائے پاس جا کا تھا جو خواب ناز دیکھتے ہی لائے تنگ تیری چشم نیم باز
کی تھی پوری ہم نے جو تیرا دھی رہ گئی

اس بت مغرور کو کیا ہو کسی پر التفات جسکے حسنِ روز افزوں کی ایک دانے ہر بات
ماہِ نوکلے پر گزری ہو نگلی رانیں پان سات اس رخِ روشن کے آگے ماہِ یک سہتہ کی رات
تابشِ خورشید پر تنویرِ ادھی رہ گئی

تاقیمِ ہنپائے کاشِ بخت بے گھات ہیں ہاں فراوانی اگر کچھ ہو تو ہے آفات میں
جرمِ وِج وِلم کھاٹے ہر اک بات میں کم نصیبی اسکو کہتے ہیں کہ میسے بات میں
آتے ہی خاصیت اکسیرِ ادھی رہ گئی

سب بیگوشہ کنڈے ہر گلے لگ جاوے آدمی کو کیوں پکائے ہر گلے لگ جاوے
کسے گر چادرِ آٹاے ہر گلے لگ جاوے مانگ کیا بیٹھا سنوئے ہر گلے لگ جاوے
وصل کی شب لے بت بے پیرِ ادھی رہ گئی

میں یہ کیا جانوں کہ وہ کس واسطے ہوں پھر گئے پر نصیب پنا انھیں جاتا سنا ہوں پھر گئے

دیکھنا قسمت وہ آئے اور پھر یوں پھر گئے آگے آدھی دور میرے گھر سے وہ کیوں پھر گئے

کیا کشش میں دلی اب تصویرِ آدمی رہ گئی

ناگہاں یاد آگئی ہر جھکویا رب کب کی بات کچھ نہیں کہتا کسی دین ہا ہوں سب کی بات

کسلے تجھ کو چھپاؤں ہا وہ پر شو کی بات نامہ بر جلدی میں تیری وہ جوتی مطلب کی بات

خط میں آدمی ہو کی تحریرِ آدمی رہ گئی

ہو تجلی برق کی صورت میں ہر پہلی غضب ہاں کچھ گھنٹے کی ہوتی فرصتِ عیش و طرب

شام سوائے تو کیا اچھی گزرتی رات سب پاس میسے وہ جو آئے بھی تو بعد از نصف شب

نکلی آدمی حسرت لے تقدیرِ آدمی رہ گئی

تم جو فوٹے ہو دیکھ لے غالب آشفۃ سر ہم نہ تجھ کو منع کرتے تھے گی کیوں اسکے گھر؟

جان کی پاؤں ماں باتیں سب ہیں مگر دل نے کی ساری خرابی لیگیا مجھ کو ظفر

واں کے جانے میں مری تو قیرِ آدمی رہ گئی

محبِ مکرم جناب سید افتخار حسین صاحب زیدی ناظم نشریات
 ادب اکیڈمی اور سید عزیز حسن نسیم مدیر دیر و ترم سہارنپور لائقِ صد
 مبارکباد ہیں کہ اس دورِ ابتلا و گمراہی میں روحِ کلام غالب کو حیاتِ
 نو سے بہرور کرنے اور علمِ دوست اصحاب تک پہنچانے کے نیک
 جذبے سے اس کی طبعِ دوم کے لئے کمر بستہ باندھی۔ ع
 ”خدا نصیب کرے انکو عشرتِ منزل“
 آمین

مقدمہ

(از مولوی نظام الدین حسین صاحب نظامی بدایونی)

میرے دوست مرزا محمد ظفر بیگ صاحب جی کے حسن سعی سے ”روح کلام غالب“ طبع ہو کر آج شائقین کے پیش نظر ہے۔ مجھ سے مصر ہوئے کہیں اس کا مقدمہ لکھوں غالباً ان کا یہ اصرار اس بنا پر تھا کہ مجھے کلام غالب سے دلی لگاؤ رہا ہے اور اس کے فدائی ہونے کا فخر حاصل ہے۔ میری گونا گوں مصروفیتیں کچھ عرصہ تک مرزا صاحب کی تعمیل ارشاد میں مانع رہیں۔ جب تقاضا صبر سے بڑھا تو کچھ وقت اس کے لئے بھی نکالا۔ میں نے اس مقدمہ میں اختصار کو مد نظر رکھا ہے تاکہ ناظرین آسانی سے اس کے مطالعہ کے لئے وقت دے سکیں ورنہ کلام غالب کا موضوع اسی قدر دل چسپ اور وسیع ہے کہ اس پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ غالب غزل کا بادشاہ تھا اس نے اس صنف سخن کی مابہیت کو خوب سمجھا ہے۔ غزل کی تعریف مختصراً یہ ہے کہ اس میں جتنے مضامین ہوں وہ داخلی ہوں اور ان کا درجہ اس قدر بلند ہو کہ ان سے انسان کی فطرت اور اس کی عظمت ہو پیدا ہو سکے اور اس کی وسعت ادراک کا پتہ چل سکے۔ یہ حقیقت ہے کہ جہاں صنایع سخن میں غزل کوئی جتنی آسان ہے اتنی ہی دشوار ہے اگر غزل غزل ہو تو اس کو ہرستان نظم کا ایسا قطعہ کہنا چاہیے جسکی روشیں

مذہب معبود جنگ مرزا صاحب جی۔ اے آکسن کی تحریک سے سب سے پہلے ۱۹۱۵ء

میں میں نے اردو دیوان غالب معری اشارات املانی کے ساتھ نظامی پریس بدایوں سے (باقی آئندہ)

غیر مسلسل اور نامرابط ہونے کے باوجود بے حد دل کش اور روح افزا ہیں۔ جس طرح آسمان پر چمکنے والے تاروں کی بے ترتیبی ان کی خور آفرینیوں کو جلا دے دیتی ہے اسی طرح ایک بہترین غزل کے منتشر استعار اس کے حسن کو دو بالا کر دیتے ہیں اور یا اس ہم نامرابطی نے لفظ ”گلِ جہدِ یزدانِ یزدان“ کا مصداق بن جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ سر شعر نے تخیل کا حامل ہوتا ہے اور ہر تخیل میں نئی نئی کثرتیں آفرینیاں ہوتی ہیں۔ کہیں فلسفہ اخلاف و تصوف کے گوناگوں رموز عالم حیرت استعجاب طاری کر دے ہیں تو کہیں جذبات حسن و محبت کی بولبولی مسخو روئے خود بنا دیتی ہے۔ غالب کے دیوان کو شروع سے آخر تک بڑھ جائے اس کا ایک ایک شعر اس معیار پر پورا اترے گا۔ یہ ہی وجہ ہے کہ غالب کا کلام جب پڑھئے سیا لطف آتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب کے کام میں اکثر استعار نثری طلب ہیں۔ اسی لئے اس کی متعدد نثریں لکھی گئیں جن میں طرح طرح کی مونگافیاں کی گئی ہیں یہ بحث ہمارے موضوع سخن سے خارج ہے کہ یہ نثر و جواہری اپنے مقاصد میں کہاں تک کامیاب ثابت ہوئے لیکن یہ امر مسلم ہے کہ غالب کے سوا زبان اردو کے کسی اور شاعر کے کلام کو یہ شہرت اور اہمیت اب تک نصیب نہیں ہوئی۔ اور نہ صرف اس لحاظ سے بلکہ دیگر خصوصیات شعری کی بنا پر آج ہمیں یہ فخر حاصل ہے کہ ہم دنیا کی دیگر مشہور زبانوں کے نامور اور عالمگیر شہرت رکھنے والے شعرا کے مد مقابل غالب کو پیش کر سکتے ہیں چنانچہ گزشتہ ستر سالہ زمانہ میں اس کے کلام کی خوبیوں کو جس بلند آہستگی کے ساتھ سراہا گیا ہے اور اس کی مدحت طرازی کی گئی ہے اس کے ثبوت کے لئے

گزشتہ سے پچھلے سال ۱۹۱۸ء میں سلسلہ آصفیہ کی پہلی کڑی کے طور پر شروع ایڈیشن شائع ہوا۔ میری یہ شرح تعلیم یافتہ طبقہ میں اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کے پانچ ایڈیشن اس وقت تک نکل چکے ہیں۔ (نظامی)

ان ضخیم خروں کے علاوہ ملک کے نامور مصور جتائی کا دیدہ زیب "مرقح" اور دیگر قسم قسم کے خوبصورت اور نظر فریب ایڈیشن موجود ہیں۔

کلام غالب کی قدر و منزلت کی یہ عالی شان عمارت جس کا سنگ بنیاد مولانا حالی مرحوم نے انیسویں صدی کے آخر میں "یادگار غالب" لکھ کر رکھا تھا آج "روح کلام غالب" کی اشاعت سے پایہ تکمیل کو پہنچ رہی ہے کسی شاعر کے ۱۰۰ بات کچھ کم قابل فخر نہیں کہ دیگر شعراء اس کی دوچار چیدہ حریفوں کے اشعار پر مصرعہ رئیس اور ان کی تصنیف کر کے اپنے کلام میں شامل کر لیں لیکن اردو کیا فارسی میں بھی کوئی شہرہ نامہ شاعر غالباً ایسا نہیں ہوا جس کے پورے دیوان کی تصنیف کی گئی ہو۔ کلام غالب کی قدرا فرائی میں یہ ہی ایک کمی تھی جس کو "روح کلام غالب" (جو غالب کی تمام غزلوں کی تصنیف ہے) بدرجہ اتم پورا کرے گی اور اس لحاظ سے غالب کے توصیفی لٹریچر میں اس کو ایک قابل قدر اور شاندار ادبی اضافہ شمار کیا جانا چاہیے۔

ادب و ادب میں تصنیف کا رواج دراصل فارسی کا اتباع ہے اردو میں فارسی غزلوں کی بھی تصنیف کی جاتی ہے اکثر شعراء خود اپنی غزل کی بھی تصنیف کرتے ہیں۔ یہ تصنیف دو قسم کی ہوتی ہے مثلث اور مخمس۔ مثلث میں اول مصرعہ تصنیف کا ہوتا ہے اور دو مصرعہ اصل نزل کے جس کی تصنیف کی جائے۔ مخمس یا پنج مصرعوں سے مراد ہے جس میں تین مصرعہ تصنیف کے ہوتے ہیں اور دو اصل غزل کے۔ اب زیادہ تر مخمس کا رواج ہے۔ مرزا عزیز بیگ مرحوم مصنف (روح کلام غالب) نے بھی مخمس ہی کو پسند کیا ہے یعنی غالب کے قصائد وغیرہ چھوڑ کر ہر غزل کے اشعار پر تین مصرعہ اپنے چسپاں کئے ہیں۔

تصنیف کی صرف یہ ہی خوبی نہیں کہ اس کے مصرعے اصل مصرعوں سے درست

مگر یہاں ہو جائیں بلکہ ان سے اصل شعر کے معانی اور مطالب کو خواہ وہ کہتے ہی دقیق اور
 لائیل ہوں اس لطافت کے ساتھ نمایاں کر دیا جائے کہ پوری تفسیں ایک ہی دل و دماغ
 کی شاعرانہ کاوشوں کا نتیجہ معلوم ہو۔ روح کلام غالب میں یہ تمام محاسن پوری طور پر نظر
 آتے ہیں لیکن چونکہ اول سے آخر تک ہر غزل کی تفسیں کی گئی ہے اس لئے اگر کہیں کہیں
 یکساں زور و قلم نسبتاً نہ پایا جائے تو التذاذ کا معدوم کی بنا پر نظر انداز کرنے کے قابل ہے۔
 واقعہ یہ ہے کہ مصنف نے پورے دیوان کی تفسیں کرنے میں اپنی پوری قوت شاعر
 صرف کر کے کلام غالب کی حزاب کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔ اس کی ادنیٰ خصوصیت یہ ہے کہ
 مشکل ترین اشعار کے معانی اور مطالب اس درجہ واضح ہو جاتے ہیں کہ کسی شرح کو دیکھنے
 کی ضرورت باقی نہیں رہتی اس لحاظ سے روح کلام غالب کو دیوان غالب کی تمام شرحوں
 پر فوقیت حاصل ہے اور اس کا اندازہ صرف اتنی بات سے ہو سکتا ہے کہ غالب کے جن
 مشکل اشعار کی شرح میں دیگر شارحین نے تشریں صفحے کے صفحے سیاہ کر دیئے ہیں ان کو
 مصنف روح کلام غالب نے نظم کے صرف تین مصرعوں میں اس فصاحت و بلاغت
 کے ساتھ لکھا۔ یا ہے کہ ہم اس کے شاعرانہ کمال کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور
 بے ساختہ زبان سے نکل جاتا ہے۔ ع

آفتاب آمد دلیل آفتاب

غالب اس کی تہ جیہ یہ ہو سکتی ہے کہ غالب اور مرزا صاحب مرحوم دونوں فطری
 شاعر تھے۔ مرزا مرحوم خود بھی ایک دردمند دل رکھنے تھے اور معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے
 غالب کی سیرت اور ماحول کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ مختصر یہ ہے کہ جو درد غالب کے کلام میں
 ہے اسی کی کسک مرزا کی طبیعت میں بھی موجود تھی خواہ حافظ نے خوب فرمایا ہے کہ

نال بلبل اگر بامنت سیریا ریست کہ مادو عاشق زاریم و کاہنا زار لیست
جب دو در در سیدہ چوٹ کھائے ہوئے دل ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور ایک
دوسرے کو اپنی داستانِ غم سناتے تو سننے والوں پر ایک کیفیت کا عالم طاری ہوتا ہے
یہی حالت اس تضمین کے مطالعہ سے ناظرین کے دلوں پیدا ہوتی ہے فرماتے ہیں :-

ذرا اس بے زباں دل کی صدا سن کچھ اپنی قدر دانی کا گلہ سن
یہ لعلِ بے بہا کہتا ہے کیا سن سن اے غارت گر جنس و فاشن
شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا

اس اپی آرزو پر مر مٹا ہوں کہ نصب العینِ چشم سرمہ سا ہوں
ہم تن شوقِ نظارہ ہوا ہوں لگا دے مجھ با چاہستا ہوں
تعا فلہائے تمکیں آزما کیا

ترا خیال و تصورِ ہر دل کو ہے محبوب اسی سے نامر نویسی کا شغل ہے مرغوب
مجھے امیدِ کرم اور تجھ سے ہو کیا خوب رہتا ہوں کہ تو اور یا سخن مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ عامِ فرس کا

کیا خوب شرح کی ہے

جنوں مانع ہوا استاد کا احسانِ ٹھکانے سے فراغت پا چکا روزِ ازل پڑھنے پڑھانے سے
رہا انکارِ عقل کل کو غیر لا بتانے سے فنا تعلیمِ درسِ بنی خودی ہوں اس زمانے سے

کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ بکستال پر

ایک مقطع کی تضمین ملاحظہ ہو جس میں غالب نے بوڑھے لپے کا رونا رو یا ہے

کچے مرزا کا حال کیا غائب بے طرح ضعت ہو گیا غائب
ہے یہ پیری بھی کیا بلا غائب مضمحل ہو گئے قوی غائب

وہ عناصر میں اندر ال کہتاں

غائب کے ایک شعر کی جس میں نوحید کا فلسفہ کوٹ کوٹ کر بھر ہے نصیبین کے
نین مصرعوں میں ایسی شرح کی گئی ہے جس سے شاعر کا مافی الصمیر صاف سمجھ میں آ جاتا ہے
لکھتے ہیں ۱۔

ہیں موصوفہ بخدا شرک ہر دل سے مفقود ہم معبود ہیں نہ کعبے کے نہ کعبہ معبود
رو بہ قبلہ میں تو صرف ایک جہبہ مقصود ہے پرے سرحد ادا کے ہے اپنا مسجود
قبلاہ کو اہل نظر قبہ مہمسا کہتے ہیں

غالب نے ایک شعر میں معشوق کے وصال کا ذکر کر کے عاشق کی خوش نصیبی
انوکھے طرز سے ثابت کی ہے جس میں زلفوں کی پریشانی کو شب وصال میں لطف
کا سبب ظاہر کیا ہے اور اسی طرح رات کی اور زلفوں کی سیاہی کی مناسبت فروغے
گئی ہے نصیبین نگارے اس میں چار جانہ لگا دیئے ہیں کہتے ہیں۔

ہم میں جو ہمیشہ تیرا رانیں اسکی ہیں صبح نظارہ میں کر دیتا ہے رانیں اسکی ہیں
اس بکلی وہ خوش نصیب ہے ہر آئیں اسکی ہیں نیند اسکی ہے دماغ اسکا ہر آئیں اسکی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

ایک شرح طلب شعر کی منظم تر ترجمان کی نصیبین میں ملاحظہ ہو۔

ہنسی یاروں نے کیا کی اک نصیب مجھ کو فرمائی نہ اب ہوش و حشر ہر طرف ناگھیلیاں
سکوں سا ہو گیا دل کو گیا سامان رسوائی نکو ہوش مانع بے ربطی شور جنوں آئی

ہوا سے خندہ اجباب بخیریب و دامن میں

جب غالب دہلی سے کھنؤ کے سفر کے لئے اس امید پر نکلے کہ نواب اودھ کی بارگاہ سے کچھ امداد لے کر بخت اشرف اور حرم محترم کی زیارت سے بہرہ اندوز ہوں گے تو راستہ میں ایک غزل لکھ کر ان جذبات کا اظہار کیا اس غزل کے دو شعروں کی تضمین قابل ملاحظہ ہے کس ثوبی سے واقعات کی تصویر کھینچی ہے۔

سقل حیران ہے کس وجہ سے چوڑی دہلی کچھ تو ہے جس لئے طے کی ہے مسافت اتنی
یک بیک چوڑی کیوں الفت راحت کھر کی نکھنؤ آئے کا باعث نہیں کھلا یعنی

ہو بس بیرون تانتا سودہ کم ہے ہم کو

جب چلے گھر سے تو تھی دلی میں بہاؤ کی لہر بیٹھ رہنا ہیں اور ترک سفر ہے اک قہر
قصہ ہے دور کا مانع بحر نہ ہو گردش دہر مقطع سلسلہ شوق نہیں ہے بہر شہر

عزم سیر بخت و طوف حرم ہے ہم کو

غالب نے اکثر موقعوں پر اپنے دقیق مطالب کی طرف اشارہ کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں عوام اس کو نہیں سمجھتے اور یہ ان کی فہم کا تصور ہے۔ اس مطلب کے ایک شعر کی تضمین ملاحظہ ہو۔ کیا خوب کہا ہے۔

میری تخموری پہ عبث قیل وقال ہے مطلب کو میرے پائے کوئی کیا مجال ہے
کہتا ہوں سب کچھ اور زبان میری لال ہے گر خامشی سے فائدہ اٹھائے حال ہے

خوش ہوں کہ میری بات سمجھی مجال ہے

غالب کے دیوان میں جہاں مشکل اشعار ہیں وہاں ایسے بھی شعر ہیں جو سہل متنوع کا حکم رکھتے ہیں ایسی غزل کے ایک شعر کی تضمین نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہو جس میں

تقسیم کی زبان بھی مرزا غالب کی زبان سے مل گئی ہے۔

ملاو آہ میں دھرا کیا ہے حاصل گریہ و بکا کیا ہے
اس ترپنے سے مدعا کیا ہے دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے

آخر اس درو کی دوا کیا ہے

سطور بالا میں تقریباً غالب کے ہر قسم کے اشعار کی تقصیر کے نمونے پیش کر دیئے
ہیں تاکہ ناظرین ”روحِ کلامِ غالب“ کی خوبوں کا صحیح طور پر اندازہ کر سکیں اور ان کو معلوم
ہو سکے کہ مرزا عزیز بیگ مرحوم نے غزل کے تنگ میدان کو مخمس بنا کر وسعت دینے میں
کہاں تک کامیابی حاصل کی ہے اور غالب کی اس آرزو کو کہ ان کے بیاں کی وسعت
کے لئے تنگنائے غزل سے زیادہ وسیع میدان درکار ہے کس حد تک پورا کیا غالب کے
اسی مضمون کے شعر کی تقصیر میں نہایت موزوں اسلوب اختیار کیا ہے فرماتے ہیں :-
سخن میں چاہیئے کوئی جدید طرزِ عمل کہ طبع تیز کا کچھ حوصلہ تو طبعِ نکل
نہ کیوں ہو حدِ تغزل میں رہے گی بیکل بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

مرزا مرحوم کی تقصیر کے متعلق اس قدر لکھنے کے بعد ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ دوسرے
شاعروں نے جو غالب کی بعض غزلوں کے حصے کئے ہیں ان کے مقابلہ میں مرزا مرحوم کی
تقسیم کا کیا درجہ ہے مثال کے طور پر میر جہدی مجروح دہلوی کے خمسوں کو جو غالب
کے ارشد تلامذہ میں سے تھے مرزا مرحوم کے خمسوں کے بالمقابل درج کرتے ہیں : مبصر اور
ناقدا ان کو پڑھ کر خود رائے قائم کریں :-

مرزا

یوں تو میرا علاج کیا نہ ہوا
 کم مرض ہی مگر ذرا نہ ہوا
 مجھ پر احساں طیب کا نہ ہوا
 درد منت کش دوا نہ ہوا
 میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا
 ہو گے رسوا تمھیں کہا مانو
 بات بڑھ جائے گی بہت یوں تو
 چل کے سن لو الگ جو سنتے ہو
 جمع کرتے ہو کیوں رقبوں کو
 اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا
 اور تجھ ساحس کہاں سے لائیں
 حسرت دل کی داد کس سے پائیں
 کس کے ہاتھوں کو نرم دل پر کھائیں
 ہم کہاں قسمت آزمائے جائیں
 تو ہی جب خیر آزمائے نہ ہوا
 سخن تلخ کب ہے ان کے قریب
 ان سے باتیں سننے یہ کس نصیب
 ہے حلاوت ہی کچھ سخن میں عیب

بحرِ جوح

کام نخواست سے کچھ روانہ ہوا
 در حاجت کسی پہ وا نہ ہوا
 کیا حقیقت کہوں کہ کیا نہ ہوا
 درد منت کش دوا نہ ہوا
 میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہو
 دے نہ راحم ان حبیبوں کو
 کہ جلائیں نہ بد نصیبوں کو
 رنج دیتے ہو ہم غریبوں کو
 جمع کرتے ہو کیوں رقبوں کو
 اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا
 کیوں عبت جا کے ایسا سر ٹکرائیں
 ناسحق احسان کیوں کسی کا اٹھائیں
 اس سے جیب آرزوئے دل ہی نہ پائیں
 ہم کہاں قسمت آزمائے جائیں
 تو ہی جب خیر آزمائے نہ ہوا
 رکھنا لذت جو ہے دہان جیب
 شہر مری کو وہ کہاں ہے نصیب
 کیا کہوں بات ہے عجیب غریب

بحرِ حُج

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
 گالیاں کھا کے بے مزاد ہوا
 فکر کی قسمت آزمائے کی
 یعنی اس شوخ کو بلائے کی
 یہ سنو بات دل حلائے کی
 ہے خبر گرم ان کے آنے کی
 آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
 جب سے عقل و تمیز آئی تھی
 تیرے ہی در پر جب سائی تھی
 دم بدم عاجزی فستائی تھی
 کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
 بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
 اس کی بخشش نے کی ذرا نہ کی
 کچھ تلافی پر ہم سے ہونہ سکی
 کیا بڑی بات ہم نے کی ابھی
 جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
 حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
 ان کے جب بحرِ فکر بہتے ہیں

مزرا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
 گالیاں کھا کے بے مزاد ہوا
 جب ہیں دھن تھی ان کے لائے کی
 استطاعت تھی گھر سب آنے کی
 اب جو بدلی ہوا زمانے کی
 ہے خبر گرم ان کے آنے کی
 آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
 جان طاعت ہی میں کھپائی تھی
 کچھ خودی تھی نہ خود نمائی تھی
 سر تھا سجدہ تھا جہ سائی تھی
 کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
 بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
 قابلِ فخر کیا ہے بات اپنی
 عین احساں ہے اس کی خوشنودی
 ہم نے اس پر نثار کیا شے کی
 جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
 حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
 مثلِ مزرا مصر وہ رہتے ہیں

مُجْرُوح

ہم تو مجروح غرق رہتے ہیں
آپ کیوں طعن ظنر بہتے ہیں
کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج عتاب غزل سرا نہ ہوا

ایضاً

لا تقنطو نوید ہے ام اکتاب میں
تراہد گماہ خلق ہیں وہاں کس حساب میں
ہے عرض یہ جناب تقدس مآب میں
کل کے لئے کر آج رختِ نزارب میں
یہ سوہن بے ساقی ہو کر کیا باب میں
گوارہ لئے دید میں بے قرار ہوں
ہرگز وہ یاں نہ آئیں گے میں کو طلب کرو
پر کچھ تو شغل چاہئے میرے کار کیوں کہوں
قامد کے لئے آتے خط اک اور لکھ کر کوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھتے جواب میں
شادی و غم کو عشق میں اک ارضیات ہے

ہزرا

جی میں گھٹ گھٹ کے پھوٹ پھتے ہیں
سب غم انتظار سہتے ہیں
کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج عتاب حزل سرا نہ ہوا

ایضاً

جام سو کو رکھ نہ بجا کر حساب میں
شامل نہ کر مصوچی کو شرب کے حساب میں
وہاں کچھ کی نہیں کہ ہو تو اہ ظراب میں
کل کے لئے کتاں نہ رختِ نزارب میں
یہ سوہن ہے ساقی کو تیرے باب میں
لکھ تو دیا اہیں کہ مرا حال ہے زبوں
ہے ان سے آرزوئے تسلی نرا جنوں
آگاہ انہی عادتِ خلعت کو خوب ہوں
قصد کے لئے آتے خط اک اور لکھ کر کوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں کہ جواب میں
وہ آج میرے گھر چلے آئے مست بے

اے ارتباط کی طوالت سے بدل کر اس کو مدت و اوقات اور بات کا نام قافیہ کرنا مزاحی غلطی ہے
معلوم نہیں یہ غلطی کہاں سے شروع ہوئی ہے۔

مخروج

اس میں کبھی حیات ہے گا ہے ممات ہے
 ہے طرفہ حال اور نئی واردات ہے
 میں اور خط و وصل خدا ساز بات ہے
 جان ندردینی بھول گیا اضطراب
 حکم خدا میں گو لب چون و چرا ہے بند
 مالک ہے وہ حقیر کرے خیرا ہے بلند
 پر دل تو اس خیال سے رہنا ہو فکر مند
 ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
 گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں
 ہمدرد! قہر نے بیتِ خاند خراب کے
 اوسان کھو دیئے دل بے مروت تاب کے
 آثار ہم سمجھ گئے ان کے عتاب کے
 ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
 ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں
 اہل نظر سمجھتے ہیں عالم کا کیا وجود
 ہے اس کی ذات پاک سے ہر چیز کی نمود
 ہولیک کو نہیں خبر نیستی و ہمد
 ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود

مرا

شکر خدا کہ ہو گئے قصے تمام طے
 جاتے ہوئے وصال کا وعدہ بھی کر گئے
 میں اور خط و وصل خدا ساز بات ہے
 جان ندردینی بھول گیا اضطراب
 یا تو ملائکہ سے بھی تھا مرتبہ بلند
 ہم سا نہیں ہے یا کوئی اب خوار و مستمند
 پہونچا رہا ہے ہر متنفس ہمیں گزند
 ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
 گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں
 بے پردہ کچھ اثر ہیں نمایاں عتاب کے
 لیکن ہیں چپ خیال سے شرم و حجاب کے
 آثار بات بات میں ہیں بیچ و تاب کے
 ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
 ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں
 اشیاء کی ہے تصویر انبیاء سے سب نمود
 دیکھا جو غور سے تو خیالی میں رب وجود
 ہستی کے واہنے کی ہر دستاورد ہست
 ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود

مخروج

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
 میں لکھ جاں سے اپنی خدا اس پہ ہوں مگر
 میری نذیتوں سے خوشی ہے وہ فتنہ گر
 ہے بار مبرا دشمن آرام کس قدر
 تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
 آئے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں
 رکھتے ہیں گونہاں وہ جمال نظارہ سوز
 سالن زیب رہتا فراہم لگے روز
 کلمہ سکھ سے تادرس رہے روئے دلفروز
 آرایش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
 پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں
 تا ہوں نہ اس کو میرے اٹھانے میں اہتمام
 منغل میں اس کی ہم نے نہ رکھا کسی کو کام
 یاں تو صیف نعال میں رکھا سرد مقام
 مجھ تک کب انکی بزم میں آتا تھا درحرام
 ساتی نے کچھ ملانہ دیا سو خراب میں
 گر شوخیاں جتا کے ملانا نگاہ کا
 مگر خرمناک ہو کے پھر نا نگاہ کا

منا

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
 کیا کہنے ہوتی تھی شب غم کس طرح بسر
 اختر شمار یوں ہی میں ہوتی تھی سحر
 توڑا ستم یہ اور نیا چشم شوق پر
 تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
 آئے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں
 گو خود نما نہیں ہے وہ پردہ نشیں ہنوز
 نظارگی نہیں کوئی اس کا کہیں ہنوز
 ہے محو ناز خود بھی وہ ناتواں فرہ ہنوز
 آرایش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
 پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں
 رہتے تھے ہم پیار جہاں سے خالص غلام
 اٹھتا تھا ایسی بزم سے میں روز نشہ کام
 پینے میں آج مجھ کو نہ ہو کس طرح کلام
 مجھ تک کب انکی بزم میں آتا تھا درخام
 ساتی نے کچھ ملانہ دیا ہو شراب میں
 آتا ہے یوں تو ان کو لڑانا نگاہ کا
 نظریں بجا کے سب کی ملانا نگاہ کا

مجرع

انداز دلبری سے جھکانا نگاہ کا

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا

لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

جب تک کہ پھر خاص مقدر ہی کا نہ جائے

بنتا نہیں ہے کام کوئی لاکھ گر بنائے

اس بات کا یقین کوئی کس طرح سے لائے

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے

جس سحر سے سفینہ رواں ہوا رہا میں

مقرر رنگ تو سہی میں یاں دست پابلائے

پر کیا کریں ملا ہی جب کوئی بر نہ آئے

یہ حال ہو تو خاکِ نعت کا لطف آئے

وہ ناکہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے

جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں

ملکِ عدم کے دیکھئے عازم پہ کیا بنے

اس رو میں ڈوبت ہیں سنب و فواز کے

یر جس میں بس ہی اپنا نہ ہو اس میں کیا کرے

رو میں ہے رخسِ عمر کہاں دیکھئے تھمے

لے ہاتھ باگ پر ہے نہ پاپے رکاب میں

مزا

آفت ہے ان مگر نہ اٹھانا نگاہ کا

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا

لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

جادو وہ چیز ہے کہ جو اسکو عمل میں لائے

مشکل سے مشکل امر کو آسان کر دکھائے

لیکن مجھے یہی تو ہے افسوس ہائے ہائے

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے

جس سحر سے سفینہ رواں ہوا رہا میں

وہ نالہ جو کہ عریض معلے کو بھی ہلائے

وہ نالہ جو کہ میں کو بھی زلزلے میں لائے

وہ نالہ اور کان نکلاں منور کے بجائے

وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے

جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں

کہتے ہیں صاف صاف یہ انداز چال کے

بسا نہیں عدم سے ادھر دم کہیں اسے

بے اختیار ہوں کہیں مجھ کو گرا نہ دے

رو میں ہے رخسِ عمر کہاں دیکھئے تھمے

لے ہاتھ باگ پر ہے نہ پاپے رکاب میں

مخروج

مخروج کو اس امر سے ہے خوب آگہی
اب وہ نہیں ہے بادہ پرستی جو پہلے تھی
بالکل ہی ترک کر دے ہو بہ ممکن نہیں ابھی
غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی

پیتا ہوں روزِ ابرو شبِ ہتاب میں

مرزا

تھے یارِ ہم پیالہ ہمارے سبھی کبھی
دیکھنا نہ ہم نے ہوش میں مرزا کو بھی کبھی
وہ دن کہاں کہ مشغل سے فرصت تھی کبھی
غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی

پیتا ہوں روزِ ابرو شبِ ہتاب میں

نوٹ: جس مصنف کے کلام کا مطالعہ کیا جائے اس کے حالات زندگی کا جاننا بھی

خالی از دل چسپی نہیں ہوتا۔ مرزا محمد ظفر بیگ نے جو مصنف مرحوم کے عم زاد برادر ہیں مرزا
کے ذاتی اور خاندانی صحیح حالات ہم پہنچائے ہیں۔ حالات بطور صمیمہ آمدہ صفحات
میں پڑھیں۔

خاکسار نظامی بدایونی

۳ مارچ ۱۹۳۵ء

حالات مصنف

(از مرزا ظفر بیگ صاحب سہا پوری)

خاندانی حالات | آپ کے جدا مجد مرزا اختیار مرحوم جیشانی مقام تیمو علاقہ روسی ترکستان کے قدیم ماندرت تھے جیسی پشت میں آپ کا سلسلہ نسب مرزا فریدوں بقتائی سے جو عرب امیر تیمور صاحب قرآن گوگانی کے زانوہر جلیس تھے مذاہبہ مرزا اختیار مرحوم انھار میں سدھائی سے آئی ہیں اپنے چند خاندانی بنگروں سے پرست۔ سکر دہلی اثر لیا ابے اس زمانہ میں شاہ عالم بادشاہ کی حکومت قائم تھی۔ ایک میں سر طرف قربان۔ مرہٹوں کو زور تھا اور حکومت بھی ہر ملک پران کے زیر اثر تھی۔ مرزا اختیار مرحوم شاہ عالم کے منور میں بنے ہوئے شاہ عالم نے مرزا مرحوم کے خاندانی حالات کی بنا پر بہت قدر دانی فرمائی اور ان کو اپنی خدمت میں معتمد خاص کے عہدہ پر مرفوع فرمایا۔ لیکن مرزا چونکہ فن سپاہ گری میں کمال دستگاہ رکھے۔ تھے اس وجہ سے کچھ دنوں کے بعد مرزا مرحوم کو فوجی فنکے میں کسی معزز عہدہ پر تقرر کر دیا گیا۔ مرزا مرحوم نے اپنی سن لیاقت سے تھوڑے ہی عرصہ میں سپہ سالاری کا درجہ حاصل کر لیا۔ مرزا مرحوم کی اس ترقی کے باعث ایک مرتبہ عوجی افسر کو رشک پیدا ہو گیا اور دونوں کے باہم جیشمک ہو گئی۔

اتفاقاً ایک روز مرزا مرحوم اور مرہٹہ سردار میں کچھ لفظی تکرار ہو گئی جس کی وجہ سے مرزا مرحوم کو اس قدر طیش آیا کہ فوراً تلوار نکال کر مرہٹہ سردار کا کام تمام کر دیا۔ مرہٹہ سردار کے قتل ہونے سے تمام مرہٹی فوج میں بیجان پیدا ہو گیا اور وہ سب کے سب مرزا مرحوم کے قتل کے دریغ ہو گئے۔ زندہ شدہ یہ معاملہ شاہ عالم بادشاہ کے روبرو پیش ہوا۔ مرہٹی فوج کے سرداروں نے مرزا کی شکایت کے دفتر کھول دیئے شاہ عالم بادشاہ نے مرہٹوں کے غم کو فرو کرنے کی غرض سے دفع الوقتی کے لئے مرزا مرحوم کو نظر بند کرنے کا حکم دیا اور اصل معاملہ کا فیصلہ کسی دوسرے وقت پر ملتوی فرمایا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ بادشاہ سلامت کی نیت یہ تھی کہ مرزا مرحوم کو کسی حیلہ سے ان کے وطن پہنچا دیا جائے۔ مرزا مرحوم ایام نظر بندی میں تسبیح و تہلیل میں مشغول رہتے تھے اسی حالت میں تین ماہ کے بعد ایک روز علی الصبح نماز سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ دفعۃً کلیجہ میں درد پیدا ہوا اور دو تین گھنٹہ کے بعد مرزا مرحوم نے شاہی قید ہی سے نہیں بلکہ قید حیات سے بھی نجات پائی **إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ**۔ مرزا مرحوم کی وفات پر ان کا تمام اثاثہ البیت صبط کر لیا گیا۔ مرزا مرحوم کی اہلیہ محترمہ اپنے دو صغیر سن بچوں کریم مرزا اور رحیم مرزا کو لیکر سہا پور رستہ بھلے آئیں چونکہ مرزا مرحوم کی اہلیہ نہایت تعلیم یافتہ خاتون تھیں اس لئے اہالیان سہا پور نے ان کی نہایت عزت کی اور انھوں نے ایک زمانہ مدرسہ قائم کیا جس میں علاوہ قرآن پاک کی تعلیم کے دیگر اخلاقی کتب ہائے فارسی کی بھی عمدہ تعلیم دی جاتی تھی یہ مدرسہ بہت عرصہ تک سہا پور میں جاری رہا۔ کچھ عرصہ کے بعد کریم مرزا اور رحیم مرزا بھی اپنی مکتبی تعلیم سے فارغ ہو کر جوان ہوئے۔ کریم مرزا محکمہ پولیس میں اور رحیم مرزا تحصیل سہا پور میں نائب ناظر

مقرر ہوئے۔ رحیم مرزا بیس سال کی عمر میں پانچ سال ملازمت کرنے کے بعد دفعۃً بحارِ صہ
 بیفہ ۱۸۶۵ء میں لاوہ فوت ہوئے۔ گریم مرزا نے حکم پولیس میں خاطر خواہ ترقی کی
 اور بہت عرصہ تک ضلع سہارنپور فتحپور اور بلند شہر میں معزز عہدوں پر کام کیا۔ ۱۸۵۶ء
 میں بلند شہر سے چھ ماہ کی رخصت لیکر تشریف لائے اور اسی زمانہ میں آپ کا انتقال
 سہارنپور میں ہو گیا۔ آپ نے اپنی وفات کے بعد تین لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑی تھی
 سب سے بڑے صاحبزادے مرزا محمد شفیع بیگ تھے جو عرصہ دراز تک ضلع سہارنپور کے
 مختلف تعانوں میں کوتوال رہے ایام ملازمت میں تین حج کئے اور ۱۸۶۲ء میں خانہ داری
 کے عہدہ سے پنشن پائی اور چھ سال تک پنشن پا کر ۱۸۶۷ء میں انتقال فرمایا۔ مرزا
 حکیم بیگ صاحب منجھلے صاحبزادے تھے آپ نے ۱۸۶۴ء میں امتحان مختار کاری پاس
 کیا آپ کا کام نہایت اعلیٰ پیمانہ پر رہا اور بہت بڑے کامیاب مختار کار ثابت ہوئے
 حکام ضلع آپ کی خاص طور پر عزت کرتے تھے آپ کا انتقال ۱۸۹۱ء میں ہوا۔ آپ
 نے اپنی وفات کے بعد کافی جائیداد زرعی و سکنی چھوڑی جو اب تک آپ کے بیٹوں کے
 کے پاس موجود ہے۔ مرزا وزیر بیگ صاحب سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ آپ
 ۱۸۶۱ء میں حکم پولیس میں ملازم ہوئے اور بہت تھوڑے عرصہ میں ترقی پا کر تھانہ دار
 کے عہدہ پر پہنچے تھے۔ بہت عرصہ تک ضلع سہارنپور میں مختلف مقامات پر تھانہ دار
 رہے۔ آپ نہایت قوی اور جسم تھے اب تک ضلع سہارنپور میں آپ کی طاقت کے کرسے
 بیان کئے جاتے ہیں آپ نے ۱۹۲۳ء میں انتقال فرمایا۔

مرزا عزیز بیگ صاحب مرحوم متخلص
 بہ مرزا سہانپوری مرزا وزیر بیگ

مرزا عزیز بیگ کی تاریخ پیدائش

صاحب مرحوم کے خلف الرشید تھے۔ آپ ۱۸۶۷ء میں بمقام سہانپور پیدا ہوئے۔
تعلیم و تلمذ | قرآن پاک وغیرہ کی تعلیم ختم ہونے پر آپ منشی مولوی حبیب الدین صاحب مرحوم المتخلص بسوزاں کے زیر تلامذہ میں داخل ہوئے منشی صاحب فن شاعری میں حضرت مرزا غالب مرحوم و مغفور کے خاص شاگرد تھے۔ ایک مدت دراز تک غالب مرحوم کی خدمت میں دہلی رہے۔ اور غالب مرحوم کے انتقال پر سہانپور تشریف لائے جیسا کہ سوزاں صاحب مرحوم نے ایک نغزل کے مقطع میں فرمایا ہے ۔

غالب سے کام تھا سو وہ سوزاں گزر گئے

دہلی میں اب جناب کا کیا کام رہ گیا

مرزا عزیز بیگ صاحب کو اوائل عمری سے ہی شعر و سخن میں خاصی دل چسپی تھی اس پر قابل استاد کی توجہ ذہن کی رسائی تھوڑے ہی عرصہ میں فارسی اور اردو کی غزلیں تصنیف فرمانے لگے۔ منشی صاحب مرحوم اپنے ہونہار شاگرد کی تیری طبع دیکھ کر انکی تعلیم میں بے حد کوشش فرماتے تھے۔ چند ہی سال میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ آپ کو فارسی زبان میں کامل دستگاہ تھی۔ عربی میں بھی خاصی بیاقت پیدا کر لی۔

شاعری | مرزا مرحوم ایک اعلیٰ ادیب اور شاعر تھے آپ ایک ایسے مخصوص رنگ کے مالک تھے جو اکثر ان کے ہمعصر شعراء کی ابتدائی روش سے قطعاً جداگانہ

حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کی شاعری آپ کی استادانہ حیثیت کی عین دلیل ہے ضلع سہانپور اور دیگر اضلاع میں آپ کے بہت شاگرد موجود ہیں۔ آپ کا طریق اصلاح قابل تحسین تھا۔ اپنے ہر شاگرد کے کلام میں اس کے مذاق اور علم کے موافق ایسی اصلاح فرماتے تھے

کے جس کا جواب مشکل ہے۔ ۱۹۱۵ء میں چند احباب کے اصرار سے حضرت مرزا غالب مرحوم و مغفور کے دیوان کی تفہیم لکھنی شروع کی۔ ماہ اپریل ۱۹۲۰ء میں اس اہم کام کو سن و حودہ اتمام کو پہنچایا اسی عرصہ میں آپ کو دردِ دل و دلچسپی کا دورہ پڑنے لگا اور اسی مرض میں چھ ماہ بعد ماہ اکتوبر ۱۹۲۰ء کے اخیر ہفتہ میں ۵۵ سال چھ ماہ کی عمر میں رحلت فرمائی۔ تاریخ وصال ۱۰ رورج مرزا بہشت میں پہنچی اناللہ وانا علیہ راجعون آپ نے اپنی وفات پر دولہ کیاں چھوڑیں۔

آپ نے ۱۸۸۵ء میں امتحانِ تمنا رکازی پاس کیا مگر شعرو سخن کا اسی درجہ

ذریعہ معاش و طرز معاشرت

شوقِ نقادگری کے کاروبار کو خاص ضرورتاً انجام دیا کرتے تھے اور ہندوستان میں صرف ایک دو مرتبہ کچھری تشریف لے جاتے اور جو کچھ وہاں سے یافت ہوتی اس کو اپنے صرف میں لاتے۔ جب تک وہ رویہ صرف نہ ہو جاتا اس وقت تک کچھری تشریف نہ لے جاتے۔ آپ کی قانونی قابلیت بھی قابلِ تعریف تھی۔ اکثر طلباء آپ سے قانون بھی پڑھتے تھے۔

مرزا کی شادی ۱۸۵۲ء میں آپ کے عم اکبر مرزا حکیم بیگ صاحب مرحوم کی دختر نیک اختر سے ہوئی۔ آپ کی اہلیہ محترمہ بھی علما و

شادی

قرآنی تعلیم کے اردو اور فارسی میں کافی لیاقت رکھتی تھیں۔ امورِ فانداری اور حسنِ انتظام میں لائقِ تعریف تھیں اس وجہ سے شہر کے معزز رؤسا و غیوہ کی لڑکیاں بغرضِ حصولِ علم ان کے پاس آتیں۔ آپ کا انتقال ۱۹۰۹ء میں ہوا مرزا مرحوم اس حادثہ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ جلسہ شعرو سخن اور دیگر دنیوی مشاغل کو ترک کر دیا۔ ہر چند

اعزاء و اقربائے مرزا مرحوم کی توجہ عقد ثانی کی طرف دلائی مگر مرزا مرحوم نے ایک نہ سنی اور آخر دم تک اپنی اہلیہ مرحومہ کی یاد لئے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے اس زمانہ میں ایک نہایت یرد و غزل لکھی تھی جس کے مطلع سے دلی حزن و ملال کا اندازہ ہو سکتا ہے شعر

یاد ہیں وہ دن کہ ہم تھے اور زمانے کے مزے
یاد آتے ہیں قفس میں آشیانے کے مزے

مذہب | مرزا مرحوم بہ اعتبار مذہب نہایت وسیع النہالی تھے۔ اعتقاداً و مذہباً
حنفی کے پیرو اور صوم و صلوة کے پابند نہ تھے۔ اگرچہ آپ کے پاس بسا
اوقات مختلف مذاہب کے اشخاص کا جمع رہتا تھا مگر آج تک کبھی ایسا دیکھنے میں
نہیں آیا کہ کسی صاحب کے مذہبی معاملات پر بحث یا گفتگو مرزا مرحوم نے کی ہو یا
دوسرے مذاہب پر کبھی نقیبانہ زبان طعن کھولی ہو۔ ابتداءً مرزا کو اپنے اور شوقین
طبع دوستوں کے اصرار پر محض رقص و سرود میں شریک ہونے سے انحراف نہ تھا مگر یہ سلسلہ
۱۹۰۴ء میں بالکل ترک کر دیا تھا اور سلسلہ نقشبندیہ میں حضرت مولانا الحاج مولوی
خلیل احمد صاحب مہاجر کی مدرس اول مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور سے بیعت کی
چنانچہ اس واقعہ کو مرزا مرحوم نے اپنی ایک نعتیہ غزل کے مقطع میں اس طرح پروانچ
کیا ہے شعر

بہت کچھ صحبت رندوں میں کھویا وقت اے مرزا
بس اب تو کچھ دنوں خدمت کرو اللہ والوں کی

اخلاق | آپ کا اخلاق نہایت وسیع تھا ہر خاص و عام سے نہایت خندہ

پیشانی اور تواضع سے پیش آتے تھے۔ آپ کی نشست گاہ میں احباب اور تلامذہ کا جلسہ رہتا تھا مگر ان کے جلسے میں کبھی کسی کی یہ مجال نہ ہونی تھی کہ کسی کی غیبت یا بدگوئی کرے۔ آپ نہایت کم سخن اور متین تھے بلا ضرورت کسی سے زیادہ شگلو نہیں کرتے تھے۔

فہرست غزلیات تضحیم شدہ

نمبر غزل	ردیف	مصرع اوٹے ہر غزل	صفحہ
۱	الف	نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا	۱
۲	"	دل مرا سوزِ نہاں سے بے کما باہل گیا	۲
۳	"	شوق ہر رنگ رقیب سرو سماں نکلا	۳
۴	"	دھمکی میں مر گیا جو نہ باپ بردخدا	۴
۵	"	دہر میں نقش وفا و جدِ نسی نہ ہوا	۵
۶	"	ستا کش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا	۶
۷	"	حرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا	۷
۸	"	جرم شاہنشاہ میں استعار کا دفتر کھلا	۸
۹	"	شب کہ برق سوزِ دل سے زہرہ ابر آہ تھا	۹
۱۰	"	نالہ دل میں شب انداز اثر نایاب تھا	۱۰
۱۱	"	بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آسان ہونا	۱۱
۱۲	"	دوست غمخواری میں میری سستی فراموش گئی کیا	۱۲
۱۳	"	یہ نہ بقی ہمارے قسمت کے وصال یار ہوتا	۱۳
۱۴	"	ہوس کو ہے نشاط کا کیا کیا	۱۴

نمبر غزل	روایف	مصرع اولے ہر غزل	صفحہ
۱۵	الف	در خورِ قبر و غصب جب کوئی ہم سا نہ ہوا	۲۳
۱۶	"	پئے نذر کرم تحفہ سے شرم نارسائی کا	۲۶
۱۷	"	گردِ اندوہ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا	۲۷
۱۸	"	دردِ منت کش دوانہ ہوا	۲۹
۱۹	"	گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا	۳۱
۲۰	"	جب بتقریب سفر یار نے محلِ باندہا	۳۲
۲۱	"	نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا	۳۳
۲۲	"	وہ مری ہیں جنہیں سے غم نہ ہاں بھجا	۳۴
۲۳	"	پھر مجھے دیدہ تر یا د آیا	۳۶
۲۴	"	ہوئی تاثیر تو کچھ باعثِ تاثیر بھی تھا	۳۸
۲۵	"	تو دوست کسی کا بھی ستم گرد ہوا تھا	۴۰
۲۶	"	عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا	۴۲
۲۷	"	ذکر اس پر یوش کا اور پھر بیاں اپنا	۴۳
۲۸	"	جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا	۴۵
۲۹	"	عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا	۴۷
۳۰	"	کچ میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا	۴۹
۳۱	ب	پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب	۵۰
۳۲	ت	آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست	۵۳
۳۳	۰	غیر یوں کرتا ہے پرش مجھ سے ان کے بھر میں	۵۴
۳۴	د	حسنِ غمرے کی کشاکش سے چٹا میرے بعد	۵۶
۳۵	ر	بلا سے ہیں جو یہ پیش نظر درو دیوار	۵۸

صفحہ	مصرع اوّلے ہر غزل	ردیف	نمبر غزل
۶۰	گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر	ر	۳۵
۶۲	کیوں مل گیا نہ تاب رنج یار دیکھو گھر	"	۳۶
۶۴	لہر تاپے مراد دل ز محبت جہر و رنشاں پر	"	۳۷
۶۶	ہے بس کہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور	"	۳۸
۶۹	مازم تھا کہ دیکھو میرا رستہ کوئی دن اور	"	۳۹
۷۱	حرلیف مطلب مشکل نہیں فسوں نیاز	ز	۴۰
۷۲	کیوں مگر اس بت سے رکھوں جان عزیز	.	۴۱
۷۳	نہ گل نغمہ ہوں نہ پیردہ ساز	.	۴۲
۷۵	زخم پر چہیز کیوں کہاں طفلانِ بے پروا، مک	ک	۴۳
۷۶	آد کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک	"	۴۴
۷۸	ہے کس قدر ہلاکِ فرب و فائے گل	ا	۴۵
۸۰	وہ فراق اور وہ وصال کہاں	ل	۴۶
۸۲	ممکن نہیں کہ بھول کے کبھی آرمیرہ ہوں	.	۴۷
۸۴	کی وفا ہم نے تو خیر اس کو جفا کہتے ہیں	.	۴۸
۸۶	آبرو کیا خاک اس گل کی جو گلشن میں نہیں	.	۴۹
۹۸	ہم سے کھل جاتا تو بوقت سے پرستی ایک دن	"	۵۰
۸۹	ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گناہ نہیں	"	۵۱
۹۰	ہر چند جاں گذارئی قہر و ستاب ہے	"	قطعہ
۹۱	مانعِ دشتِ نور دی کوئی تیرا نہیں	"	۵۲
۹۳	جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں	.	۵۳
۹۷	ملتی ہے خوں یار سے نار انتہا تب میں	"	۵۴

نمبر غزل	ردیف	مصرع اول ہر غزل	صفحہ
۵۵	ن	کل کے لئے کرا آج نہ خست شراب میں	۹۷
۵۶	.	حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں بگر کو میں	۹۹
۵۷	"	ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں	۱۰۲
۵۸	"	مالہ جز حسن طلب اسے ستم ایجا نہیں	۱۰۳
۵۹	.	نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتبار نہیں	۱۰۵
۶۰	.	تیرے توسن کو صابا بندھتے ہیں	۱۰۶
۶۱	.	دام پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں	۱۰۸
۶۲	"	سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں	۱۱۰
۶۳	"	دیوانگی سے دوش یزمار بھی نہیں	۱۱۳
۶۴	.	نہیں ہے رزم کوئی بحیرہ کے درخور مرے تن میں	۱۱۶
۶۵	"	مرے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں	۱۱۷
۶۶	.	دل ہی تو ہے نہ سنگ و ست درو سے بد نہ آسے کیوں	۱۱۸
۶۷	.	غنیہ، ماسکفہ کو دور سے مت دیکھا کہ لیں	۱۲۰
۶۸	و	وارستا اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو	۱۲۲
۶۹	.	قفس میں ہوں گر ایجا بھی نہ جانیں میرے شیون کو	۱۲۳
۷۰	.	دی سادگی سے جان پڑوں کوہ کن کے پانوں	۱۲۶
۷۱	.	واں پہونچکر جو غش آتا ہے ہم ہے ہم کہ	۱۲۷
۷۲	"	نم جانو تم کو غیر سے جو رزم و راہ ہو	۱۲۹
۷۳	"	گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیوں کر ہو	۱۳۱
۷۴	"	کسی کو نے کے دل کوئی نوا سنچ فغاں کیوں ہو	۱۳۳
۷۵	ی	مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے	۱۳۶

نمبر غزل	ردیف	مصرع اولے ہر غزل	صفحہ
۷۶	ی	بساطِ بحر میں بھائی ایک دل ایک قطرہ غم وہ بھی	۱۳۸
۷۷		غم دیا سے گر پائی بھی فرصت مراٹھانے کی	۱۳۹
۷۸	.	کیا تنگ ہم ستم زدگان کا جہان ہے	۱۴۱
۷۹	.	درد سے تجھ کو ہے میرے بے قراری ہائے ہائے	۱۴۲
۸۰	"	سرگشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے	۱۴۳
۸۱	"	گر فاستی سے فائدہ اخلائے حال ہے	۱۴۶
۸۲	"	عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی	۱۴۷
۸۳	.	اس جرم میں مجھے نہیں بنتی حیا کئے	۱۴۹
۸۴	"	رفتارِ عمر قطع رہ اضطراب ہے	۱۵۱
۸۵	"	دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پر رشک آجائے ہے	۱۵۲
۸۶	"	سادگی پر اس کی مر جائے کی حسرت دل میں ہے	۱۵۵
۸۷	.	دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی	۱۵۶
۸۸	.	تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر طے	۱۵۸
۸۹	"	کوئی دن گر زندہ کافی اور ہے	۱۵۹
۹۰	"	کوئی امید پر نہیں آتی	۱۶۱
۹۱	"	دلِ ناداں مجھے ہوا کیا ہے	۱۶۳
۹۲	.	کہتے تو ہو تم سب کہ بیتِ غالبہ موائے	۱۶۵
۹۳	.	پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے	۱۶۷
۹۴	"	بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے	۱۶۹
۹۵	"	ظلمتِ کردہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے	۱۷۲
۹۶	"	نہ ہوئی گر مرے مرے سے تسلی نہ سہی	۱۷۳

نمبر غزل	روایف	مصرع او لے ہر غزل	صفحہ
۹۷	ی	عجب نسا ط سے طلا د کے چلے ہیں ہم آگے	۱۷۶
۹۸	.	نگوہ کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے	۱۷۷
۹۹	"	ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے	۱۷۹
۱۰۰	"	اگر مہر خفا کو قرار نہیں ہے	۱۸۲
۱۰۱	"	ہجومِ غم سے یاں تک نہ نگرانی مجھ کو حاصل ہے	۱۸۳
۱۰۲	.	حسنِ بزم سے تو ناز سے گفتا رہیں آوے	۱۸۴
۱۰۳	"	حسنِ مدگر ہر ہنگام کمال اچھا ہے	۱۸۶
۱۰۴	"	غیر میں محفل میں بوسے جام کے	۱۸۸
۱۰۵	"	پھر اس انداز سے بہا سائی	۱۹
۱۰۶	.	کب وہ سنتا ہے کہانی میری	۱۹۳
۱۰۷	"	جس زخم کی ہو سکتی ہو زندہ میر و فو کی	۱۹۴
۱۰۸	.	یہاں آجیوں کو جتنا چاہیئے	۱۹۶
۱۰۹		ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے	۱۹۷
۱۱۰	"	نکندہ ہیں ہے غمِ دل اس کو سنا ہے رہے	۱۹۸
۱۱۱		وہ آکے خواب میں لشکینِ اضطراب تو دے	۲۰۰
۱۱۲	"	تپش سے میری وقف کش کش ہر تارِ بستر ہے	۲۰۲
۱۱۳	.	خطر ہے رشتہ الفتِ رگ گردن نہ ہو جائے	۲۰۳
۱۱۴	"	فریاد کی کوئی لے نہیں ہے	۲۰۳
۱۱۵	"	ہم رشک کو اسے بھی گوارا نہیں کرتے	۲۰۵
۱۱۶	"	دیا ہے دل اگر اس کو شہر ہے کیا کہیئے	۲۰۵
۱۱۷	"	دیکھ کر در پردہ گرم دامنِ افشانی مجھے	

صفحہ	مصرع اوئے ہر غزل	دولت	نمبر غزل
۲۰۹	یاد ہے شادی میں بھی ہنگامہ یا رب مجھے	ی	۱۱۸
۲۱	حضور شاہ میں اہل سخن کی آزمائش ہے	"	۱۱۹
۲۱۲	کبھی ٹکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے	"	۱۲۰
۲۱۳	باز بچہ اطفال ہے دنیا میں آگے	"	۱۲۱
۲۱۶	کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کیے	"	۱۲۲
۲۱۸	روئے سے اور عشق میں بے باک ہوئے	"	۱۲۳
۲۲۰	ابن مریم ہوا کرے کوئی	"	۱۲۴
۲۲۲	بہت ہی غم گیتی شراب کم کیا ہے	"	۱۲۵
۲۲۳	ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نہکے	"	۱۲۶
۲۲۵	مستی بدوقی خلعت ساقی ہلاک ہے	"	۱۲۷
۲۲۵	حسن جانیسم شائے کش زلف بار ہے	"	۱۲۸
۲۲۷	آئینہ کیوں دود کہ تماشا کہیں جسے	"	۱۲۹
۲۲۹	چپ بنگ وہاں رحم نہ پیدا کرتے کوئی	"	۱۳۰
۲۳۱	بہنم بہن لاور تمانی زاد ہے	"	۱۳۱
۲۳۳	منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی	"	۱۳۲
۲۳۵	غم کھاتے میں بودا دل ناکام بہت ہے	"	۱۳۳
۲۳۶	مدت ہوئی ہے یار کو کہاں کئے ہوئے	"	۱۳۴
۲۴۰	نوریا میں ہے پیر دوست جاں کے لئے	"	۱۳۵
۲۴۳	میں ہوں مشتاق جفا جھڑپ جفا اور بھی	"	۱۳۶
۲۴۵	آپ نے مستی الہی کہا ہے تو سہی	"	۱۳۷
۲۴۶	کی شرح نظم غالب تعین میں جو مرزا	"	قطبہ تاریخ
۱۵۴	تفصیل برکلام مولانا جامی، میر وحید اور تہذیب الدین سوزاں	"	ضمیمہ



کیا یہ منشا فضا زل میں کاتب نقد سیر کا
 ذرہ ذرہ ہو فنا اک روز پس تعمیر کا
 رنگ جھلکایے کیوں ہر چینیں تعمیر کا
 نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
 کاغذی ہے پیرزن ہر پیکر تصویر کا

درد و غم کرتے ہیں جو کچھ روح فرسائی پوچھ
 حسرتیں کرتی ہیں جو ہنگامہ رانی نہ پوچھ
 توڑتی ہے دل کو کیونکر ناشکیبائی نہ پوچھ
 کاؤ کا وسخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
 صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

آرزوئے قتل کو لب پر نہ لانا چاہیے
 ہاں مگر درد پرودہ تدبیر و تقاضا چاہیے
 کھینچ کہ خود آئے اشراق قل پر اتنا چاہیے
 جذبہ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے
 سینہ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

کوئی کم مایہ اگر برسوں طبیعت کٹائے
 غیر ممکن ہے کوئی نکتہ مے نکلتوں سے پائے

۱۵ بعض ستارہ میں نے اس شعر کو جب معنی قرار دیا ہے حالانکہ ایسا کہنا سراسر بے الصافی ہے ہر زاغالب نے
 عبدالرزاق شاکر کو اس شعر کی تشریح یوں لکھ کر بھیجی ہے : کہ "ایران میں رکھ ہے کہ وادخواہ کاغذ
 کے کپڑے ہیں کر حاکم کے سامنے جاتا ہے جیسے مشعل دن کو جلایا یا خون آلودہ کپڑا لباس پر لٹکا کر
 لے جاتا۔ بس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس شوخی تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورت تصویر ہے
 اور اس کا پیرزن کاغذی ہے یعنی ہستی اگرچہ مثل تصاویر اعتبار محض ہے موجب رنج و ملال
 و آزار ہے"

لاکھ سامع کان اپنے پیری باتوں جگائے آگہی دامِ نسیان جس قدر چاہے بجھائے
مدعا عتقا ہے اپنے عالمِ تفسیر کا
جوشِ وحشت جب مجھے تھمے نہیں تیا ذرا پھر ہے مزا سلسلہ بیکار قید و بند کا
ہیں کسے نزدیک طوق و رَسَن تو چیز کیا بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتشِ ریزا
موتے آتشِ دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

کیا بتاؤں آتشِ الفت میں کیا کیا جل گیا ساز و سامانِ ہستی کا سراپا جل گیا
جسم بالکل بھٹک گیا ہے اور کلجہ جل گیا دل مرا سوز نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا
مجھ کو دعویٰ ہے ہلا دیتی تیرا دل ہر صدا لیکن اب بے اثر ہے میں گجا اور تو گجا
نار ہو سکتا ہے اپنی حدِ امکان تک سا میں عدم سے بھی پرے ہوں نہ غافل باہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عتقا جل گیا
خیمہ جو آتشِ غم دل میں جھٹکتا ہے نہاں ورنہ پھر چھوڑ گئی کیا دنیا میں یہ برق تپاں
ذکر سے اسکے زبانِ شمع ہوتی ہے زباں عرض کیجئے جو ہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرایہ جل گیا
دیکھنے کو اب بھی ہے سرد چراغاں جسم زار دل کی ہستی پر ہے لیکن داغ کا دار و مدار

اب تو اک ظلمت کردہ سینہ ہے گوہے دافلا دل نہیں تجھ کو دکھاتا اور نہ غفل کی ہمار
 اس چہرا غاں کا کروں کیا کار فرما جمل گیا
 ہے فراق ہمنشیناں پر طبیعت مشتعل کر دیا سوز و گداز دل نے مژدہ مضمحل
 کوئی دل بھی تو نظر آتا نہیں غمش غل میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب دل
 دیکھ کر طرزہ تپاک اہل دنیا جل گیا

پنجرہ دیو جنوں دشمن داماں نکلا اس سے بکھر نہ کوئی تار گریباں نکلا
 تنگ ملبوس تین عاشق حیراں نکلا شوق ہر رنگ رقیب ہر وسایل نکلا
 قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا
 دل میں ٹھہری نہ سنال کوئی گھڑی بھی یاز کس ہلاکی اسے حاصل ہے روانی یاز
 حسرت بوسہ سو فار نہ نکلی یارب زخم نے داؤد دی تنگی دل کی یارب
 تیر بھی سینہ بسمل سے پراشتاں نکلا

لے اس شعر کا مطلب مرزا غالب نے خود ہی عہد رزاق شاکر کے خط میں اس طرح لکھا ہے "رقیب یعنی مخالف شوق
 شرمساں کا دشمن ہے دلیل یہ ہے کہ قیس جو زندگی میں نگاہ پڑا پھر تاتاق تصویر کے پردے میں بھی نگاہی رہا
 یہ ہے کہ محضوں کی تصویر باطن عرواں کی گھنٹی ہے جہاں گھنٹی ہے لے اس شعر کے متعلق مرزا صاحب نے
 شاکر کو لکھا ہے یہ ایک بات میں لے اپنی طبیعت نکالی ہے جیسا کہ اس شعر میں ہے نہ نہیں مذکور راحت
 حراحت پیکان ۷ وہ زخم تیغ ہے سکو دکشا ہے یعنی زخم تیر کی توہین بسبب ایک خندہ ہو گیا اور توہین کے زخم
 کی قسین بسبب ایک طاق سا کھل جانے کے زخم نے داؤد دی تنگی دل کی یعنی ناکل نہ کیا تنگی کو پراشتاں یعنی چٹا
 اور لفظ تیر کے مناسب ہے یعنی یہ کہ تیر کی دل کی داؤد کیا دتا وہ تو خود تین مقام سے گہرا گہرا پراشتاں اور زخم

کون ہے جسکو ہے جمیبت خاطر حاصل کوئی آشفۃ کوئی منشور میں داخل
گھر ہے یا ہے کوئی شوریدہ سروں کی منزل ہوئے گل تالوں دو در چرخ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

خوب لوٹیں مریے دلیں جو تھی نعمت درد کسکی تقدیر کو یوں ہاتھ لگے دولت درد
کیوں ہوتی مجھے ہر دم طلب کثرت درد دل حسرت زدہ تھا ماندہ لذت درد
کام یاروں کا بقدر لب و دندان نکلا

مدتوں دل کو رہی لذت آزار پسند تھارگ جاں کو دم خنجر خونخوار پسند
اب بقا پائی نہیں ہے ہمیں نہ ہار پسند ہے نوا موز فنا ہمت دشوار پسند
سخت مشکل ہے کر یہ کام بھی آسان نکلا

قطرہ اشک جو آنکھوں سے بہا یا غالب رشک دریائے شر کا لینے بنایا غالب
تار مزیں سے پھاڑ شکوں کا لگایا غالب دلیں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب
آہ جو قطرہ ز نکلا تھا سو طوفان نکلا

کہتا ہے کون عشق میں فرادزد تھا ہاں بخا جو کچھ توفیق سیابل نور تھا
وہ کیا جو کچھ ضعیفہ کے حملے میں سرد تھا دھمکی میں مر گیا جو نہ باب سرد تھا
لے نہ پاؤں طرف اشارہ کرتے ہوئے دلتے ہیں کہ سنئے عرف عشق کی دھمکی میں باکر ہی کی طرح جان نہیں دی سکریم
تو مردانگی کیسا ہے عشق اور معائب عشق کا مقابلہ تمام کر کرتے رہے۔

عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد متھا

کچھ وقفہ حیات جو مجھ کو عطا ہوا تھا اس میں بھی فنا کا تصور بندھا ہوا
گویا وطن میں تنہا درِ غربت کھلا ہوا تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا

اڑنے سے پیشتر بھی مارنگ زرد متھا

تحصیلِ درس صرف فکر چکا تھا میں الفت کے امتحان سے فاسخ ہوا تھا میں
بلے ہری زمانہ سے نا آشنا تھا میں تالیفِ نسخہائے وفا کر رہا تھا میں

مجموعہ خیال ابھی فرد فرد متھا

سیدہ کہ ایک تخریمِ عشق جنوں ہواب جو داغ ہے کز خم ہے وہ لالہ گوں ہواب
حالت ہر ایک عضو کی زار و زبوں ہواب دل تاجگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہواب

اس رہ گزریں جلوہ گل آگے گرد متھا

یاروں نے دل لگانے کو سمجھا ہے دل لگی حالانکہ آفتیں ہیں ہمیشہ نئی نئی
ممکن نہیں نجات ملے غم سے جیتنے جی جاتی ہے کوئی کش مکش اندوہ عشق کی

دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد متھا

حاصلِ غرض ہوئی نہ مرے قید و بند سے تھا مدعا کہ گھر میں یہ وحشی پڑا رہے
چھوڑی نہ اپنی خود آوارہ گرد نے احباب چارہ جوئی و حشت نہ کر سکے

زندوں میں بھی خیالِ بیا بیاں نور و نھا

میرزا یہ رسمِ ظلم و ستم کیا یہاں کی ہے مٹی خراب بیلِ ہندوستان کی ہے
شاکی جو اس زمانہ ناقدِ رواں کی ہے یہ لاشِ بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے

حقِ مغفرت کہے عجب آزاد مرد متھا

لے ماشیہ اگلے منور پر

دعہ پورا کبھی اس شوخ کا کوئی نہ ہوا قصہ کوتاہ وفا عہد وفا بھی نہ ہوا
فیض کچھ ہستی موبہوم سے اس کی نہ ہوا دہریہ نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا

سب غلط ہے کہ زبردہ وہی ہو گا اعلیٰ جس کا نظارہ کرے مارسیہ کو اندھا
کس طرح کہتے کہ پتھر میں اثر یہ ہو گا بسترہ خط سے ترا کا کلی سرکش نہ دبا
نہ زمرہ بھی حریف دم افغی نہ ہوا

اس سے بالوس ہوا ہوں کہ جہاں چھوٹوں جیتے جی دام غم ہوں تر با سے چھوٹوں
غیر ممکن ہے کہ میں رنج و بلا سے چھوٹوں میں نے چاہا تھا کہ اندوہ و فاسے چھوٹوں
وہ ستم گر مرے مرنے پر بھی راضی نہ ہوا

ماشہ عشا۔ آخر حشر جاں کو درختے عجیب آزاد مدح تلاش کیلئے بھی پابند کف ہوا گوارا دیا اور اپنی آزادی
مرکز ملی برقرار رکھی۔ حضرت ذوق نے بھی اپنی موت کے متعلق اسی قسم کا شعر کہا ہے۔

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گر گیا کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے
فالب صاحب سانپ اور زمرہ کے متعلق چودھری عبدالغفور کو اس طرح لکھا ہے۔ "قبول دعا وقت طلوع منجملہ

مضامین شری ہے جیسے کتابوں کا پرتو ماہ میں پھٹ جانا اور زمرہ سے افغی کا اندھا ہو جانا۔"
دام افغی۔ سانپ کی چھکار۔ زمرہ بزنگ کا قیمتی پتھر جسکے دیکھنے سے سانپ اندھا ہو جاتا ہے۔
آصف الدولہ ولی اودھ نے اس کا قہر کیا۔ سانپ کے سامنے زمرہ رکھا۔ لیکن سانپ اندھا نہ ہوا۔ فالب صاحب
نہ انکی تائید میں بزنگ کو زمرہ اور زلف کو سانپ سے تشبیہ دے کر معیون پیرا کیا ہے۔

ہم جو اس دم میں کمزور ہیں تو کمتر ہی رہی کم ہیں زہاد سے زندوں کے برابر ہی رہی
آئینہ اپنا کمتر ہے مسکدر ہی رہی دل گزر گاہ خیال سے وسا غری رہی
مگر نفس جاوہ سیر منزل تقویٰ نہ ہوا

ہو رہے تھے ترے لانے میں جو معروف ابھی مجھ کو ممنون بنائے کو تھے احباب سبھی
کھل گئی ان کی غرض تو نے بھی ٹالے تھی ہوں تیرے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کہ کبھی
گویش منت کش غلبا نگ تسلی نہ ہوا

کس سے دل کھول کے کچھ شکوہ کلفت کیجئے کون ہے کس سے بیان غم و حسرت کیجئے
کس دعا کے لئے امید اجا برت کیجئے کس سے غرومی قسمت کی شکایت کیجئے
اُم نے چاہا تھا کہ مر جائیں ہو وہ بھی نہ ہوا

ذکر کرتا تھا مسیحا کا جو سب سے غالب تنگ مرزا تھا غم ورنج و تعب سے غالب
منتظر مرگ کا تھا دیکھئے کب سے غالب مر گیا صدر ربیع جنبش لب سے غالب
نا توانی سے حریف دم عیسیٰ نہ ہوا

نہ کچھ مرغوب نہ کھو نہ کو ہے نظارہ گلستاں کا نہ سوا اس میں ہر حسن و جمال جو و غلماں کا

۱۵۔ دم عیسیٰ عیسیٰ کی پھونک حضرت عیسیٰ ایک بردست پیغمبر گزشتے ہیں اچھے ماننے والوں کو مسلمان کہتے ہیں مسلمان
بھی انکو پیر مانتے ہیں انکا بوجہ تھا کہ اپنی پھونک سے مر وہ زندہ کر دیا کرتے تھے۔ فرماتے ہیں سیکھنے والے حیات
پینے کیلئے لب ہلائے مگر میری ناتوانی کو جنبش لب بھی گلن گزری اور یہ صدمہ میں بڑانت نہ کر سکا۔ (باقی مشہر)

ہمارا دل ہے وارفتہ بہارِ بزمِ جانان کا ستائش کر ہے زاہدِ مستندِ حسنِ خانِ ضیواں کا

وہ اک گلِ دستِ بہیم بخود کے طاقِ نسیاں کا

لیا کرتا ہے کام ابرِ مے سے ظالمِ بیخِ بڑاں کا شمار آساں نہیں جود و جہانِ چشمِ فتاں کا

مگر اس پر بھی دل تسبیحِ خواں، نامِ جانان کا بیاں کیا کیئے سیدِ اکاوشِ ثہاے شرکاں کا

کہ ہرک قطرہ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

بہت کچھ سخی و کوشش کی کہ کو کوئی لے نالو کو لبوں تک بھی نہ آنے دوں کبھی سینے سے نالوں کو

مردِ دی صورت نے نہیں دہراں نے نالوں کو نہائی سُطوتِ قاتل بھی مانعِ مے نالوں کو

یہاں دانتوں میں جوتہ کا ہوا ریشہِ سیناں کا

خدا نا خواستہ داغِ جگر اپنا جو جل اٹھے زبانِ شمع پیدا ہوا بھی ہر اک مہنِ موسے

ابھی دیکھئے کہاں ہیں تھے شعلے سوزِ باطن کے دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرغتِ زمانے نے

مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے مگر پھر اغاں کا

نظر آنے لگے چاروں طرف اکھوں میں تجھ سے درو دیو اتیرے عکسِ رخ سے ہلکا اٹھے

ہوئے آثارِ ظاہر یک بیکِ حدت میں کثرت کے کیا آئینہِ خاندان کا وہ نقشہ تیرے جلوئے

کے جو پر تو غورِ شیرِ عالمِ شہنشاہ کا

بظاہر کتنی حکمِ خاندان کی بسا رکھی مگر خود سخیِ صانعِ وجہِ اسبابِ فنا نکلی

بنے گی صاعقہ اک دن یہی صانع کی دل گری مری تعمیر میں مضمحل صورتِ خرابی کی

گزشتہ سے پیوستہ۔ جو جنبشِ لبِ زندگی بخشے والی تھی میرے لئے موت کا باعث بن گئی۔

ہیولے برقِ خرم کا ہے خونِ گرگ و تنہا کا

دمِ ہیجان و حشت پاؤں میں ہوتا ہے اک چکر مری اہولے بن بکر گولے اٹھتے ہیں طن بھر
یہ نوبتِ محن کی پہنچی کہ تپشک زن ہے محرابِ اکا ہے گھومیں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
دلِ راب کھولے پر گھاس کبے نیمے دریا کا

میرے جل جھینے کی دنیا کو ماتی جستیوں میں ہیں جگر کی آگ کا اظہار کم ظفوں کی خوشی میں
نہ شکوے میں نہ لب پر سوزِ دل کی گفتگو میں ہیں خوشی میں نہال خود گشتہ لاکھوں از رویں میں

چرخِ مردہ ہوں میں بے زباں گو غریبا کا

تصور میں جو وہ تصویر پر انوار باقی ہے یہ اک شکل تسلی بخش جان زار باقی ہے
ہوئے ہم خاک اس کی گری بازار باقی ہے ہنوز اک پر تو نقشِ خیال یار باقی ہے
دلِ افسردہ گو یا جڑہ ہے یوسف کے زندان کا

مری قسمت بری ہے آپ ہوتے ہمنشینِ رنہ یہ دوری دیدہ و دانستہ ہے بہتے قریں ورنہ
پسند اید اپنے کرتے کیوں مجھے اندوگہیں رنہ بغل میں غیر کی آج آپ سوئے ہیں کہیں رنہ

سبب کیا خواب میں اگر تم مٹے پائے نہاں کا

سبب تیری خوشی کا میں نے مٹانے کو بکھا تھا ترا غم دیکھ کر غم کو قلع ہے اپنے مرنے کا
یہ میری تعزیت اور سب سے مل ملکر تزار ونا نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیرے شرکا کا

کھلا ہے سامنے منظرِ عدم آباد کا غالب سمجھتا ہے اسے مرزا سفر کا مٹنا غالب

اسی میں منتشر ہوتے ہیں اور اوراق غالب
نظر میں ہے ہماری جاوہ راہِ فنا غالب
کر یہ شیرازہ ہے عالم کے اجڑا پریشاں کا



کیوں ہو رہا ہے خیفۂ تربط نواز کا گرویدہ کس لئے ہے عاق و حجاز کا
ہے ہرزباں پر راگ اسی بے نیاز کا محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

خنداں جو میرے حال پر وہ ماہ پار ہے جاگے نصیب اونچ پر اپنا ستار ہے
پڑ مرگیا یہ میری خوشی کا اشارہ ہے رنگ شکستہ صبح بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

ملتا بھی ہے جو مجھ سے تو آمادہ ستیز دشمن کے ساتھ رام ہے مجھ سے رگ و گریز
مجھ سے تنف اور رقیبوں سے خیر و میز تو اور سوئے غیرِ نظر ہائے تیز تیز
میں اور دکھ تری مژدہ ہائے دراز کا

بیتاب ہوں گا صورتِ برق و شمر نہی نالہ کروں گا درد سے شام و سحر نہی
خاموش ہوں جتاؤں گا دردِ گلِ نہی حرف ہے قبطِ آہ میں میرا و گرنہ میں
کلمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

سب کے ہیں اسکی بزمِ میلِ رماں نکل ہے آبِ بقا کے چشمہ ہیں گویا اُبل رہے

مستوں میں پہ پہے ہیں عجب دور چل ہے ہی بسکرو خوش بادہ سے خیشے اچل ہے
ہر گونہ بساط ہے سرشیشہ باز کا

اُس کو ہے رات دن طلب تیر سینہ دوز مطلوب اس کو شام و سحر سوز سینہ سوز
اس بواہوس کو چاہیے اک زخم تازہ روز کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہنوز

ناخن پہ قرض اس گرہ نیم باز کا

مرزا کے دل کی پوچھتے ہو بات کیا اسد صدقے میں عشق کے بیجر گھر ٹا اسد
بر باد مفت گنج ہوا ہر گیس اسد تاراج کاوش غم بجا ہوا اسد

سینہ کہ تھا دھینہ گھر ہائے راز کا



ہو نوید اہل سخن کو خیر کا منظر کھلا باب بیل وجود گو یا کتہ سخنوں پر کھلا
اس جہان سے مگرداد و ہش کا در کھلا بزم شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا

رکھو یا رب یہ در گنجینہ گو ہر کھلا

زینت بزم فلک کا حال جب مجھ پر کھلا تب مسرت سے ذرا اپنا دل مضطر کھلا
شاہِ خار چھپ گیا روتے میر انور کھلا شب ہوئی پھر انجم زرخندہ کا منظر کھلا

۱۔ ان مشاعروں کا طرف اشارہ ہے جو حضرت بہادر شاہ ظفر کے زیر پرستی قلعہ علی میں ہوا کرتے تھے اور
جن میں مرزا صاحب بھی شرکت کیا کرتے تھے ۲۔ دوسرے شعر میں شاہو کی چہل پہل اور رونق کو بتکرار کے
حسن و جمال سے تشبیہ دے کر ایک لطیف بات پیدا کر دی ہے۔

اس تکلف سے کہ گویا بت کردہ کا در کھلا

چاہیے مدت اگر یاروں کے گناؤں فریب انکی ہر اک بات میں چاہوں تو دکھلاؤں فریب
اعتبار انکے مجھے کیونکر ہو جب پاؤں فریب گرچہ ہوں لیوانہ پر کیوں دست کا کھاؤں فریب

آستیں میں دشنہ نہ ہاں ہاتھ میں نشتر کھلا

بزمِ زمیں سے اس بڑاؤ کی کب حتی امید نشہ میں آئندہ ملنے کی بھی دیتا ہے نوید
اس خوشی میں ہے دل وارفتہ نگر مگر نشید گو نہ سمجھوں انکی باتیں گو نہ پاؤں اسکا بھید

پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پہنکر کھلا

عمر بھر دل میں رہا شاہد پرستی کا خیال اب حقیقت کھل گئی اسکی کہ تھا اچھا خیال
اس بہشتی رو کا آخر آج کام آیا خیال بے خیال حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال

خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

واہ کیا ہنسنے کا زینت دہے حسن و نشیں حسن کے پر تو سے ہو جاتا ہے زیور بھی حسین
نور سے اس لئے تباہاں ہے ہنسنے خوشہ چین منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں

زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

گھر کی ظلمت دیکھ کر یہ فائدہ بول بولوں جو بلا نازل ہو سر پر بچکوبے دل سے قبول
کیونکہ شب تیرہ کا شکوہ لب تک آنے دوں قبول کیوں نہ چھری ہو شب غم ہے بلاؤں نزول

آج ادھر ہی کو بے گادیہ اختر کھلا

جب کیا قصد سفر تو تھا طبیعت میں خیال اپنے برگانوں کی الفت چمکے دل سے نکال
کر دیا ترک وطن ترکِ تعلق ہے محال کیا رہوں بت میں خوشی جب خود ادا نکال

نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ برا کتر کھلا

میں نے دل پر نقش کر لی حضرت مژا کی پند
 آستانِ غیر پر کیوں جاؤں ہو کر مستمند
 چاہلو سی اہل و دنیا کی نہیں مجھ کو پسند
 اسکی امت میں ہوں میں میسے یہیں کیوں کار بند
 واسطے جس شہ کے غالب گنبد بے در کھلا

۹

اسکی آمد کے تصور میں جو میں بے تاب تھا
 نیند کا آنکھوں میں ناک خیال خواب تھا
 اشکباری سے رواں اک سیلِ خونِ ناب تھا
 شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرِ ابراب تھا
 شعاعِ جواہرِ ہر اک حلقہٴ گرداب تھا
 کنجِ تنہائی میں میں تھا اور وہاں دربارِ عام
 وہ عدسے کے ساتھ ہنسنے تھے مجھے رونے سے کام
 میں بہا تھا یہاں نسو وہاں تھا دورِ جام
 وال کرم کو غدرِ بارش تھا افعالِ غیرِ حرام
 گر یہ سے بیاں پینے بالمش کفِ سیلاب تھا
 میں یہاں سنبل کی صورتِ غم سے تھا آشفہٴ حال
 اور وہاں راستہ ہونے سے زلفونکے جال
 تھی یہاں حیرت ہاں تھی آئینہ کی دیکھ بھال
 و ان خود آرائی کو تھا موتی پرٹنے کا خیال
 بیاں ہجومِ اشک سے نازِ نگہِ نایاب تھا

لے قطع میں قلابِ ماسٹ شبِ معراج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ میں بھی امت میں ہوں جن کے لئے عرش
 پہنچا ہے وقتِ آسمان کے دروازے کھل گئے تھے پھر میرے کام کس طرح بند رہ سکتے ہیں وہ بھی کھل جائیں گے۔
 معراج اہل اسلام کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک رات حضرت محمدؐ کو دگر بنیاد سے ان کا درجہ بلند کرنے
 کے لئے عرشِ پر بلا یا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک خاص سواری (براق) پر سوار ہو کر آسمانوں کا فاصلہ طے کر کے
 اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچے تھے۔

وہ وہاں کرتے تھے ہاتھوں سے حلائی شست و شو
بہرہ تھا دل یہاں سینے میں ہو ہو کر اہو
چاند ناگلشن میں تھا ظلمت یہاں تھی چارو
جلوہ گل نے کیا تھا واں چہراں آب جو
یاں رواں شرکان چشم تر سے خون نابتھا

سو گئے وہ سنتے سنتے قصہ خواں کی گفتگو
اور یہاں برسا کیا تا صبح آنکھوں سے اہو
فرش راحت پر و تھے اور ہم پریشاں کو کبھو
یاں مشورہ کیے خوابی سے تھا دیوار جو
واں وہ فوقِ ناز جو بالِش کم خواب تھا

نقی یہاں کبھی مونس وہاں مغل جمی
تھا یہاں دل صرف غمِ عشرت وہاں دہشت
وہاں تھے شمعِ مغل نقی یہاں کب لو لگی
یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بخودی
جلوہ گل واں بساطِ محبتِ احباب تھا

عیش میں وہ غوتھے میں دردِ غم میں مبتلا
وہ وہاں خنداں و فرحاں میں یہاں گمراہ
وہ وہاں سرشارِ بادہ میں یہاں لبتہ تھا
فرش سے تاعش واں طوفاں تھا صبحِ رنگ کا
یاں زمیں سے آسمان تک سوختن کا باب تھا

شوقِ جب سے زیادہ مجھ کو ٹپانے لگا
سببِ سوزاں میں میرے گھر کا لے لگا
چپکے چپکے میں کچھ اپنے جی کو سمجھانے لگا
ناگہاں اس رنگ سے خونابرِ ٹپکانے لگا
دل کر دوق کاوشِ ناخن سے لذتِ یاب تھا

شوق میں مضطرب مثالِ ماہی بے آب تھا مضطرب ایسا کہ گویا برق تھا سیماب تھا
اسکی حالت سے پر لپٹیاں جلسہ ہوا تھا نالہ دل میں شب انداز اثر نایاب تھا
تھا سپندِ بزم وصل غیر گوشتِ باب تھا

رشدِ نالہ ہی اس سے گوش زد تھے مثلِ نئے یاد ہی اسکے سوا گویا نہ تھی کچھ اور لئے
جوشِ گریہ کے سوا بھاتی نہیں ہر کوئی شے مقدمِ سیلاب سے دل کی ناشائستہ گنگ ہے
فائدہ عاشقِ مگر سازِ صدائے آب تھا

اسکے ذرہ کی خاک کو طلس کہوں یا کہوں اس زمین کے فرش کو یا فرشِ نخل کا کہوں
ہے بجا قائم سے نرمی میں اگر اگلے کہوں نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں
پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ بنجاب تھا

تھا اسی کے نور کا ہر چیز میں جلوہ عیاں ہو گیا کچھ پردہ غفلت ہی عاملِ درمیاں
حیف ہے یونہی گئی محرابِ فردی رائیگاں کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارمانے ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روشِ خورشیدِ عالمِ تاب تھا

یاد ہے صیاد اپنا وہ زمانہ بھی تجھے آب و دانہ کی ہمارے فکر رہتی تھی تجھے
بیکسو کے حال سے غفلت نہ تھی اتنی تجھے آج کیوں پروا نہیں اپنے اہم و نکی تجھے
کل تلک تیرا ہی دل نہرِ وفا کا باب تھا

آخرے صیاد کیا ضد ہے تجھے کچھ تو بتا دیکھ کر مجھ کو جو تونے دام اکٹھا کر لیا
شوق سے یوں تیرے پھنڈ میں کوئی آیا بھی تھا یاد کرو وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا
انتظار صید میں اک دیرہ بے خواب تھا

ہونے والا تھا بیا طوفان اسکے انگ سے پوچھنے کیا ہو کہ اک اک قطرے دریا ہے
خیریت ہی ہو گئی مرزا کہ آنسو تم گئے میں نے روکارات غالب کو وگرنہ دیکھتے
اسکے سیل گریں گریں گریں کف سیلاب تھا

۱۱

ہم جو چاہیں کسی ذرے کا بیاباں ہونا ہے عبت چارہ و تدبیر میں حیراں ہونا
محنت کا کبھی ممکن نہیں امکاں ہونا بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

ابر فرغاں نے جو ٹھہرائی ہے رسالے کی نوبت آئے نہ کسی دن کے بہر جانے کی
شکل ہونے لگی ہر گوشے میں برائے کی گویہ چاہے ہے خرابی مرے کاشلے کی
درو دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

بس جو دل پر ہو میرا کچھ تو اسے روکوں تو میں اس آواہ کا تا چند ہونگا دل جو
اپنے انجام کو سوچوں یہ مجھے ہوش بھی ہو وائے دیوانگی شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیراں ہونا

بخت آئینہ تیرے حسن سے کیا چمکا ہے سامنے آنکھوں کے پردہ بخزینا ہے
خود نمائی کا جو ہے شوق تو بجا کیا ہے جلوہ از بس کہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جو ہر آئینہ بھی چاہے ہے مڑگاں ہونا

حاصل آنکھوں کو ہے جو ذوق کئی مت پوچھ انبساط دل سرگرم تماشا مت پوچھ
حسرتیں آج نکلنے کو ہیں کیا کیا مت پوچھ عشرتِ قتلِ گہر اہل تماشا مت پوچھ
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عسریاں ہونا

یوں تو ہر دل میں ہے کس دل میں ہیں نشاط ہاں جگہ دل میں ہمارے ہی نہ کی وائے نشاط
جیتے جی میں رہی جوشِ سودائے نشاط سگے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط
تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

عشق نے ذوق ہر اک چیز کو بخشا ہے جدا سینہ مشتاق سناں مرکو تبر کا سودا
جان بیتاب کو ہے شوقِ فدا ہونے کا عشرتِ پارہ دل زخمِ تمنا کھانا
لذتِ ریشِ جگر غرقِ نسکداں ہونا

جیتے جی میرے نہ کی مکر و دغا سے توبہ نہ تم سے نہ کسی جرم و خطا سے توبہ
بھول کر بھی تو نہ کی خوفِ خدا سے توبہ کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زور و پشیمان کا پشیمان ہونا

ہوتی ہے حضرتِ مرزا کو جو وحشتِ غالب پھر تو آجاتی ہے بلبوس کی شامتِ غالب
جیبِ اس کی تو ہوتی ہے بُری گتِ غالب جیفِ اس چارگرہ کپڑے کی قمیصِ غالب
۱۵ (ماہِ اگلے صفحہ)

جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گرہاں ہونا

۱۲

مجھ سے غم آشام کا احباب غم کھائیں گے کیا
خوگر کلفت کو وہ آرام پہنچائیں گے کیا
جوشِ وحشت کے ہوتے زخم سلوائیں گے کیا
دوست غمخواری میں میری سخی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھائیں گے کیا
یہ جفاکاری روا رکھو گے ہم پر کب تلک
اس طرح مالو گے قصہ سن سنا کر کب تلک
ہو گی آخر حاجتِ عرض مکر کب تلک
بے نیازی حد سے گذری بندہ پر کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا
دوست کیوں پند نصیحت پیتے ہیں خواہ مخواہ
مجھ کو کچھ دیوانہ سمجھا ہے کسی نے واہ واہ
ہوں تحیر میں کہ آخر کیا ہوا مجھ سے گناہ
حضرت نامح جو آئیں دیدہ و دل فرشتہ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا
قتل گہرے روز کو نا کامیاب آتا ہو گیا
وقتِ عرضِ مدعا قاتل سے شرماتا ہوں میں
دیکھئے تو راہ پر کینہ مکر انھیں لاتا ہوں میں
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
غدر میرے قتل کرنے میں وہ ابلاویں گے کیا

حاشیہ گذشتہ صفحہ کا: مرزا صاحب کو ایک دفعہ زندان میں لگی جلتا پڑا رہائی کے دن جب وہ چلنے لگے اور
باس تبدیل کوئے کا سرِ تلخ آیا نوکرت وہیں پہاڑ کر پہنچا اور یہ شعر پڑھا ہے
حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گرہاں ہونا

چارہ سازوں نے جو زخموں کا بندھا لیا ہے یہی بہانہ دشت کا دوا یوں ہے
ہو نہیں سکتا جو کوئی اور چارہ یوں ہے مگر کیا نامح نے مجھ کو قید اچھا یوں ہے

یہ جنوں عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا
ہتھکڑی اور طوق گردن گیر سے کھینکے گیوں
اس مناسب چارہ و تندرست سے بھاگیں گے گیوں
خاندان زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے گیوں
ہیں گرفتار و فائزنداں سے گھبرائیں گے کیا

یوں تو ہے یہ شہر اک منزل گہہ شہر تہ اسد
ہر طرف ہے عیش کے سامان کی کثرت اسد
پیش ہے بایں ہمہ مرزا کو یہ دقت اسد
ہے اب اس معمورہ میں قحط غم الفت اسد

ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھاویں گے کیا

لے مرزا قاتل ہے پر نہیں کب یہ غزل کہی ہوگی مگر مقطع کے مصرعہ ثانی کا مضمون مندرجہ تحت خط سے وابستہ نظر آتا ہے جب
کہ وہ معائب و مغلطہ سنی کا شمار ہو کہ دلی کو خیر باد کہے کا ارادہ کر چکے تھے فرماتے ہیں :-

”خوشی مجھ میں تم میں مشترک ہے مجھے تہنیت دی تو مبارک و میں نے تمہیں تہنیت دی تو مناسب الحمد للہ الشکو
بھائی پر تو یوں ہے کہ ان دنوں میں میرے پاس ٹکٹ نہیں اگر ہرگز نہ بچوں تو کہاں رہا نہ اٹھ نہیں سکتا ڈاک گھونک جائے کون؟
اپنا مقصود تھا کہ والدہ ماجدہ سے اور تہہ پاری جہہ ماجدہ اور تہہ لکے غم عالی مقدس سے کہہ چکا ہوں، خلاصہ یہ کہ میری بیوی اور
بچوں کو کہ یہ پہلی قوم کے ہیں مجھ سے ملے ہو۔ میں اب اس وجہ کا تحمل نہیں ہو سکتا، بھوں نے یہی بشرط ان لوگوں کے دوبارہ
حاصل اس خواہش کو قبول کر لیا۔ میرا مقصد سیاحت کا ہے، فیشن اگر کھل جائیگی تو وہ اپنے مرف میں لایا کروں گا جہاں ہی لگا
وہاں رہ گیا۔ جہاں سے دل اکٹھ گیا چل دیا۔ مگر مرزا قاتل صاحب اپنے خاندانی وقار کا پورا خیال منظر رکھتے ہوئے دلی
چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیا اور وہ دلی سے ماہرنگے جیسا کہ ایک خط نام حکیم غلام نعت خاں میں لکھے ہیں۔ بھائی میرا
دکھ سنو، پٹیا لے جانے میں ایک سبکی اور ذلت تھی۔“

ہمیں اس کی بزم میں اگر اذن بار ہوتا دل غم زدہ نہ غم سے کبھی رشتہ کار ہوتا
شب و روز وقفِ حواں یہ امیدوار ہوتا یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا

اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ہمیں پیشتر عیاں تھا ترا وعدہ پر نہ آنا بس اب اور جھوٹا کہہ کر ہے عبتِ یقین لانا
نہ کر اب یہ غدر بجا نہ تراش کچھ بہانا ترے وعدے پر جیتے ہم تو یہ جان چھو جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

یہ شکستِ عہدِ الفت ہے مقامِ حیرت افزا کہ نہیں یہ کام ہرگز کسی تجھ سے نازنین کا
مگر اسقدر تو کھولا مرے دل نے یہ معما تری ناز کی سے جانا کہ بندھا تھا عہدِ بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

ترے ناوکِ تم پر دل و جان فدا ہیں اب تو کہ نہ کال دیں انھوں نے مری حسرتیں تھیں جو جو
جو ملا ہے لطف کاوش وہ زبان کیا بیان ہو کوئی میرے دل سے پوچھے کسے تیرم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ نقطہ ملا ہی دل تھا یہ میرا ہی تھا کلبیا ہزار صبر و تمکین سمی آفتوں کو حبیبِ لا
کسی کو یہ میں کہاں ہے مرے سوز غم کا یارا رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمنا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شہار ہوتا

یہ عجیب بات کی ہے کہ بنے ہیں دوست نامح
یہ انوکھی دل لگی ہے کہ بنے ہیں دوست نامح
کوئی چال یہ نئی ہے کہ بنے ہیں دوست نامح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

ہوا ضبط چارہ گر کو کہ جو تم سے مشتعل ہے
نہیں دل کا کوئی چارہ جو غم سے مضطرب ہے
نہیں سہل غم سے چھٹنا یہ شریکِ آبِ گل ہے
غم اگر چہ جانگسل ہے پہ کہاں نہیں کہ دل ہے
غم عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

نہیں شب ہی جھلک بھاری کہ دن اس بھی سول ہے
وہ بلائے جانگسل ہے تو یہ دلوں جاں گز ہے
کبھی جاں لیوں پہرائی کبھی دم نکل گیا ہے
کہوں کس سے میں کہ کیا شب غم بری بلے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہیں تھا جو شوق جلوہ تو قصور فہم کا تھا
ہے مقام شکر لیکن کہ خدا نے پردہ رکھا
رہی شرم اپنی ورنہ کسے تھا نظر کا یار
اے کون دیکھ سکتا کہ ریگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

یہ کسی پر اپنا مرنا ہوا کھیل دوستوں کا
کہ لگا دیا ہے سب نے سر قبر ایک میل
لگے اپنی جان سے ہم انھیں ہو گیا تماشا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھنا نہ کہیں مزار ہوتا

ہوئی معرفت میں گویا جو تری زبان غالب
تو سمجھ گیا ہے مزار جو ہے تیری شان غالب
کوئی اب بھی تجھ سے کیونکر ہے بولگان غالب
یہ مسائلِ نصوص یہ ترا بیان غالب
لے ماشیہ اعلا صفر

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بارہ خوار ہوتا

۱۳۷

بشر کرتا ہے بیجا ادعا کیا یہ کر سکتا ہے ترک مدعا کیا
اسے تو دھن ہے ہو گا کیا ہوا کیا ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

نہیں سمجھے ہواب تک ماجرا کیا کہا کیا ہم نے اور تم نے سنا کیا
مال آخر ہے استقام کا کیا تجاہل پیشگی سے مدعا کیا

کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا

عدو پر لطف دونا دیکھتا ہوں روابط بھی زیادہ دیکھتا ہوں
مدارا میں اضافہ دیکھتا ہوں نواز شہائے بیجا دیکھتا ہوں

شکایت ہائے رنگیں کا گلہ کیا

بھنور ہیں نغمہ پردازانا لبحر عیاں موجوں سے آوازانا لبحر
صبا بھر کو نازانا لبحر دل ہر قطرہ ہے سازانا لبحر

ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

ذرا اس بے زبان دل کی صدا سن کچھ اپنی قدر دانی کا گلہ سن

حاشیہ گزشتہ صفحہ کا: ظفر بادشاہ نے مطلع سنا تو کہا کہ تم تو اس وقت بھی نہ سمجھتے، قاتب نے کہا حضور تعالیٰ ہی ایسا
بھی سمجھتے ہیں اسلئے ارشاد ہوا کہ میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں۔ ۱۷

یہ عمل بے بہا کہتا ہے کیا سن سن اے غارت گر جنس وفا سن
شکست قیمت دل کی صد کیا

ہوائے سنبل و سوسن نہیں ہے طبیعت مائل گلشن نہیں ہے
لسائیں کیا یہاں دامن نہیں ہے دماغ عطسہ پیراہن نہیں ہے
غم آوارگی ہائے صد کیا

کیا ہے کیوں جفا کاری کا دعوے جتایا کیوں تم کاری کا دعویٰ
تجھے کیوں ہے دل آزاری کا دعویٰ کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ
شکیب خاطر عاشق بھلا کیا

ابھی تک مئے کہاں ساقی نے دیا ہے مگر حالت کمال نشہ کی ہے
کسی کی چشم میگوں دیکھ لی ہے نفس موج عیط بنجودی ہے
تفاؤل ہائے ساقی کا گلہ کیا

عبث دشمن کو جلوسے کی ہوس ہے کہ اس کو اک نگاہ گرم بس ہے
اسے کیا سوزش پہاں سے مس ہے فروغ شعلہ رخس یک نفس ہے
ہوس کو پاس ناموس وفا کیا

کبھی تو جو ہر تیغ نظر دیکھ پھر اپنے جاں نثاروں کے جگر دیکھ
نہیں الزام تجھ پر بے خطر دیکھ عجا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ
شہیدان نگہ کا خوں بہا کیا

اس اپنی آرزو پر مرثا ہوں کہ نصب العین چشم سرمہ سا ہوں
 ہم تن شوق نظر را ہوا ہوں نگاہ بے جا با چاہتا ہوں
 تغافل ہائے تمکین آزمایا

یہ ذکر جلوۂ فردا کیا کیوں ابھی سے کر دیا محشر بپا کیوں
 تغافل اس قدر رکھا روا کیوں یہ قاتل وعدہ صبر آزمایوں
 یہ کافرستہ طاقت رب کیا

کہے کیا کوئی اس کی بات پر بات کہ ہے افسوں و جادو سرسبز بات
 نہیں ہے کوئی مرزا بے اثر بات بلائے جاں ہے غالب الکی ہر بات
 عمارت کیا اشارت کیا ادا کیا

۱۵

کون کہتا ہے کوئی عاشق شیدا نہ ہوا ہاں یہ دعویٰ ہے کہ ہم سا کوئی ہو گا نہ ہوا
 اپنی یکتائی کا دعویٰ ہمیں بے جا نہ ہوا درخور قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
 پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

ہم سے رکھیں نہ یہ امید کبھی اہل کرم بند ہے در تو کریں طوف صدا دیں پیہم
 زعم ہے فریب یاں فقر و غنا پر ہر دم بندگی میں بھی وہ آزاد و خود دیں ہیں کہ ہم
 اگلے پھر آئے دیر کعبہ اگر وا نہ ہوا

حسن کا تیرے زمانے میں ہے سکا ایسا سارے ماہ میں کوئی گھڑی جم نہ سکا
ہ شرم سے ہر چہاں تاب بھی ہے رو بقفا سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا

رو برو کوئی بت آئی نہ سیمانہ ہوا

کب تری آنکھ کے بیمار نے پچا ہا درماں کب ہوا چارہ گروں سے دوا کا خواہاں
چشم بد دور سے ہے یہ مرض راحتِ جاں کم نہیں نازش ہمنامی چشمِ خواہاں

تیرا بیمار برا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا

کیا فغاں ہے وہ فغاں جس سے کوئی دل نہ ہلا کیا کہیں آہ پھر اس آہ کو جو ہو نہ رسا
ہے وہ فریادِ عبث جس سے کوئی گھر نہ جلا سینے کا داغ ہے وہ نازک لبِ ننگ گیا

خاک کا زرق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا

جھیلتا ہوں جو شب و روز غم و بے بجا یہی مقصود تھا شاید کہ میری خلقت کا
کوئی حرمِ ازل زلزل اور نہ تھا نام کا میرے ہے جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا

کام میں میرے ہے وہ فتنہ کہ ہر پانہ ہوا

سن کے ذکر پیشِ قلب رہے صبر کی تاب داستانِ شبِ غم اور نہ اڑے آنکھوں سے خواب
سوزِ دل کا ہو بیاں اور گلہ ہو نہ کباب ہر بین سے دم ذکر نہ ٹپکے خوںِ ناب

جزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچانہ ہوا

جزائے میں نہ ہو جلوۂ میمانہ و مل ذرہ ذرہ میں نہ ہو سیرِ مہرباں و سبل
غنیہ گل میں نہ آجائے نظرِ گلشن و گل قطرہ میں دھلا دکھائی نہ دے اوڑھنِ کل

کھیل لڑکوں کا ہوا دیدہ بینا نہ ہوا
مدتوں خط و کتابت رہی مزا اس سے تب کہیں قتل کا اقرار کیا تا تل نے
آج کچھ قتل کے سامان بھی قتل میں ہوئے تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پورے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے یہ تماشا نہ ہوا

۱۶

بجا ہے تم کرو جو کچھ گلہ اپنے فدائی کا ادا اس سے نہ کچھ بھی ہو سکا حق آشنائی کا
نہ پہونچا بزم تک تو غدر ہے ہیبت و پائی کا پئے نذرِ کرم خفہ ہے شرم نارسائی کا
بچوں غلطیہ صدر رنگ دعویٰ پارسائی کا

ابھی تک تو رہا پردہ تہاوی خوش دانی کا نہ ہو جائے کہیں دنیا میں شہرہ دلربائی کا
کسی دن رنگ لائے گا یہ لپکا خود نمائی کا نہ ہو حسن تماشا دوست رسوا یوفائی کا
بہ بہر صدر نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

ترے نور و ضیا سے فیض ہر وہ ماہ کو پہونچا مگر حسرت کش اک میں ہی رہا تیری تمکلی کا
ترے در پر جو سائل اُگیا خالی نہیں جاتا زکوٰۃ حسن دے لئے پیش کش کر جہر آسا
چراغ خانہ درویش ہو کا سہ گدائی کا

ہمیں تو یہ تمنا تھی کہ سر ہو اور ترا خنجر سرِ مقتل کہا کس نے کہ لے قاتل رعایت کر
یقیناً تجھ سے ہو گی باز پرس اسکی سرِ مختار نہ مارا جان کر بے جرم غافل تیری گردن پر

رہا مانند خون بے گنہ حق آشنائی کا
 ۱۔ محمد الشریب سے شیوہ طی سانی ہے نہ قصہ درد کا لب پر نہ کچھ غم کی کہانی ہے
 خموشی میں بسر ہوتی ہے اچھی زندگانی ہے تمنائے زباں جو سپاس بے زبانی ہے
 مٹا جس سے تقاضا شکوہ بے دست و پائی کا
 مرے زخموں کی صورت سے جو ملی ہر طور گل ہے اسی صورت کا صدقہ ہے کفر و قیمت گل ہے
 مرے ہی خوں شدہ دل کا تصدیق محبت گل ہے وہی اک بات ہے جو یافنس اُن نکبت گل ہے
 چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا
 وفادار و لیسے بھی تو نے جو بد عہدی کی ٹھہرائی شکایت بے دہن لوگوں کے لب تک بھی تری آئی
 حسینوں سے زبان طعن آخر تو نے کھلوائی دہانِ ہریت پیغارہ جو زنجیر رسوائی
 عدم تک بیوفالہ چاہے تیری بے وفائی کا
 نہ ہو گا ختم نامہ یوں تو چاہے جس قدر نکھڑے پڑھے گا کون تو دفتر کے دفتر بھی اگر نکھڑے
 مناسب ہے کہ مرزا کی طرح مصرع تر نکھڑے نہ وہ نامہ کو اتنا طول غالب مختصر نکھڑے
 کہ حسرتِ سخن ہوں عرض ستم ہائے جدائی کا

چپ رہے تو اس کو راحت کا گال ہو جائیگا جو گلہ دل کو ہے دل ہی میں نہاں رہ جائیگا
 جو بیاں سے مدد طلبے رائیگاں ہو جائیگا گردِ اندوہ و فرقتِ بیاں ہو جائے گا

بے تکلف داغِ مدہر دہان ہو جائے گا
ہر غم ہے بیٹھنے لک کو کربِ اضطراب
ہے شبِ مریں طبیعت کو بلا کا بیچ و تاب
رو و مدد اکیں کہیں پیدا نہ کرنے ماہِ تاب
پر تو مہتابِ سیلِ فائماں ہو جائے گا

نراستائیں ہے کس انداز سے وہ سب
سورہا ہے مست صہبائے جوانی بے خبر
ساجدِ نیم و ریا میں ہوں یہ حالت کچھ
لے تولوں سوتے میں اسکے پاؤں کا بو نہ کر
ایسی باتوں سے وہ کافر دہکناں ہو جائے گا

اگر دعویٰ ابتدا میں تھا بہت کچھ عشق کا
عمر بھر الفت نہا میں گے یہ اپنا قصد تھا
کچھ جب اس سے لڑی سب جو صدا جاتا ہوا
دل کو ہم صرف وفا تجھے تھے کیا معلوم تھا
یعنی یہ پہلے ہی نذر امتحان ہو جائے گا

ری مرضی سے ہے وابستہ زمانے کی ضیا
اس سے دنیا پھر گئی تو جس سونا خوش ہو گیا
نے چاہا جس کو مقبولِ دو عالم کر دیا
سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا
مجھ پہ گویا اک زمانہ چہر ہاں ہو جائے گا

جو مجھ کو فرطِ غم میں ہی خوں رنے کا خط
اور گھٹنے میں رہا یوں ہی جگر اور دل کو ربط
یہ نہ ہو جائیئے دونوں کے دونوں جو خط
گزر گاہ گرم فرماتی رہی تعلیم ضبط
شعلہ خس میں جیسے خوں لگ میں نہاں ہو جائے گا

کچھ کرنا لاں مجھے مرغِ چین میں نوہر گر
میری حالت پر کیفِ افسوس میں برگِ شجر
وہاں چاک چاک غم سرخسوں کے جگر
باغ میں مجھ کو نہ لے جاو نہ میرے حال پر
مگر تیرا اک چشم خوں فشار ہو جائے گا

منتظر میں بھی ہوں فوائے قیامت لائے تو اپنی اپنی دوا اسی دن پائیں گے انصاف جو
 اک بڑی امید پر جمیلا ہے تیرے ظلم کو وائے نگر میرا ترا انصاف غمخیز میں نہ ہو
 اب تلک تو یہ توقع تھی کہ وائے ہو جائیگا
 باد رکھ سنسنے کے قابل پذیر مرزا ہے اسد ہوش میں آکیا ہوا دل کس کو دیتا ہر اسد
 بتلا اک طفل پر ہونا کچھ اچھا ہے اسد فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسد
 دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائیگا

۱۸

یوں تو میرا علاج کیسا نہ ہوا کم مرض ہے مگر خرا نہ ہوا
 مجھ پر احساں طیب کا نہ ہوا درد منت کش دوا نہ ہوا
 میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا
 ہو گئے رسوا تمہیں کہا مانو بات بڑھ جائے گی بہت یوں تو
 چل کے سن لو الگ جو سنتے ہو جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
 اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

اس غزل کے متعلق مرزا غالب نے مزاحیہ معلق لکھا ہے۔۔

میرا کلام میسے پاس کبھی نہیں رہا، ضیاء الدین خاں اور حسین مرزا جمع کر لیتے تھے جو میں سے کہ انہوں نے
 لکھ لیا۔ ان دونوں کے گھر لٹ گئے ہزاروں روپے کے کتب خانے برباد ہوئے، اب میں اپنے کلام کو دیکھنے کو نرسا
 ہوں۔ کئی دن ہوئے ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمر پر داز بھی ہے ایک غزل میری کہیں سے نکھو
 لایا۔ اس نے وہ کاغذ جو مجھ کو دکھایا یقین سمجھنا کہ مجھ کو روٹا آیا، غزل تم کو بھیجا ہوں اور صدر میں اس کے اس خط
 کا جواب چاہتا ہوں۔ اور خط کے ساتھ مندرجہ بالا غزل بھی لکھی "درد منت کش دوا نہ ہوا۔" ..

اور تجھ ساحسں کہاں سے لائیں حسرت دل کی دلوں سے پائیں
کس کے ہاتھوں سے زخم دل کھائیں ہم کہاں قسمت آزمائے جائیں
تو ہی جب خنجر آزمائے ہوا

سخن تلخ کب ہے ان کے قریب ان سے باتیں سننے یہ کس کے نصیب
ہے ملاوت ہی کچھ سخن میں عجیب کتنے شیریں ہیں تیرے لب کر قریب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

جب ہیں دھن تھی انکے لانے کی استطاعت تھی گھر سجانے کی
اب جو بدلی ہوا زمانے کی ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

جان طاعت ہی میں کھپائی تھی کچھ خودی تھی نہ خود نمائی تھی
سر تھا سجدہ تھا جہ سائی تھی کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

قابل فخر کیا ہے بات اپنی عین احسان ہے اسکی خوشنودی
ہم نے اس پر نثار کیا شے کی جان دی، دی ہوئی اسی کی مٹی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

غم سے خالی نہ کوئی دم گذرا کیا ٹھکانہ ہے کم نصیبی کا
کچھ نہ کچھ سلسلہ لگا ہی رہا زخم گر دب گیا ابھونہ تھا

کام گریز گیا روا نہ ہوا
 ۱ دعویٰ دوستی زبانی ہے دل میں تو دشمنی کی مٹانی ہے
 قہر ہے یا یہ جہر بانی ہے رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے
 لے کے دل دستان روا نہ ہوا
 مثل مرزا مبروہ رہتے ہیں جی میں گھٹ گھٹ کے پھوٹتے ہیں
 سب غم انتظار رہتے ہیں کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں
 آج عنالرب غزل سرا نہ ہوا

یہی ہمیشہ نشیمن رہا تمنا کا رہا ہے درد اسی میں تمام دنیا کا
 مگر ہے اب اسے درکار پہن صحرا کا گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا
 گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا
 ترا خیال و تصور جو دل کو ہے محبوب اسی سے نامہ نویسی کا شغل ہے مرغوب
 مجھے امید کرم اور تجھ سے ہو کیا خوب یہ جانتا ہوں کہ تو اور پانچ مکتوب
 مگر ستم زدہ ہوں ذوق خامہ فرسا کا
 نہ ہونگے گل روش روزگار اگر کو یہی پسے گا زیر قدم بھڑہ زار اگر ہے یہی
 لٹے گا دہر کا نقش و نگار اگر ہے یہی خانے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی
 دوام کلفتِ خاطر ہے عیش و نہا کا
 ہنسی کا خاک بلیقہ نہیں کسی گل کو کہیں یہ سیر و تماشا نہ رخ افزا ہو

جمن کا قصد ہے یا رو تو مجھ کو ساتھ نہ لو غم فراق میں تکلیف میرا غمزدو

مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

مثال آئینہ حیرت زدہ سراپا ہوں امید وار تجسلی روح افزا ہوں

رہیں شوق ہوں سترتا بپا تمنا ہوں ہنوز محرمی حسن کو ترستا ہوں

کر رہے ہیں مو کا م چشم بینا کا

اب اور کیسے کہ انداز اس ستم گر کے دم نظارہ طلب گار جسکے پس ہم سے

اشارہ جان کا ہو گا تو یہ بھی دے دیں گے دل اسکو پہلے ہی ناز واداسے دے بیٹھے

ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

مے سر رشک کا انداز سخت مشکل ہے کہ قطرہ قطرہ میں پوشیدہ بحرِ کامل ہے

حساب کا کوئی دعویٰ کسے تو باطل ہے نہ کہہ کہ گریہ بر انداز حسرتِ دل ہے

مری نگاہ میں ہے جمع خراجِ دریا کا

ستم جو اسکے اٹھاتا ہوں لہرِ شاد آسند نہیں کسی سے طلب گارِ عدل و داد آسند

نہ مجھ سے اس کو نہ مرزا سے غدا آسند فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اسکو یاد آسند

جھپائیں اس کی ہے انداز کار فرما کا

اس نے جبِ نحت پے رقعہ منازل باندھا چھپرے ناو مے گھر کے مقابل باندھا

مے نے کھانچا سہ سہ سے کاٹا باندھا جب بتوقیب سفر یار نے محل باندھا

تپش شوق نے ہر ذرہ اک دل باندھا
قتل کر دیے میں عشوہ تھا بڑا دست راز
بانی قتل کر شہر تھا انگہ تھی غماز
دیکھ کر آئید جب ہو گئے قتال انداز
اہل بنیش نے ہجرت کدہ شوخی ناز
جو ہر آئینہ کو طوطی بسمل باندھا

منہ ہی جس کا نہ کبھی عرض تمنائیں کھلا
اس کو حیراں کے سوا اور یہاں کیا ملتا
کام کچھ سہل نہیں تھا طلب مقصد کا
یاس و امید نے یک عہدہ میلہ مانگا
عجز ہمت نے ظلم دل سائل باندھا

اس بیباں میں ہیں حیراں دل غروں غالب
حال تیرا ہے جس میں دگرگوں غالب
ہو گیا فکر مضامین میں جگر غروں غالب
ز بندے تشنگی ذوق کے سفھوں غالب
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

اگر میں صورت قطرہ دریا سے جدا ہوتا
تو کیوں درویشِ قہر بحث ہست و کا ہوتا
مگر ہاں نفی سے اثبات پیدا بر ملا ہوتا
نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈر لویا مجھ کو ہونے نے نہ ہونے میں تو کیا ہوتا

دل بیمار تو فکر و فائیں گھل گیا اپنا
جگر باقی رہا تھا اکو در عشق نے کھایا
جھکا بارالم سے فرق یوں پہون نہیں ٹھٹھا
ہو اجب غم سے محسوس تو غم کیا سرکھٹنے کا

نہ ہوتا اگر بد راتن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

اسی کی یاد میں آنکھوں پر دل تہللاتا ہے تصور اس کا ترزا رات دن دلو کو کھاتا ہے
خیال اکا بھلا کب کب طرغٹیں سے جاتا ہے ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

کب کوئی باعث خونباری شرکاں سمجھا کب کوئی علت آہ شرر افشاں سمجھا
کوئی غم خوار نہ حال دل نالاں سمجھا وہ مری چین جبین سے غم پہناں سمجھا
راز مکتوب بربے ربطی عنوان سمجھا
لوث دنیا سے مکر ہے مرا سینہ ہنوز دل میں باقی ہے ابھی کلفت دیر نہ ہنوز
خاک بھی شکل صفائی نظر آئی نہ ہنوز یک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

حاشیہ گذشتہ صفحہ کا: حد تخلیق عالم نہیں ہوئی تھی تب ہی خدا موجود تھا اور اگر کائنات پیدا نہ ہوتی تب بھی خدا ضرور ہرگز موجود ہوتا۔ اگر میں پیدا نہ کیا جاتا تو میرا وجود بھی خدا کے وجود میں مدغم ہوتا یعنی میری ہستی ہی میری بربادی کا باعث ہوتی۔ ”مسیحی ہی تھی تھی۔“ اس شعر کی شرح خود غالب صاحب ماسٹر پھیلے لالہ اشوک خٹہ میں اس طرح کی ہے: ”پہلے یہ گھنا چاہیے کہ ”بندہ عبارت فولاد کے آئینے سے ہے“ اور چلی آئینوں میں جو مر کہاں اور انکو قتل کون کرتا ہے فولاد کی جس چیز کو قتل کر دے گا شہر ہے۔ ایک لکیر پڑی اسکو الف صیقل کہتے ہیں جب یہ مقدمہ معلوم ہوا تو اس شخص غم کو سمجھنے معرہ۔ چاک کرتا ہوں میں جب کہ گریباں سمجھا“ یعنی ابتدائی سیر سے مشق جنون ہے رنگ کمال فن حاصل نہیں ہوا آئینہ تمام صاف نہیں ہو گیا اس ایک لکیر صیقل کی جو ہے سب سے چاک کی صورت لکھ کی سی ہوتی ہے اور چاک حسب اثر جنوں میں سے ہے۔“

حزن و اندوہ میں ناچاری خاطر مت پوچھ زلیست سے باعث پیناری خاطر مت پوچھ
 حال دشواری و بیماری خاطر مت پوچھ شرح اسباب گرفتاری خاطر مت پوچھ
 اس قدر رنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

کب یہ منظور ہے وہ جلوہ نما ہو سرِ بام کب گوارا ہے کہ وہ رنج ہو نظر گاہِ عوام
 چاہتا ہوں رہے مستورہ شوخ خود کام بدگمانی نے نہ چاہا اسے سرگرم خرام
 رنج پہ ہر قطرہ عرق دیدہ حیراں سمجھا

چھیڑ کر غیر نے اس کو جو غضب ناک کیا آگ ہو کر صفتِ شعلہ آتش بھڑکا
 باعث طیش تو اعیار کا سفلہ پن تھا تجھ سے اپنے یہ جانا کہ وہ بد خو ہو گا
 بنضِ خس سے تیشِ شعلہ سوزاں سمجھا

قطع منزل کے لئے میں نے کمر توہیا نہ بھی پیرِ قہاہت نے اجازت پئے رفتار نہ دی
 نوبت نہ آئی تھی دو ایک قدم چلنے کی سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی
 ہر قدم سایہ کو میں اپنے شبستاں سمجھا

کوئی پہلو بھی تو بچنے کا نہیں تھا دم مرگ نشترِ آخرِ رگ جاں نے وہی کھایا دم مرگ
 پیش آیا وہی تقدیر کا کھاد دم مرگ تھا اگر یزداں مژدہ یار سے دل تادم مرگ
 دفع پر کانِ قضا اس قدر آساں سمجھا

یوں تو تم بھی اسے کہتے تھے جفا کا راستہ پھر بھی مژدے تھا کیا تمہیں ہیشیا راستہ
 کیوں ہوئے دیدہ و دانستہ گرفتار راستہ دل دیا جان کے کیوں اسکو وفا والا راستہ

غلطی کی کرچو کا فر کو مسلمان سمجھا

۲۳

پھر مجھے یار کا در یاد آیا اپنا پھوٹا ہوا سر یاد آیا
پھر وہی خون جگر یاد آیا پھر مجھے دیدہ تر یاد آیا
دل جگر تشنہ فر یاد آیا

تھا ترابیر عذاب جہاں سوز لفظ رخصت تھا سناں دلروز
پھر نسیبوں نے دکھایا یہ روز دم بیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقت سفر یاد آیا

جب ملا آنکھ پھر الی اپنی نظرِ لطف کسی دن نہ ہوئی
کی نہ اک روز تغافل میں کسی سادگی ہائے تمنا یعنی
پھر وہ نیرنگ نظر یاد آیا

کیوں نہ فر یاد مجھے ہو مشکل آبلے منہ میں ہیں سینہ گھٹا تل
میں کہاں آہ و نغاں کے قاتل عذر و اماندگی اے حسرتِ دل
نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا

بستجو گر نہ تری کی جاتی یہ مصیبت ہی نہ جھیلی جاتی
جان کیوں مفت میں اپنی جاتی زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی

کیوں ترا راہ گذر یاد آیا
مانتا ہوں وہ جگہ ہے اچھی ہیں وہاں عیش کے سامان سبھی
کیا کروں گا جو طبیعت نہ لگی کیسا ہی رضوان سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

اب کہاں ضعف سے یالائے فغاں آہ کی تاب نہ تانوں کی توار
جی نذر تا ہے جو ہلنی ہے زباں آہ وہ جسراتِ فریاد کہاں
دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا

دل میں رہ رہ کے جو آتا ہے خیال کیا بلا دیکھئے لا تنبہ خیال
پھر مجھے غم میں پھنسا تا ہے خیال پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال
دل گم گشتہ مگر یاد آیا

قدر مسکن کی ابھی جانی ہے یہی اس میں بھی پریشانی ہے
یہ ہے بے مثل وہ لاشانی ہے کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

خاک ابھی میں نے کہاں چھانی ہے دل دھڑکتا ہے پریشانی ہے
فرط ہیبت سے جگر پانی ہے کوئی ویرانی سی ویرانی ہے

۱۷ اسی مضمون کا ایک شعر تو میں نے بھی کہا ہے۔ جیس وحشت میں سوتے سحر اکوں؟ کم ہیں ایسے گھر کی
ویرانی۔ اسی طرح کا ایک شعر قابل مطالعہ ہے۔

یاد آیا مجھے گھر کے دشت دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
 قاتل اس کا ہے ہر افساں شاید کہ بدی کی ہے مکافات بھی بد
 جرم ہوئے کو تھا مرزا سرزد میں نے مجنوں پر لڑکپن میں اسد
 سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

۲۴

آپ کے ساتھ کوئی دشمن بے بیر بھی تھا
 دیر کرنے میں کوئی مائل تیر بھی تھا
 ہوتی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا
 آپ آتے تھے مگر کوئی عنایاں بھی تھا

تم نے جو کام کیا غیر مشیت نہ کیا
 دوں جو تنہا نہیں الزام تو کہم ہی خطا
 تھا مقدر جو مرے واسطے ہونا وہ ہوا
 تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلا
 اس میں کچھ ثنائیہ خوبی تقدیر بھی تھا

شاہد حال ہے ہر چند مرا حال زبوں
 کچھ خبر بھی ہے کہ میں عاشق دیر بند ہوں
 سخت حیراں ہوں کہ کیونکر تجھے آگاہ کروں
 تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں
 کبھی فراق میں تیرے کوئی بچیر بھی تھا

مجھ سے کہتا ہے کہ تو کون ہے کیا بتلا دوں
 نہ رہا ہوں جو تجھے یاد تو آ بتلا دوں
 عاشق زار ہوں کیا اسکے سوا بتلا دوں
 تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں

کبھی فراق میں تیرے کوئی فخر بھی تھا

حد سے گزری ہوئی تھی چارہ گروں کی بیداد بھول کر بھی تو نہ لب پر کبھی لایا فریاد

دل پریشانیوں میں بھی تو رہا خرم و شاد قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یا

ہاں کچھ اک رنج گرا نباری رنج بھی تھا

محفل یار میں اللہ سے اس کا غنا حق تو یہ ہے کہ بڑے بول کا سہہ نیچ

خوش ہوں اس سے کہ اثر کچھ تو ہوا ہوں کا دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیہ ٹھنڈ

نار کرتا تھا ولے طالب تاثیر بھی تھا

وصل شیریں سے وہ گوہر نہ سکا شیریں کا کر گیا کام تو ایسا کہ رہا نام مدا

کہتے ہیں سنگ تراشی کو جو آپ ادنیٰ کام پیشے میں عیب نہیں رکھتے نہ فرما دکونا

ہم ہی آشفۃ سروں میں وہ حوال میو بھی تھا

سینہ زانو سے جو اس نے نہ دبایا نہ سہی خنجر تیز گلے پر نہ چلایا نہ سہی

ہاتھ شمشیر کا بڑھ کر نہ لگایا نہ سہی ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی

آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

ہم پہ فائق جو سمجھتے تھے کبھی اپنا حق ان کو یہ خفیہ نویسی کا ملا کیسا

ان کی تحریر کو کیوں مانے سرتا پاختی پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے نکھر پڑا

آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

رکھتے تھے دیدہ دیدار طلب شوق لبتا پھر تو دیکھا تو مجھے دید کا یار ہی نہ تھا

ہلوہ دیکھا بھی مگر دل کا نہ ارماں نکلا • بکلی اک کو نہ گئی آنکھوں کے آگے تو کیا

بات کرتے کہیں لب تشنہ تفریح بھی تھا

دی جو تشبیہ اسے ہر درخشاں سے کبھی • آگ غصے سے ہوا چہرے کی رنگت بدلی

اس کی تمثیل ہی گویا کوئی دنیا میں نہ تھی • یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی

گر بگڑ بیٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا

انکساری سے تو جو چاہا وہ کھلو غالب • تم پہ دیکھا نہیں مڑا نے کسی کو غالب

کوئی دعوے سے ذرا آگے کہے تو غالب • ریت کے تمعین استاد نہیں ہو غالب

کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

۲۵

دنیا میں کبھی کیا کوئی دل بر نہ ہوا تھا • بدکیش و جفا پیشہ و کافر نہ ہوا تھا

سفاک مگر تیرے برابر نہ ہوا تھا • تو دوست کسی کا بھی ستم گرد نہ ہوا تھا

اور وہ ہے وہ ظلم جو مجھ پر نہ ہوا تھا

قدرت جو لگی اور حسینوں کو بنا نے • اس کا کوئی ہمتا ہو نہ چا ہا یہ خدا نے

پائی نہ تھی تکمیل ابھی نور و ضیائے • چھوڑا مرغش کی طرح دستِ قضا نے

۱۔ مرغش: وہ مصنوعی چاند جسکو حکیم ابن عطا شہوہ ابن مقفع نے ادویاتِ مرکب سے تیار کیا تھا وہ چاند چاہ

نخشہ سے نکلتا تھا اسکی روشنی زیادہ دوڑیکٹ جاتی تھی وہ اہل چاند کے برابر روش نہ تھا آخر کار کچھ عرصہ بعد شفق

ہو گیا۔ کارکنانِ قضا و قدر نے آفتاب بنا کر شمع کیا ابھی اسکی روشنی تیرے حس و جمال کے برابر نہ ہوئی تھی کہ اسکا حال بگا

۱۲۔ مرغش کی طرح ہوا۔ ۱۳۔

خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

۱ کم درمیں سے نہیں کچھ اشک ہمارے آنسو نہ ہوئے ہوتے تو گوہر ہی بنتے

ہے مادہ تو ایک ہی ایجاد میں ان کے توفیق باندازہ ہمت ہے ازل سے

آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

درو سے عیاں خنجر خونخوار کا عالم مست آنکھ مگر فتنہ بیدار کا عالم

ہو جس سے بپا حشر وہ رفتار کا عالم جب تنک کہ نہ دیکھا تھا قدر کا عالم

میں معرقتہ فتنہ فتنہ ہوا تھا

قسمت یہ کہاں تھی کہ کبیرہ اسے دیکھوں آنکھوں سے طوں پاؤں خوشا بد کے لوں

برسوں سے تمنا تھی کروٹے تو مناؤں میں سادہ دل آزدگی یار سے خوش ہوں

یعنی سبق شوق مکرر نہ ہوا تھا

لکھنے میں فرشتوں نے سمندر کو کیا خشک اک لمحہ قلم کو کبھی ہونے نہ دیا خشک

عامی ہوں میں ایسا کہ قدم رکھتے ہی تھا خشک دریاہ معاصی تنک آبی سے ہوا خشک

میرا سردامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

کیا سوز نہاں پر کسی آتش کو تو تفصیل جو اس سے فوائد تھے نہیں قابل تفصیل

۲ سینہ تقار در ہم و دینار کی زنبیل جاری تھی اسد داغ جگر سے مری تحصیل

۱۰ لے مرا غائب صاحب ایک خط میں خواجہ غلام غوث بیخبر کو تحریر فرماتے ہیں یہ پروم شدہ اخبار نہیں ہو کر تے۔ یوں

سننا مجھے باور نہ آیا یہاں تک تو میں مورد غائب نہیں ہو سکتا: اسی خط کے آغاز میں یہ شعر تحریر فرمایا ہے

میں سادہ دل آزدگی یار سے خوش ہوں یعنی سبق شوق مکرر نہ ہوا تھا

آتش کردہ جاگیر سمندر نہ ہوا تھا

۲۶

میں کب فدائے خجرت تل نہیں رہا کب تیغ نازیار کا بسمل نہیں ہوا
لیکن وہ ضبط اب مجھے حاصل نہیں رہا عوض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

دل میں بھرے ہیں لاکھ غم اس کے دیے ہوئے پوچھو نہ سرگزشت کہ لب میں جیسے ہوئے
آیا تھا میں بقا کا تہیتہ کئے ہوئے جاتا ہوں داغ حسرت ہستی لئے ہوئے
ہوں شمع کشتہ درخور محفل نہیں رہا

دشمن تھے اس کے سامنے سپہن سپہر کہ میں پھرتے تھے ہاتھ پر وہ لئے اپنا سر کہ میں
اب غیر ہیں کہ جن سے پھر ہی بے نظر کہ میں مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کہ میں
شایان دست و بازوئے قابل نہیں رہا

یکساں گداز شاہ سے یاں ساز باز ہے محمود غزنوی کے برابر یا زہے
دل صاف ہے کسی سے نہیں احتراز ہے بر روئے شمش جہت در آئینہ باز ہے

۱۵ مزارع آب مٹی نئی بنش حقیر کو کھٹے ہیں انہوں نے کہ تم کو میرے حال کی خبر نہیں اگر دیکھو تو حاور ج
حس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا کوئی دم ایسا نہیں کہ تجھ کو دم واپس کا خیال نہ ہو ساتھ برس کا ہو چکا
ہوں اب کہاں تک جیوں گا غزل اور بائی فار کا اردو دس ہزار بیت کہ چکا اب کہاں تک کہوں گا زندگی بڑی
بھلی جس طرح بنی کاٹی اب فکر یہ ہے کہ دیکھئے موت کیسی ہوتی ہے اور بعد موت کیا پیش آتا ہے پھر کھٹے ہیں
سے عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ نہ مرنے پر دیکھئے دکھ لائیں کیا۔ ۱۲

یاں اختیار ناقص و کامل نہیں رہا

جب سے کھلا ہوا ہے تصویریں باب حسن پیش نظر ہے آٹھ پہر آفتاب حسن
اٹھا ہے درمیان سے گویا حجاب حسن واکر دیئے ہیں شوق نے بند نقاب حسن

غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

تھا صبح و شام درپے کس چرخ کج مدار تھا غم سے وقف درد و خلش سینہ تھا فگار
دل تھا ہزار کاوش حرمیں سے بے قرار گو میں رہا رہن ستم ہائے روزگار

لیکن ترے خیال سے بغافل نہیں رہا

خوننا بہ جگر سے سدا مثل باغباں ہم سینچتے رہے تین الفبت بستان
دیکھا مال کو تو تردد تھا رائیگاں دل سے ہوائے کشت و فضا گئی کواں

حاصل سوائے حسرت حاصل نہیں رہا

یہ تیغ آزمائے تو حاضر ہے سرا سدا کھینچے یہ تیرا گرتو ہے سینہ سپر اسدا
مرزا ہوں کھیل جاؤں گا میں جان پر اسدا بیدا و عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدا

جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

جس کو ہم سمجھتے تھے یارِ جہاں اپنا ہو گیا وہی دشمن آہ ناگہاں اپنا
ہم نے اپنے ہاتھوں سے کر لیا زیاں اپنا ذکر اس پری وشن کا اور پھر بیاں اپنا

بن گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا

ان کو قہقہہ ہوسنا کی مے کشی میں اتنی کب پیتے تھے جو میرے ساتھ کرتے تھے حفظِ تر لب
ضد ہی کچھ مریض ان کو چڑھ گئی بیڈھب مئے وہ کبوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یارب

آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا

حالِ اضطرابِ دل کچھ اسے دکھا سکتے نار کے ذریعہ سے دکھ اسے سنا سکتے
لطف اس کے جلوے کا دمِ بدم اٹھا سکتے منظر اک بندہ ی پر اور ہم بنا سکتے

عرش سے ادھر ہوتا کاشکے مکان اپنا

بستر اسکے کوچے میں اک طرف جمالیں گے جو کڑی پڑے گی اب شوق سے اٹھالیں گے
اب تو اس سے ملنے کی راہ کچھ نکالیں گے دے وہ جس قدر ذلت ہم بندہ ی میں ٹالیں گے

بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

دل میں بہہ کر ملنے کی خود ہی ان سے ٹھہراؤں سلسلہ کتابت کا درمیاں سے اٹھواؤں
نامہ بر سے کیا ہو گا خود ہی ان کو کجھاؤں درِ دل لکھوں کب تک جاؤں انکو دکھاؤں

انگلیاں فکار اپنی خام خوں چکاں اپنا

ہو گیا ہوں جب عادی آستانے بھڑوں کا پھر نمی تو یہیں آخر ہوں گامین جہیں فرسا
پلے بپے جرات اور دن سجدے میں یہاں کرتا گھستے گھستے مٹ جاتا اپنے عبت بدلا

ننگِ سجدہ سے میرے سنگِ آستان اپنا

لاکھ اس کی محفل میں غیر کی رسائی ہو اب کسی برائی میں لبِ ذرا ہلائے تو

اس کے منہ سے کھلایا ہم کو کہنا تھا جو جو تاکرے دغا بازی کر یا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں ہم نے ہزیاں اپنا
روز کے ستارے سے کر دیا ہے تنگ اسے حسرت اب تو اسے مرزا بڑھ گئے ستم اس کے
کہتے ہیں عداوت ہے اسکو ہر زور سے ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہو غالب دشمن آسمان اپنا

ظلم پر وہ عذر و جھٹ لائیں کیا غیر تاویل غلط فرمائیں کیا
چھوڑ کر ایذا دہی شرمائیں کیا جوڑے باز آئے پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھائیں کیا
جو مقدر ہے وہ ہو گا بے گناں پھر ہوں کیوں مصروف سستی راہیگاں
ہیں امیدیں بھی جو قائم ہے جہاں رات دن گردش میں ہیں سات آسمان
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

۱۔ مرزا غالب ایک خط میں قائم علی تہر کو یوں تحریر فرماتے ہیں "میں نے کتابیں چاہی ہیں جیسے پارساں اور سال
کیں اگرچہ پہنچنے کی خبر باقی ہے مگر تو یہ کہیں سے نہیں آئی عجلت و دگر دوش ۱۶۔ دیکھا بھائی اس غول کا مطلع
کیا ہے ۲۔ جوڑے باز آئے پر باز آئیں کیا ۳۔ کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھائیں کیا ۴۔
۵۔ مرزا غالب نے ایک خط نام مرزا ترمیگ مصنف "سلاطین برہان" لکھا ہے جس سے مرزا صاحب کی دماغی صحت
طبیعت اور تحقیق کا پورا اظہار ہوتا ہے لکھتے ہیں "کہہ چکا ہوں کہ نہ مجھ کو مناظرے کا دماغ نہ نجوم امراض جسمانی والا
روحانی سے فراغ، اگرچہ بہت نہیں ہاری مگر تو غیب سے توقع مدد گاری تھی اور اپنا یہ شعراء و سب سے درد زبان اور پاس
(دماغی صحت پر)"

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

۲۹

شرط ہے اس کا ذرا جلوہ نما ہو جانا پھر تو آساں ہے مجھے موقوفاً ہو جانا

راحتِ جزو نہیں کل سے جدا ہو جانا عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

یا تو تھا مجھ سے محبت میں کبھی عہد ابد اب ہے کس تفرقہ انداز کے باعثِ دو کہ

ہو گیا ایک ہی چٹکی میں محبت کا رد تجھ سے قسمت میں مری صورتِ فعل، ابجد

تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

ہوتی تھی اس کے لئے فکر ہی صبح و شام نہ ہوئی واشدگی اور نہ ہوا کچھ آرام

بسکہ دریاں مخالف سے فنا تھا انجام دل ہوا کش مکش چارہ زمت میں تمام

مٹ گیا گھسنے میں اس عتق کا و ہوا جانا

جب تک ہم سے تعلق تھا اور اک طرح کی راہ چیڑا اٹھایا کئے اور ظلم کئے خواطر خواہ

دفعاً پھر گئے کیوں آپ بتائیں تو گناہ اس جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ

اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا

خون اک آتش سیال مرے دلیں تھا پانی ہو کہ دم گریہ جو مژہ پر آیا

خاک بھی تن میں بجز عنصرِ خاکی نہ رہا ضعف سے گریہ بدل بد دم سرزد ہوا

باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

جلوہ گران میں تصور سے تیری مثال مردم چشم کا آنکھوں سے نکلنا ہے محال
جی میں جو بات کھپتی دیکھے کس طرح نکال دل سے ٹناتری انگشت خنائی کا محال

ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

اپنی ہستی کو سر ہزم جو کرتی ہے فنا شمع نے مجھ سے دم گر یہ یہ گھلتا سیکھا
بیچ کن ہے مرا گر یہی مری ہستی کا ہے مجھے ابر بہاری کا برس کر کھلتا
رونتہ دوتے غم وقت میں فنا ہو جانا

سبزہ رکھتا ہے ترے پاؤں کے بوسے کی ہوس گل کو بازار میں لائی ترے جلوے کی ہوس
تجھ تلک کس کو نہیں اٹکے پہنچنے کی ہوس گر نہیں نگہت گل کو ترے کوپے کی ہوس

کیوں ہے گردِ درہ جو لانا مہیا ہو جانا

جن کو رہتی ہے صفائی کی تمنا ہر پل خواہش تصفیہ قلب میں وہ ہیں بیکل
کر کے پہتا ہے ہر اک رنگ میں شوقِ اپنا گل تاکہ تجھ پر کھلے اعجاز ہوائے صیقل

دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا

قابل دید ہے ہر ذرہ یہاں کا غالب کیوں نہ پھر کبھی نظارہ دنیا غالب
متفق تم سے ہے اس قول میں مرزا غالب بخش ہے جلوہ گل ذوق تماشا غالب
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

پھر گلوں کا باغ میں منظر کھلا بہن سبز اور اراق کا دفتر کھلا
یہ بہار اور ظلم یہ مجھ پر کھلا کچھ میں بیٹھا، ہوں، یوں پر کھلا
کا شے ہوتا قفس کا در کھلا

ہم ہیں اس دھن میں کہ وہ خود ہی بلائے کون جا کر بے طلب خفت اٹھائے
جائیں جاتے ہیں اگر اپنے پر اے ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

ان کو ہے دشمن کی یاری پر گھمنڈ دوستی پر جانثاری پر گھمنڈ
اس کو اپنی ہوشیاری پر گھمنڈ ہم کو ہے اس رازداری پر گھمنڈ
دوست کچے راز دشمن پر کھلا

داغ کھا کر دل ہوا تھا باغ باغ تھا معطر اس گل ترے داغ
یہ اندھیرے گھر کا تھا روشن چراغ واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ
زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا

باز آیا ظلم سے کب وہ جواں تاز سے اس کے ہے بسمل اک جہاں
پھینک دی شرکاں نے کب اپنی سناں ہاتھ سے رکھ دی کب ابرو نے کہاں
کب کمر سے غمزے کی نینجر کھلا

وودی جب پہر تاج پہ یہ گمراہ سا پھر کسی کا خاک ہو گا رہنما
نیراب یہ ساتھ ہے تو حرج کیا مفت کا کس کو برا ہے بدرقمہ

رہرودی میں پردہ رہبر کھلا

کب تک برسا کرے بارانِ اشک چارہ کس کس کا کرے بارانِ اشک
کیا جگر ٹھنڈا کرے بارانِ اشک سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک

آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھلا

ہو گیا جامِ مسرت جامِ مرگ حور کا بازو بنی مصمصِ مرگ
نکلے صبحِ زندگانی شامِ مرگ نامہ کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ

رہ گیا خطِ میری چھاتی پر کھلا

اس سے بڑھ کر زند کیا ہو گا کوئی ہو نہیں سکتا کبھی ایسا کوئی
اس کو کیا چھڑے گا اے مرزا کوئی دیکھو غائب سے گرا لجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

ردیف (ب)

ہے مرے واسطے سامانِ بقا موجِ شراب اس سے جینا ہوں کہے روحِ فزا موجِ شراب
لے حاشہ شیر

ایک مدت سے نہ تھی جلوہ نما موجِ شراب پھر ہوا وقت کہ ہو بالکشا موجِ شراب
دے بطے کو دلِ دوست ثنا موجِ شراب

بزمِ رندانِ قدحِ نوار بنا ہے گلشن بادہ نوشوں کی طرح جھوٹے ہیں سرو سخن
نیچو دوست ہیں مرغانِ گلستانِ ہر تن پوچھ مت وجہ سیہ مستیِ اربابِ چمن
سایہ تک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

بے حسے مل گئی شاہانہ دلخ اس کا ہے تخت شاہی کی پھر اس مست کو پڑا کیا ہے
کون ہو اس کا شنوار یہ عجب دریائے جو ہوا غرق ہے بختِ رسار کھتا ہے
سرے گزے پر بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب

خشکِ اشجار کو بھی اس نے کیا بار آور دور کیا ہے کہ لگیں سرو چرغاں میں ثمر
ہوتی ہے اس کی ہوا بھی عجب اعجاز اثر ہے یہ برسات وہ مہموم کہ عجب کیا ہو اگر
موجِ ہستی کو کرے فیض ہوا موجِ شراب

بقضہ ۵۰۔ مراعات نے اپنے ولی ہونے کے سعلق اپنی ایک غزل کے مقطع میں بھی کہا ہے ۵

یہ مسائلِ تصوف یہ تیرایانِ غالب تجھے ہم ولی بکھتے جو نہ خوار ہوتا

دیکھنے والوں پر کیا شوخیانِ انداز اختیار کیا ہے اور میں غالب صاحب کسی ولی سے کم نہ

تھے۔ جس کا پتہ ان کے اشعار کے الہامی کیفیت سے چلتا ہے۔ ۱۲

۱۵۔ ایران میں قاعدہ ہے کہ جب انگور پک جاتے ہیں تو سنگِ مرمر کے حوضوں میں بھر دیے جاتے ہیں۔ آفتاب کی تیزی سے دو چار دن بعد ان کا عرق نکلتا شروع ہو جاتا ہے اس وقت دیگر لڑکے ان حوضوں میں انڑ کر انگوروں کو پاؤں سے روندتے ہیں اس کے جھوٹی کی بند مزہ مریحان حوضوں میں ڈال دی جاتی ہیں انہی مریحوں کو بطے کہتے ہیں۔ ۱۶

موسم گلے گلستاں میں کیا کیا جادو پھولے پڑتے ہیں مسرت سے گلستاں رو
 موج میں پھرتی ہے مستانہ گلوں کی خوشبو چار موج اٹھتی ہیں طوفان ہوا سے ہر سو

موجِ گل موجِ شفقِ موجِ صبا موجِ شراب

مے کدیں جو شبِ روز ہیں سرگرم نیاز ان سے پوچھے کوئی شادابی گلزار کا راز
 ہے یہ باران کی کرامت نہ ہوا کا اعجاز جس قدر روح بناتی ہے جگر نشہ ناز

دے ہے تسکین بدِ آبِ بقا موجِ شراب

اپنی حرمت میں یہ نکلی گل تر سے برتر رنگ پر اس کے فدا دل پر تو صدقے ہو جگر
 قوتِ نامیدہ نام اس کا نہ ہو اس کا اثر بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر

شہرِ رنگ سے ہے بالکشا موجِ شراب

جامِ جمشید کا ہمسرہ مرا جامِ سفال سامنے ہیں مری نظروں کے جہاں کے احوال
 کیوں نہ چل ہو مری فکرِ درخشاں کو کمال موجِ گل سے چراغاں ہے گزر گاہِ خیال

ہے تصویر میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

آنکھ مٹاتی ہے چڑھتی ہے بالائے دماغ موجِ زن دلیں ہے ہر وقت تنائے دماغ
 ہے جو مرغوب اسے منزلِ زیبا ہے دماغ نشہ کے پردے میں ہے خود تماشائے دماغ

بسکہ رکھتی ہے ہر نشو و نما موجِ شراب

ہے عجب عالمِ نورانی کیفیتِ فصل کیفیت کوئی نہیں ثانی کیفیتِ فصل
 کیونے کیوں نہ شاخوانی کیفیتِ فصل ایک عالم پر ہے طوفانی کیفیتِ فصل

موجِ سبزہ نوخیز سے تاجِ موجِ شراب

جس کو اس بزم میں ساقی نے دیا ساغرِ گل اس کے سر میں نہرا وہم و خیالِ جزو گل
شارحِ فصلِ گلستاں ہے نوائے ببل شرحِ ہنگامہ ہستی ہے زہے موسمِ گل

رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے خوشاموجِ شراب

شوقِ بادہِ دلِ مرزا میں بھرا پھر بند بعد تو بہ کے کہیں پھر نہ خطا ہو سرزد
فصلِ گلِ جوش پہ ہے ابر کی بھی بآئند ہوش اڑتے ہیں مرے جلوہ گل دیکھ اسد
پھر ہوا وقت کہ ہو بالکشا موجِ شراب

ردیف (ت)

۳۲

خار زارِ اتو ہوا ہے گلشنِ بے خارِ دوست ہے نمونے سبزہ سے صرف خزاں گلزارِ دوست

چھپ گئی ہے تیرگی میں تابشِ انوارِ دوست آمد خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست
دو درِ شمع کشتہ ہے شاید خطِ خسارِ دوست

آنکھ اٹھائے اس کے نظارہ کو ہر کس کا جگر کیا لڑا سکتا ہے کوئی برقِ تاباں نظر
لن ترانی اس کو زیاہے کمالِ حسن پر اسے دلِ ناعاقبت اندیش غبطِ شوق کر

کون لا سکتا ہے تابِ جلوہ دیدارِ دوست

لے حاشیہ ۱۵۵ پر

سانے ہو کر مگر کچھ اس انداز سے ہر قدم پر پائمالی کے مزے میں لگنے
 کر دیا سرتا پاک ویدہ حیران مجھے خانہ ویران، سازی حیرت تماشا کیجئے
 صورت نقش قدم ہوں زخم زخم رقتار دست

غیر کے ساتھ ان کو دیکھوں کہاں یا راجھے پوچھئے آئے تو دکھلایا یہ نظار اچھے
 کچھ نظر آیا نہ مرنے کے سوا چار اچھے عشق میں بیدار شک غیر نے مارا مجھے
 کشتہ دشمن ہوں آخر گر چہ تھا بیمار دست

ہو اگر ہر آن ہم پر اک نئی افتاد ہے اپنا لب کب آشنائے شکوہ بیدار ہے
 خوش ہے وہ زاری سے اولذت کش فریاد ہے چشم مارو شن کہ اس بیدار کا دل شاد ہے
 دیدہ پر خون ہمارا ساغر نثار دوست

قطع

۱۵۷۶



یہ رفاقت کی جو ٹھہرائی ہے اس نے بحر میں چاہتا ہر دیکے دھوکا بھیہر کچھ لے بحر میں
 اس پہلے سے غم و ایذا مجھے دے بحر میں غیروں کو تباہ کشتیوں سے اس کے بحر میں
 ہر تکلف دوست مجھ سے کوئی تمنا پر دوست

اوحایہ ہے کہ ہیں تابع مرے جن و ملک نہر و مہر و پری و آدمی و ارض و فلک

حاشیہ ص ۱۵۷۶۔ عالم نزع میں میرے احباب محبوب کو اس وقت میرے پاس لائے جب میں انکے انتظار میں بار بار اٹھتا ہوں
 کھولنے کا کوشش کر رہا تھا مگر ایسا انتظار میں میری آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں اور میں اسے دیکھ بھی نہ سکا حیرت
 کی انتہا ہے اس مضمون کا ایک شعر حضرت غالب صاحب نے اور بھی کہا ہے
 منہ نہیں کھولتے کا کھولتے آنکھیں ہے ہے خوب وقت آئے تم اس ماثقی میرا کیے پاسی ۲

یوں بیاں کرتا ہے اس مخمل کی باتیں جیڑک تاکیں جانوں کہ ہے اسکی رسائی واں تلک

مجھ کو دیتا ہے پیام وعدہ دیدار دوست

میرے ہر اک درد کا ظالم لگا تا ہے سراغ اور یہ کہتا ہے کہ اب حاصل ہوا اس سے فراغ

کیا بتاؤں مجھ کو دکھلاتا ہے کیا کیا ہمزباغ جبکہ میں کرتا ہوں اپنا شکوہ ضعف دماغ

مگر کہ ہر وہ حدیث لطفِ غنیمت یاد دوست

باتوں باتوں میں لگا دیتا ہے دل میں نیتنر یاد دلواتا ہے باتیں یار کی آٹھوں پہر

ہے تسلی و دلاسا سے جفا مد نظر چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر

ہنس کے کرتا ہے بیان شوخی گفتار دوست

دشمن اس کا مرسلہ آیا ستانے کے لئے دوست بن کر ظلم اس انداز سے اسنے کئے

ہوں تیر میں کہ دونوں میں کہ دکھ سہجئے مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجئے

یا بیاں کیجئے سپاس لذتِ آزار دوست

بات جو ہوتی ہر انجی دلیس کہپ جاتی ہر آپ کھینچ کر سامع کا دل اپنی طرف لاتی ہر آپ

طبع مرزا دمدم یہ کہکراتر آتی ہے آپ یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ

ہر دلیف شعری فالتی بس تکرار دوست

ردیف (دو)

۳۳

ناز کا لطف حسینوں سے گیا میرے بعد دلربا عشوہ دل کش نہ رہا میرے بعد
وہ کرشمہ نہ رہا ہو شرابا میرے بعد حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد

بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

شیوہ غنچ و دلال آج جہاں سے اٹھا کام سے اپنے ہوا ناز معطل گویا
اب کہاں ہے کوئی دل ان سے جو ہو عہد برا منصب شفقتی کے کوئی قابل نہ رہا

ہوئی معزولی انداز وادامیرے بعد

اب کہاں ہے کوئی سرباز بیسرمجھ سا تیر جس کے لئے کی جائے گی شمشیر قضا
اب تو بیکار ہے خود جو ہر ذاتی اس کا درخور عرض نہیں جو ہر بیدا کو جا

نگہ ناز ہے سرمہ سے خفا میرے بعد

یا کبھی ان کی پھر انگشت ابھو میں تر تھی یا نظر آتی تھی پوروں پر خنکی سرخی
میرے مرتے ہی صدا فسوس یہ نوبت پہنچی خوں ہے دل خاک میں احوال بتاں پر تھی

ان کے ناخن ہوئے محتاج حایمے بعد

آج دنیا سے اٹھی دست گریباں کی نزار اب کبھی ایک جگہ ان کا نہ ہوگا اجراع

رہنِ عشق سے محفوظ ہوئی دیکھی متاع ہے جنوں اہل جنوں کیلئے اغوش و دراع

چاک ہوتا ہے گریہاں سے جدا کیسے بعد

مے کرے بند ہوئے سرد ہوا گلخنِ عشق کون ایسا ہے کہ آباد کرے گلخنِ عشق

ہے کوئی اب کہ ہوا سوارِ بر تو سنِ عشق کون ہوتا ہے حریفِ مے مردِ فگنِ عشق

ہے مکر رب ساقی پہ صلا میرے بعد

بزمِ الفت ہے دھواںِ حار تو جیت کیا ہے کیا تعجب ہے جو اندھیر بہاں چھایا ہے

مجھ سا پروانہ جاں سوز کہاں پیرا ہے شمعِ جمعہتی ہر تو اس میں سے دھواںِ غلتا ہے

شعلہٴ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

مذہبِ روئگی سر پیٹ کے حسرتِ میری کوئی بھی بات نہ پوچھے گامتناؤں کی

بے کسی ہوگی پس مرگ لہر پر چھائی غم سے قربا ہوں کہ اتنا نہیں نیاسیں کوئی

کہ کرے تعزیتِ جہر و وفا میرے بعد

چھوٹ کر مجھ سے ہوا ایکس و تنہا غالب ایسا وارفتہ کہاں اس کو ملے گا غالب

ہاتھ ملتا ہے جو افسوس سے مرزا غالب آئے بے کسی عشق پہ رونا غالب

کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا کیے بعد

۱۔ حوالہ: عشق۔ مرد کو بچھاڑ دینے والی عشق کی شراب

میرے مرے کے بعد ساقی پکا پکا کر کہہ رہا ہے کہ اب کوئی ہے جو مے مردِ فگنِ عشق کا حریف ہو یعنی عشق کی شراب کا

جام ہے۔ لیکن جب کوئی آواز نہیں آتی تو پھر چپکے سے یایوس ہو کر کہتا ہے کہ حریفِ مے مردِ فگنِ عشق کون ہو سکتا ہے؟

یعنی کوئی بھی نہیں ہو سکتا۔ اس شعر میں نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ پہلا مصرعہ بھی ساقی کی صلا (دلی مشاعرہ پر)

ردیف (ر)

۳۳

ہوئے ہیں سدرہ شوقِ در در دیوار د اس کو روک سکیں گے مگر در دیوار
کریں گے اور اسے تیز تر در دیوار بلا سے ہیں جو یہ پیش نظر در دیوار

نگاہ شوق کو ہیں بال و پیر در دیوار

شبِ فراق میں رونے کی آگئی جو امنگ تو پل کی پل میں ہوا کچھ عجیب گھر کا ڈھنگ
ادھر ہے خشت کا انہار اُدھر ہو تو وہ سنگ و فورِ اشک نے کا شاد کا کیا یہ رنگ

کہ ہو گئے مرنے دیوار و در در دیوار

خبر چوبے کہ سرِ شام آئی گاؤں نگار تو سایہ حد سے بڑھاتا کہ ہو قدم پہ نثار
چلا ہی جلتا ہے بڑھتا ہوا نہیں ہے قرار نہیں ہے سایہ کہ سنکر نوبید مقدم یار

گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار

چڑھا دماغ میں کچھ نشہ شباب ایسا کہ گرم کر دیا بازار خود نمائی کا

بقیہ صفحہ ۱۸۔ کے الفاظ ہیں۔ اس مصرع کو مکرر پڑھ رہا ہے ایک دفعہ بلانے کے بعد میں پڑھا ہے کون ہوتا ہے حریف
مردانگ عشق، یعنی کوئی ہے جو ہے مردانگ عشق کا حریف ہو پھر جب کوئی آواز پر نہیں آتا تو اسی مصرع
کو مایوسی کے بعد میں مکرر پڑھتا ہے۔ کون ہوتا ہے حریف..... یعنی کوئی نہیں ہوتا۔ اس میں لہجہ
اور طرزِ ادا کو بہت دخل ہے کہ کو بلانے کا لہجہ اور یہ اور مایوسی سے چپکے چپکے کہنے کا اور انداز ہے اس طرح صفحہ
مذکورہ کی مگر اگر کرنے سے یہ معنی فوراً ذہن نشین ہو جائیں گے۔

کسی سے اب تجھے مطلق حجاب بھی نہ رہا ہوئی ہے اس قدر ارزانی سے جلوہ
کرمست ہے تیرے کوچے میں ہر در و دیوار

سدا جو جانب دیوار و در رہا نکلتا ہوا ہے آئینہ ہر سنگ و خشت حیرت کا
کئے ہیں کام مری چشم شوق نے کیا کیا جو ہے تجھے سر سودائے انتظار تو آ
کہ ہیں دکان متاعِ نظر در و دیوار

رہی ہمیشہ جو گردش ہی سایہ کو گھر کے یہ شوق تھا کہ بلائیں یہ اس کے گھر کی لے
نصیبِ خفتہ مرے غم کدہ کے جاگ اٹھے وہ آ رہا مرے ہمسایہ میں تو سایہ سے

ہوئے فلا در و دیوار پر در و دیوار

یہ آرزو ہے کہ اپنوں سے پائیں آزادی یہ رونق ان کی نہیں ہم کو وہ نشادی
چہل پہل سے پریشان ہیں دل سے فریادی نظریں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی

ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار

ہمیشہ ضبط ہی گر یہ کو کر لیا میں نے امنڈ کے اشک جو اے انھیں پیامیں نے
یہ عجز دیکھ کے گھر کو بچا دیا میں نے نجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے

کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر در و دیوار

ہر ایک جزو ہے گھر کا سرور سے بیتاب ہر ایک ذرہ نظر آ رہا ہے مست و خراب
ہمارے اشک گویا اٹھائے ہیں حجاب نہ پوچھ بے خودی عیشِ مقدم سیلاب

کہ نہاچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

نہ کوئی دوست ہے مزا کہیں نہ ملے میں نہ راز داں ہے نہ ہے ہمیشیں نہ ملے میں
 بھرے ہوئے ہیں بہت اہل کیں نہ ملے میں نہ کہہ کسی سے کہ غالب نہیں نہ ملے میں
 حریف رازِ محبت مگر در و دیوار

۳۵

پایا نہ میرے گھر کو ستم گر کہے بغیر ڈھونڈا ہے گھر رقیب کا کیونکر کہے بغیر
 سمجھا مرا پستہ نہ مکر کہے بغیر گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
 جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

جب تک وہ دیکھتے تھے کہے قدرت سخن اک روز بھی تو مجھ کو نہ دی رخصت سخن
 چھیڑا کبھی تو بولے نہیں فرصت سخن کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقت سخن
 جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

حراما نصیب کون ہے ہمسایا جہان میں نکلا نہ کوئی کام ہمسایا جہان میں
 کس طرح دیکھے ہو گزرا جہان میں کام اس سے آڑا ہے کہ جس کا جہان میں
 یوں نہ کوئی نام ستم گر کہے بغیر

کیا کیا تمہارے ہاتھ سے ہوتے نہیں ستم کیا کیا ہمیں پہنچتے نہیں تم سوز و غم
 لیکن جو سودرا بھی شکایت تو لو قسم جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے و گرنہ ہم
 سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

ابرو کو اس کی کہتے ہیں شمشیر خوش نیام تیرا جل ہے اس نگہ جاں ستاں کا نام
ہوتا ہے ہر اداسکے بیاں میں اک انتظام مقصد ہے ناز و غمزہ وے گفتگوں کا کام
چلتا نہیں ہے دشمن و خنجر کہے بغیر

بہتر سمجھتا ہے کوئی پتھر کو پوجنا مذہب کسی کا مہر منور کو پوجنا
ایمان عاشقوں کا ہے دلبر کو پوجنا چھوڑوں گا میں نہ اس بت کا فر کو پوجنا
چھوڑے نہ خلق کو مجھے کافر کہے بغیر

ہوتا نہ کس طرح سے فدائے خم و سبو دکھلا رہا تھا عالم مستی مقام ہو
پیش نظر خدا ہو جو ساقی ہو روبرو ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے شبشہ و ساغر کہے بغیر

رکھتا ہوں پاس اسلئے کاغذِ ظلم و دُش تحریر سے ہوتا بسہولت ہر ایک بات
ممکن ہو کون دن کہے سمجھوں یلا کورت بہرا ہوں میں تو چاہیئے دونا ہوا التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکر کہے بغیر

مرزا نے کچھ کیا جو کبھی حالِ زار عرض انجام یہ ہوا کہ ہوئی ناگوار عرض
یوں ہی نہ ہو کہیں دلِ نازکِ بار عرض غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب ان پر کہے بغیر

اس بام پر تجسلی انوار دیکھ کر حیراں ہوں اپنے آپ کو ہشیار دیکھ کر
 جھپکی نہ آنکھ برق شرر بار دیکھ کر کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھ کر
 جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر

رکھتی ہے رات دن پیشِ دل تپاں مجھے تاب سکوں ہے برق کی صورت کہاں مجھے
 کرنا نہ آیا سوزِ محبت نہاں مجھے آتشِ پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے
 سرگرم نالہاں شرر بار دیکھ کر

ظلم و ستم کا وقت ہے کوئی نہ جو رکا اک کھیل ہو گیا کہ جب اٹھے ستالیا
 دل اب تو نام سے ہے محبت کے کانپنا کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا
 رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

نوبت نہ آئی تھی کہ گلے پر مرے چلے چلنے سے اس کے پہلے ہی مرنا پڑا مجھے
 یہ اور بوسے لے مرے قاتل کے ہاتھ سے آتے میرے قتل کو پر جوش رشک سے
 مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

مستی نے تیری کھو دیا صبر و سکونِ خلق ہے لغزشِ خرام سے زخمی درونِ خلق

۱۔ آتشِ پرست، پارسی لوگ آگ کو مظہرِ مذبحہ کو پرستش کرتے ہیں، ان کی عبادت گاہوں میں ہر وقت
 آگ روشن رہتی ہے، فرماتے ہیں محبوب کی جہاں میں آہ و بکا کرتا ہوں اور میرے منہ سے آگ برساے
 والے نکلے ہیں تو ان کو دیکھ کر لوگ مجھے آتشِ پرست کہتے ہیں۔ ۲

شیشہ ہوا ہے باعثِ حالِ زبونِ خلق ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پر خونِ خلق
لڑے ہے موجِ نے تری رفتار دیکھ کر

پڑتا ہے دمِ دمِ میرے سر پر عالم سے ہاتھ مصروفِ سیدہ کو بی ہے ہر وقت غم سے ہاتھ
قسمت کہاں وہ منہس کے ملا کر گم ہاتھ وحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
مجھ کو حریص لذتِ آزار دیکھ کر

مضموں ہمارے تلے ہیں لعلِ بین کیساتھ نسبت ہے حرفِ حرف کو درِ عدل کیساتھ
لیتا ہے اس کو کوئی اگر قدرِ فن کے ساتھ بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کیساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

چلنے سے پیشتر تجھے لازم ہو دیکھ بھال رستے کی اونچ نیچ سے چلنا نہ ہوا بال

لے متاعِ سخنِ کلام کی دولت، ہم ایسے متاعِ سخن کے خریدار کے ہاتھ بک جاتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ وہ سخن ہم اور
سخن شناس ہو۔ غالبی سلسلے میں منشی ہر گویا لائقِ ناز ایک فارسی خط میں منشی نبی بخش حقیر کی سخن فہمی کے متعلق لکھتے
ہیں، یہ خط کتنا حسرتِ آجیزہ خدا نے میری یکسی اور نہ بھائی پر رحم کیا اور ایک شخص کو میرے پاس بھیجا جو میرے
رخوں کا درہم اور میرے درد کا درماں اپنے ساتھ لایا جسے میری اندھیری راتوں کو روشن کر دیا۔ اس نے اپنی
باتوں سے ایسی شمعِ روشن کی جسکی روشنی میں میں نے اپنے کلام کی خوبی و تیر و خوبی کے اندھیرے میں خود میری
نگاہ سے نفعی تھی دیکھی میں حیران ہوں کہ اس فرزانہ یگانہ منسی نبی بخش کو کس درجہ سخن فہمی اور سخنِ سنجی عنایہ
ہوئی ہے، حالانکہ شعر میں کہتا ہوں اور شعر کہا بھی جانتا ہوں مگر جب تک میں نے اس بزرگوار کو نہیں دیکھا یہ نہیں
سمجھا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے اور سخن فہمی کس کو کہتے ہیں؟ مشہور ہے کہ خدا نے حسن کے دو حصے کئے، آدھا یوسف
کو دیا اور آدھا بنی نوع انسان کو۔ کچھ تعجب نہیں کہ ہم سخن و ذوقِ معنی کے کئی دو حصے کے گئے ہیں۔ آدھا منشی
نبی بخش کے اور آدھا بنی نوع انسان کو۔ جو زمانہ اور آسمان میرے گھاسی مخالف ہو گریں اس شخص کی
بدولت رہنے کی دشمنی سے بے فکر ہیں اور اس نعمت و نیا پد کا نفع؟ (از یادگارِ غالب)

پُرنگ راہ میں بھی ہے غافل سفرِ مال ز ناز باندہ سببِ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

دن رات خاک دشت کی یا چھانتا تھا یں یا کچھ دنوں سے نقشِ قدم بن رہا تھا یں
مثلِ شکستہ پا سرِ وادی پڑا تھا یں ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا یں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

اس درجہ بظنی ہے خدا جانے کیوں اسے ہر دم یہ وہم ہے کہ محبت ہے اور سے
کہتا ہر ہنس کے چھ کوہری چگ اسی لئے کیا بد گمان ہے مجھ سے کہ آئینہ میں مرے
طولی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

ہیبت بٹھائی ہوتی طلبِ نور پر خاکِ سیدہ پہاڑ ہوا کس قصور پر
یہ گرمیاں یہ غیظ اور اک بے شعور پر رگرنی غمی ہم پر برقِ بجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہِ ظریفِ قرعِ خوار دیکھ کر

دیکھا جو آستانہ تو آنکھوں میں پھر گیا مرزا کا صبح و شام وہ سجدوں کا مشغلا
دھتے جو پھر لہو کے نظر آئے جا جا سر پھوڑنا وہ غالب آشفۃ مال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

یہ مگر غمی پر ناحق میری بربادی کے سماں ہے فطول اتنا ترس آیا ہے اس گرمیاں ترساں پر

غلطی کی یہ کیوں مجھ کے حال پریشاں پر
لڑتا ہے مرادول رحمت ہم درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرہ شبنم کہ ہوں خرابیاں پر

ہوئی گوشت کے ہاتھوں زلے بھر میں رسوائی
ہوا بے ساز و سامانی پہ بھی سامانِ زیبائی
سیخہ میں جب آئے کہ بھگتیں قیدِ تنہائی
نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی

سفیدی دیدہ یعقوب کی پھرتی ہونداں پر

جنوں مانع ہوا استاد کا احساں ٹھانے سے
فرغت پا چکا روز ازل پڑھنے پڑھا لے سے
رہا انکار عقلِ کل کو غیر لانا سے
فنا تعلیم درس بے خودی ہوں اس زلے سے

کہ جنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دستان

جگر میں غلش سرگز نہ رہتی نشتر غم سے
یہ ایذا سیں ہوتیں جو بیلابیل جرح کے دم سے
کوئی دم جان کو بہلت تو ہوتی درجیم سے
فرغت کس قدر رستی مجھے تشویش مرہم سے

بہم گم صلیح کرتے پارہ ہائے دل نمکلاں پر

بدابے نقشہ عالم سے سن آباد کا نقشا
وہاں بیٹھا ہر سکر روزاول سے سرشمے کا

۱۔ حضرت یعقوب حبیب یوسف سے نہایت محبت رکھتے تھے۔ اسلئے ان کے دو بے بھائی ان سے بہت جلتے ایک
ن سب جاتی ان کو شکار کے ہانے جنگل میں لے گئے۔ اور ان کو ایک کنوئیں میں ڈھکیل دیا۔ گھر آکر اپنے ماپ سے
لہدیا کہ یوسف کو بھڑپایا اٹھالے گیا۔ حضرت یعقوب بہت رنجیدہ ہوئے اور یوسف کی یاد میں روتے روتے اندھے
ہو گئے۔ ادھر یوسف کو ایک قافلے کے لوگوں نے کنوئیں سے نکال کر عزیز مصر کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ عزیز مصر
لہ بیوی رہی حضرت یوسف کے حس و جل پر عاشق ہوئی تھیک حضرت یوسف نے انکی کوئی بات نہیں مانی۔ آخر کا
یوس ہو کر اور ان پر الزام لگا کر ان کو زندان میں ڈال دیا۔ اس تعزیر میں واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ قید میں بھی حضرت
یوسف نے خانہ آرائی۔ چھوڑی حضرت یعقوب کی آنکھوں کی سفیدی زندان کی دیواروں پر پھر پھر کر اسے آراستہ
اری تھی یعنی جس کسی حالت میں بھی اپنی آرائش نہیں چھوڑتا۔

نالوں کے دھوئیں کچے شب تار میں نقشا انجم میں ہے آہ شرر افشاں کا تماشا
 ہے شعلہ الفت سے زمانے میں اجالا لوگوں کو ہے خورشید جہاں تاب کا دھوکا
 ہر روز دکھاتا ہوں میں اکٹا غ نہاں اور

دل باختہ کو کب ہے ترے سر کی قسم چین پاتا ہے کہاں بستہ زنجیر الم حسین
 دیتے ہیں کہاں بھگوشب وز کے غم چین لیٹا نہ اگر دل تمھیں دیتا کوئی دم چین
 کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور

تھمتے نہیں رستہ جو ذرا پاتے ہیں نالے بہتے ہوئے اشکوں کے چلے آتے ہیں نالے
 وہ جوش ہے دریا کو بھی ٹرتا ہے نالے ہاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
 رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

پہلے اشعار کہتے تھے جو بہت اچھے تھے سیکڑوں ایک لیک سے بہتر بہت اچھے
 مرزا کے بھی اشعار ہیں اکثر بہت اچھے ہیں اور بھی دنیا میں سمجھو بہت اچھے
 کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

اے مرزا غالب! اس شعر کی سرخ تینوں کو اپن مکھی ہے "لیٹا نہ اگر دل" یہ بہت لطیف تقریر ہے لیتا کو
 رابطہ ہے چین سے، کمر نامر تو طے آہ و فغاں سے، غنی میں لعنتیہ معنوی اور لفظی دونوں معسوب ہیں فارسی
 میں تعقید معنوی عیب اور تعقید لفظی جائز بلکہ فصیح اور بلج رحمتہ تقلید ہے فارسی کے حاصل معنی مصرعین ہر اگر
 دل تمھیں نہ دیتا تو کوئی دم چین لیٹا۔ اگر نہ مرنا تو کوئی دن اور آہ و فغاں کرتا ہے

نیز، پوری غزل (اس شعر کو تھوڑا کر) مرزا غالب نے حام علی قہر کو ارسال فرمائی تھی علاوہ ازیں
 اس غزل کے سات شعر اور ایک اور غزل اس بزم میں مجھے نہیں مٹی جائے۔ "نوار" علانی کو بہی یادداشت
 پر بھی مٹی۔ ۱۲

وقف جو یہاں مجھ کو ابھی تھا کوئی دن اور تم کو بھی مناسب تھا مگر ہا کوئی دن اور
تم نے نہ مرا ساتھ نہ ہا کوئی دن اور لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تہا گئے کیوں اب ہو تہا کوئی دن اور

در پرتے اس خاص غرض سے ہوں ہیں سا منظور ہے ہستی کا مجھے اپنی مٹانا
ہے سخت اگر سنگ در اس کی نہیں پروا مٹ جائے گا سرگزر ایتھر نہ گھسے گا
ہوں در پرتے ناصید فرسا کوئی دن اور

بگڑے ہوئے آثار ہیں کیا بات بناؤں کچھ روٹھ گئے ہو تو بتا دو کہ مناؤں
اک بات ذرا سی ہے جو مانو تو بتاؤں آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

دیرینہ محبت کا کیا پاس نہ تم نے حیرت ہے کہ کس دل کو جدا ہونے ہو مجھ سے

لکھنؤ غزل نہیں مرثیہ ہے مرزا غالب نے نواب زین العابدین عارف کی موت پر لکھا جو عین جوانی کے عالم
ہم را ہی ملک بھا ہوئے تھے جب کہ ان کی عمر ۲۶ برس کی تھی۔ غالب صاحب کے اپنے سات بچے ہوئے لڑکے
بھی اور لڑکیاں بھی مگر کوئی پذیرہ جینے سے زیادہ نہ جیا، لہذا زین العابدین خاں کو جو ان کی سالی کا لڑکا
تھا جینی بھالیا، زین العابدین خاں خوش فکر ہونے کی وجہ سے مرزا غالب کو اور بھی زیادہ عزیز تھے ان کی
اچانک موت کا مرزا غالب کو نہایت صدمہ ہوا۔ اور یہ دلدروز روزہ نکھا جب تک اسی سال مومس اور تسکین بھی
گزرے تھے اس لئے سالک نے یہ تاریخ بھی مٹی ہے

برس دن میں ہوئے یہ تین شاعر
ارم میں عارف و تسکین و مومن

نالوں کے دھوئیں کچے شب تا میں نقشا انجم میں ہے آہ شرر افشاں کا تماشا
 ہے شعلہ الفت سے زمانے میں اجالا لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا
 ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغ نہاں اور

دل باختہ کو کب ہے ترے سر کی قسم چہیں پاتا ہے کہاں بستہ زنجیر الم چہیں
 دیتے ہیں کہاں مجھ کو شب و روز کے غم چہیں لیتا نہ اگر دل تمھیں دیتا کوئی دم چہیں
 کرتا جو نہ مرنے کوئی دن آہ و فغاں اور

تھمتے نہیں رستہ جو ذرا پاتے ہیں نالے بہتے ہوئے اشکوں کے چلے آتے ہیں نالے
 وہ جوش ہے دریا کو بھی ٹرتا ہے نالے پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
 رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

پہلے شعرا کہتے تھے جو ہر بہت اچھے تھے سبکدلوں ایک ایک سے بہتر بہت اچھے
 مرزا کے بھی اشعار ہیں اکثر بہت اچھے ہیں اور بھی دنیا میں سنغور بہت اچھے
 کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

۱۔ مرزا غالب نے اس شعری سرنجِ جنید کو ایسا لکھی ہے "لیتا نہ اگر دل الایہ بہت لطیف تقریر ہے لیتا کو
 رابطہ ہے چہیں سے اگر نامر بوط سے آہ و فغاں سے مرنے میں تعقید معنوی اور لفظی دونوں معسوب ہیں فارسی
 میں تعقید معنوی عیب اور تعقید لفظی جائز بلکہ بیحد اور بلج ریختہ تقلید ہے فارسی کے حاصل معنی مصرعین ہر اگر
 دل تمھیں نہ دیتا تو کوئی دم چہیں لیتا نہ اگر نہ مرنے کوئی دن اور آہ و فغاں کرتا ؟"

نیز، پوری غزل (اس شعر کو چھوڑ کر) مرزا غالب نے حاتم علی قدیر کو ارسال فرمائی تھی علاوہ ازیں
 اس غزل کے ساتھ شعر اور ایک اور غزل "اس بزم میں مجھے نہیں سی جایا" "نوارِ علائی کو تیرے بادداشت
 پر بھی تھی - ۱۲"

مجبوراً بھی تھا کوئی دن اور تم کو بھی مناسب تھا ٹھہرنا کوئی دن اور
 ساتھ نہ با کوئی دن اور لازم تھا کہ دیکھو مارتنا کوئی دن اور
 تنہا گئے کیوں اب ہو تنہا کوئی دن اور

خاص غرض سے ہوں جس سا منظور ہے سستی کا مجھے اپنی مٹانا
 سنگ در اس کی نہیں پروا مٹ جائے گا سرگز تر اپنہ نہ گھسے گا
 ہوں در پتہ سے نا صیر فسا کوئی دن اور

اے آثار ہیں کیا بات بناؤں کچھ روٹھ گئے ہو تو بتا دو کہ مناؤں
 راسی ہے جو مانو تو بتاؤں آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
 مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

ت کا کیا پاس نہ تم نے حیرت ہے کہ کس ل کج جدا ہوتے ہو مجھ سے

یہ مرثیہ مرزا غالب نے نواب زین العابدین عارف کی موت پر لکھا جو عین جوانی کے عالم
 بنا ہوئے تھے جب کہ ان کی عمر ۲۶ برس کی تھی۔ غالب صاحب کے اپنے سات بچے ہوئے لڑکے
 بھی مگر کوئی پندرہ جینے سے زیادہ نہ جیا، لہذا زین العابدین خاں کو جو ان کی سالی کا لڑکا
 با زین العابدین خاں خوش فکر ہوئے کی وجہ سے مرزا غالب کو اور بھی زیادہ عزیز تھے ان کی
 کا مرزا غالب کو نہایت صدمہ ہوا۔ اور یہ دلدوز لڑکھچا نکہ اسی سال موتی اور تسکین بھی
 لائے ساتھ نے یہ تاریخ بھی تھی

برس دن میں ہوئے یہ تین شاعر ارم میں عارف و تسکین و مومن

باندھی ہے کمر ملک عدم کے ہیں ارادے جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب، قیامت کا ہے گویا کوئی دن او

کس ذوق سے تھا نحو تماشا بھی عارف اس نرم سے کس واسطے اٹھا بھی عارف
کیوں ہو گیا بیوندر میں کا بھی عارف کیوں اے فلک پیر حواں نقا بھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرنا کوئی دن اور

واللہ تمہیں گھر کے اجالے کا سبب تھے چھایا ہے اک اندھیری آنکھوں کے آگے
کس خاک کے پرے میں جیسے میری نظر سے تم ماہِ شب چار دم تھے مرے گھر کے
پھر بچوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن او

مانا کہ وہ آیا تھا فقط جان ہی لینے ممکن تھا کہ حیلے سے اسے ٹالے رہتے
کچھ بات بنا دیتے تو کیوں چھوڑتے تم سے تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت نقاضا کوئی دن اور

جلدی جو یہ کی جانے میں کیا جی میں سمائی جاتے ہوئے ہر ایک سے کیوں آنکھ پھرائی
افسوس نہ اپنوں کی بھی الفت تمہیں آئی مجھ سے تمہیں نفرت ہی نیر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

ناراض ہی تم تھے تو دل غمزدہ تھا خوش تم سامنے تو پہننے تھے ناخوش ہے یا خوش
جب تم نہ ہے یہ تو کہو دل ہے کیا خوش گزری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش
کرنا تھا جو انرگ گزرا کوئی دن اور

چھوڑے گی ابھی جان کہاں رشتہ قالب مرزا ابھی سمجھے نہیں تم اس کے مطالب
کیا زیست ہر ایسے کی جو ہو موت کا طالب ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن او

۴۰

اجابتوں پر دعاؤں کی کیجئے کیا ناز نہ عجز اپنا ہوا کارگر نہ سوز و گداز
ازل میں بسکہ ہر اک شے کا ہو چکا ہر طراز حریفِ مطلب مشکل نہیں فسوں نیاز
دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز

نظر ہی سب نہیں پھر دُور دھوپ ہے سود ابھی ہے تجھ سے بہت دور منزل مقصود
ہر ایک ذرہ میں ہے نور، ہستی معبود نہ ہو بہرہ بیاباں نور دویم وجود؟
ہنوز تیرے تصور میں ہی نشیب فراز

ہم آج تک تو رہے شکل دیدہ حیراں ہوا نہ سامنے نظروں کے حسن یار عیاں
گزاریں صبر میں کچھ اور دن کہاں یہ تو اں وصالِ جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں
کہ دیجئے آئینہ انتظار کو پرواز

رہا ہے یہ تہہ تجر بھی ذوق دید میں مست گیلے جان سے پھر بھی ہوا خیالِ پست
کیا ہے یا کے پرتو نے اس کو نیست و هست ہر ایک ذرہ عاشق ہے آفتاب پرست
گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوہ ناز

عجب مقام میں مرزا ہے کیا کہوں غالب مثال اسکو آگروں تو کس سے مومن غالب
فضا میں عالم امکاں ہے فزون غالب نہ پوچھ وسعتِ میخانہ جنوں غالب
جہاں یہ کائنات گروں ہر ایک خاک انداز

۴۱

مفت ہوتے ہیں پریشان عزیز کیا مجھے سمجھے ہیں نادان عزیز
مجھ کو ہے یار کا فرمان عزیز کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز
مشکل اس کا ہے نکلا دل سے ہے تعلق بھی بلا کا دل سے
تیر کو تو نے جو کھینچا دل سے دل سے نکلا یہ نہ نکلا دل سے
ہے ترے تیر کا بیرکان عزیز
آف نہ مرزا نے کبھی کی غالب جو مصیبت پڑی جھیلی غالب
ضبط لازم ہے تمہیں بھی غالب تاب لاتے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

۱۵ مرزا غالب نے ایک خط میں مرزا آقہ کو لکھا "بکوں ترک لباس کرنے ہو، پیسے کو تمہارے پاس ہے کیا جس کو اتار کر پھینکو گے ترک لباس سے قید ہستیاٹ نہ جائے گی۔ بغیر کھانے پے گزارا نہ ہوگا۔ سختی اور سستی اور رخ و آرام کو ہوا کر دو جس صورت ہو اس صورت سے بہر صورت گزرنے دو۔" ج تاب لاتے ۱۶۔ نیز نواب ملانی کو بھی لکھا "بھائیوں سے پھر نہیں ملا۔ بازاریں نکلتے ہوئے ڈرگتتا ہے۔ جو اہر خبردار میرا سلام اخون کو اودان کا سلام مجھ کو پہنچا دیتا ہے اس کو غنیمت جانتا ہوں۔" ج تاب لاتے ہی بنے گی غالب ۱۷۔

میری ہستی ہے اک انوکھا راز میں بقتا و فنا ہم دم ساز
ظاہر انجام ہے نہ کچھ آغاز نہ نکلِ نفس ہوں نہ پردہ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

تجھ کو ہنسنے سے کام صورتِ گل میں ہوں اور ہم نوائیِ بلبَل
لاگ دونوں میں آپڑی بالکل تو اور آرائشِ خیمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

بس زیادہ نہ لے تعلق کی غیر ممکن ہے دل کی آزادی
کیا عجب ہے کھلے پر پردہ کبھی لافِ تمکینِ فریبِ سادہ دلی
ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گزار

جب سے کنجِ قفس کیا آباد بھول کر بھی نہیں چمن کی یاد
دل نہیں چاہتا کہ ہوں آزاد ہوں گرفتارِ الفتِ صیاد
ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

تنگ آیا ہوں ہجرِ دلبر سے کیوں نہ آنکھوں سے اشکِ خوں برسے
دل کہاں تک فراق میں تر سے وہ بھی دن ہو کہ اس ستم گرے
نازِ کہینچوں بجائے حسرتِ ناز

یہ کوئی ضبط ہے کہ میں چپ ہوں دل ہو خالی تو کیا لہو روؤں
روتے روتے ہوا ہے حال زبوں نہیں دل میں مرے وہ قطرہ خوں
جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلہ باز

تیغِ بڑاں تری نگاہ تیسرے عشوہ تیرا جہاں سے گرم ستیز
خوش خرامی تری قیامت فیز اے ترا جلوہ یک قلم انگیز
اے ترا ظلم سر بسر انداز

اٹھ گیا ہے نقابِ روئے نکو خوب نکلیں گی حسرتیں اب تو
منعِ پابوس سے نہ کر مجھ کو تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو
ریزشِ سجدہ جبینِ نیاز

غم سے کس دن میں جاں بلب نہ ہوا ورد سے حالِ غمیر کب نہ ہوا
لطفِ مجھ پر یہ بے سبب نہ ہوا مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا
میں غریب اور تو غریب نواز

سرخوش و مستِ نظم رہتا تھا دل سے تنہا شاہدِ سخن پہندا
روئے خاک اڑائے مرنے اسد اللہ خاں تمام ہوا
اے دریغا وہ زندِ شاہد باز

رویف دک

۴۳

چاہتے یہ شوخ تو دنیا میں کیا کم تھا نمک سنگ کے بدلے لے سکتے تھے پتھر کا نمک
ان کے ہاتھوں کب دہان زخم نے چکھا نمک زخم پر چھٹکس کہاں طفلانِ بے پروا نمک
کیا مزا ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

بے سبب کب تک سے اخترا زخمِ دل تو نہیں واقف تو مجھ سے پوچھ از زخمِ دل
اس کی خاک پاچھر ٹک لے چارہ ساز زخمِ دل گھر در راہ یار ہے سامانِ ناز زخمِ دل
ورنہ ہوتا بے جہاں میں کس قدر پیدا نمک

چاہتا ہوں میں تو یہ پیدا کوئی ہمدم ہو اور مزہ مجھ کو یہ ہے دیکھوں اسے ہنسنا ہو
حشریں نکلیں کہیں فصل بہاری لائے تو مجھ کو از رانی ہے تجھ کو مبارک ہو جو ہو
ناکِ بلبل کا درد اور خندہ گل کا نمک

غیر ممکن تھا کسی مرہم سے ہو اس کا علاج تھا اسی دماں کا طالب اسکے زخموں کا مزاج
تھی تنگ دوس کی اس کو اور کس کی احتیاج شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کاج

گردِ ساحل ہے بزخمِ موبہ دریا نمک گو بظاہر ہو چکی ہر مجھ سے ترکِ رسم و راہ
سیکھ لے اس شوخ سے کوئی محبت کا نباہ

پھر بھی مجھ پر کس قدر ہے ہر بانی کی نگاہ داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی واہ واہ

یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وہ جس جانمک

پوچھ لو اگر یہ کیسی لگ رہی ہے انکوئے تاکہ ہو اس خستہ تن کا قصہ آسانی سے طے

تم گئے مجھ پر لگے ہونے تقاضے بے پرے چھوڑ کر جانا تنِ مجروح عاشقِ حیف ہے

دل طلبِ نازِ زخم اور مانگیں ہیں اعضا نمک

ہے عدو سے چارہ جوئی باعثِ تحقیر درد کیوں کسی کی سعی سے حاصل کروں تاثیرِ درد

اس کے ہنسنے سے مجھے ہاتھ آگئی تندریدِ دردِ بغیر کی منت نہ کھینچوں گاپے تو قیرِ درد

زخمِ مثلِ خندہ قاتل ہے سزا پایا نمک

اپنی آنکھوں سے جو تیرے شوق کو پھر دیکھ لیں حضرت مرزا بھٹی تیری بخود کی داد دیں

اب کہاں رہم کھائے اور کہاں وہ لذتیں یاد ہیں غالب مجھے وہ دن کو وھڑوق میں

زخم سے گرتا تو میں ہلکوں سے چلتا تھا نمک

۲۲

ختمِ قصہ ہے شبِ ہجر بسر ہونے تک صورتِ شمع ہوں لہانِ سحر ہونے تک

کیا خبر حال ہو کیا تجھ کو خبر ہونے تک آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

اک تلامذہ ہر پاک کیوں نہ ہے پھر دل تنگ روز طوفانِ حوادث کا ہر آمادہ جنگ

کس طرح دیکھئے بے چارہ کی نکلے گی ہنگ
دام ہر موج میں ہے حلقہ صد کام نہنگ

دیکھیں کیا گزرتے ہیں قطرہ پر گہر ہونے تک

آتش ہجر سے حالت ہے جگر کی جو خراب
کش مکش سے ہے مری جان کو قمارِ عذاب

دل یہ کہتا ہے کہ پہلے مجھے کیجئے خونِ ناب
عاشقی صبرِ طلب اور تمنا بے تاب

دل کا یارِ نگ کروں خونِ جگر ہونے تک

تم سے اور وسدہ وفائی ہو کبھی ناممکن
دیکھ لیں خیر کے لائے ہو خدا کو ضامن

اپنی اس دامن میں ہے بقا ہی کے دن
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن

ذناک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

ہو گیا حسن کی ہیبت سے دل کو وہ دہشیم
سخت حیرت ہے کہ زندہ ہے کس طرح کلیم

فرض عاشق ہے دم جلوہ کرے جانِ کلیم
پر تو خیر سے ہے شبنم کو فست کی تعلیم

میں بھی ہوں ایک۔ عنایت کی نظر ہونے تک

ظرف رکھتا ہے تو کہ بادہ پرستی غافل
ورنہ یہ بزمِ رب کی نہ یہ بستی غافل

تجو کو محروم نہ کرنے تری مستی غافل
اک نظرِ بیشِ نہیبی فرصتِ ہستی غافل

گر می بزمِ ہے اک رقصِ شر ہونے تک

پوچھتے کیا ہو یہ مرزا سے کہ کیسا ہے مزاج
کل تھی فرصت اسے اندر وہ مصیبتِ مزاج

وہ مرض ہے کہ معانِ نہ دوا کا محتاج
نہ بستی کا اسد کس سے ہو بزمِ مرگِ ملاج

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

رویف دل

۴۵

یہ بے شعور جب سے ہوئی بتلائے گل
چنتا نہیں ہے اس کی نظر میں سوائے گل
بھولی ہوئی ہے خیرِ قیام و بقائے گل
ہے کس قدر ہلاک فریبِ وفائے گل

بلبل کے کار و بار پہ ہیں خندہ ہائے گل

مدت سے یاد گل میں غنادل کو تنہا شغف
اشجارِ برگِ با سے خالی تھے صفتِ بصف
اب گل سے شاخ شاخ ہوئی جامِ جمِ بکف
آزادی نسیمِ مبارک کہ ہر طرف
ٹوٹے پڑے ہیں حلقہٴ دامِ ہولائے گل

جوشِ بہار میں کوئی غنچہ اگر کھلا
کتر کسی طرحِ دلِ صد چاک سے نہ تھا
سمجھنا نہ کوئی خستگی گل کا مہرا
جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا

اے وائے نالائِبِ خونیں نوائے گل

جب پائسوس کی بھی اجازت مجھے نہ دو
کم قسمتی کا اپنی گلہ مجھ کو کیوں نہ ہو
جرمِ بنوں رگاؤں جو آنکھوں پائوں کو
خوش حال اس حریفِ یہ مست کا کہ جو

رکھنا ہو مثلِ سایہ گل سر بہائے گل

گل کو جو دیکھتا ہوں کھلتا ہر دلیں خار
کہتا ہوں ہوں نہ یہ کہیں تیرے گلے کا بار

اس کے وجود پہ ہے مجھے رشک بار بار ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لئے بہار
میرا رقیب ہے نفس عطرائے گل

دل تنگ آگیا ہے غم روزگار سے فرحت ہو خاک سیر گل وللا زار سے
خالی ہے ہاتھ سر میں گرانی خار سے شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے
مینائے بے شراب و دل بے ہوائے گل

بو باس اس نے حسن میں حاصل ضرور کی لیکن وہ بات اس میں کہاں تھیے نور کی
نسکین کیا ہو اس سے دل ناہمو کی سطوت سے تیرے جلوہ حسنِ غیور کی
خوں ہے مری نگاہ میں نگِ ادائے گل

رکھتا ہے غنچہ دل میں ازل سے چسک سنبل کو کر رہی ہے پریشاں تری لشک
نرگس بھی چاہتی ہے تیرے نور کی جھلک تیرے ہی جلوہ کا ہے پردہ صو کا کہ آج تک
بے اختیار دوڑے ہے گل در قضاے گل

پھیلی ہے جسکی بوئے دل آویز چار سو چل چڑ جس سے ہر گلِ خنداں کو رنگائے بو
مژرا کو جس کی باغِ جہاں میں ہے جستجو غالب مجھ ہے اس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے گلِ حریب قبائے گل

رولیف (ن)

(۴۶)

اب وہ دل اور وہ خیال کہاں وہ تصور وہ دیکھ بھال کہاں
وہ خوشی اور وہ ملال کہاں وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

جب تک آزادہ جہاں ہم تھے دید بازی میں ہم نے دن کاٹے
دل ہے اب اور غم ہیں دنیا کے فرصت کار و بار شوق کسے
ذوقِ نظارہ جمال کہاں

اب نہ دل میں خیال گیسو کا اور نہ آنکھیں ہیں محو شوقِ لہ
و لولہ مٹ گئی جو دل میں تھا دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رھا
شورِ سودا کے خط و خال کہاں

کیا کروں گردِ دشتِ زمائے حوصلے پست کر دیئے دل کے
نہ رہا وہ سخن : ذوقِ تجھے تھی وہ اک شخص کے تصور سے

اب وہ رعنائی خیال کہاں
بہر چکا توں دل میں جتنا تھا کوئی قطرہ جگر میں بھی نہ رھا

ہمنشیں لمن کیا یہ مجھ کو دیا ایسا آسان نہیں لہو رونا

دل میں طاقت جگر میں حال کہاں

تھے کبھی خاک آستانہ عشق اب نہ وہ ہم نہ وہ زمانہ عشق

جیب پڑھتی تو تھے یگانہ عشق ہم سے چھوٹا قمارخانہ عشق

واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں

جور گردوں اٹھائے جاتا ہوں ٹھوکر میں صبح و شام کھاتا ہوں

روز ایذا نئی اٹھاتا ہوں فکر دنیا میں سرکھپاتا ہوں

میں کہاں اور یہ وبال کہاں

کہئے مرزا کا حال کیا غالب بے طرح ضعف ہو گیا غالب

ہے یہ پیری بھی کیا بلا غالب مضحکہ منہل ہو گئے قوی غالب

وہ عناصر میں اعتدال کہاں

۱۔ مرزا غالب اس شعر کے متعلق عبدالرزاق شاکر کو بیوں لکھتے ہیں "بندہ نواز زبان فارسی میں خطوں کا کھنٹا

پہلے سے متروک ہے یہ براہِ مری وضع کے صدروں سے محنت نرذہی و جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی

حرارت غریبی کو زوال ہے اور یہ حال ہے کہ مضمحل ہو گئے قوی غالب ۲۔ وہ عناصر میں اعتدال کہاں۔

کچھ آپ کی تخصیص نہیں سب دوستوں کو جن سے خط و کتابت رہتی اردو ہی میں نیاز نامے لکھا کرتا ہوں

اس مکتوب میں آگے چل کر فرمایا ہے "اور میں اب انتہائے عمر ناپائیدار کو پوچھ کر آفتاب لب با او"

بجوم امراض جسمانی و آلام روحانی سے زندہ درگور ہوں۔ کچھ یاد خدا بھی چاہئے نظم و شری نظم رو کا انتظام

ایزدانا و توانا کی عنایت و اعانت سے خوب ہو چکا ہے اگر اس لے چاہا تو قیامت تک میرا نام و نشان

باقی و قائم رہے گا۔" اشارہ ایسے ہی نظر آتے ہیں۔

بھاگا ہوں دام توڑ کے آفت رسیدہ ہوں بیجا نہیں جو سایہ سے اپنے زمیدہ ہوں
 ہیبت زدہ ہوں چاشنی غم چشیدہ ہوں ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
 میں دستِ غم میں ہوئے صبا دیدہ ہوں

کہتے ہیں یوں تو سب مجھے با اختیار ہو لیکن خدا گواہ جو کچھ اختیار ہو
 مجبور جو ہو پھر اسے کیا اختیار ہو ہوں درد مند جبر ہو یا اختیار ہو
 مگر نالہ کشیدہ گر اشک چکیدہ ہوں

چکے ہوئے ہے غصہ و غم کا زہ دہن خوش ذائقہ تلاوتِ جاں سے ہو کیا دہن
 اس درجہ تلخ تقادمِ آخر مرا دہن جاں لب پر آئی تب بھی نہ شیریں ہو دہن
 از بسکہ تلخی غم ہجراں چشیدہ ہوں

بے حس ہوں مثل عضو معطل پڑا ہوا جنبش مجھے ہو ذرہ برابرِ جال کیا
 میں لائقِ جزا ہوں نہ مستوجبِ نرا نے سحر سے ملا کہ نہ ساغر سے واسطی

میں معرضِ مثال میں دستِ بریدہ ہوں
 ہوں دشمنِ فرشتہ نہ جن و پری سے لاگ حیواں کی تاک میں نہ کسی آدمی سے لاگ
 اپنے سے ہے لگاؤ نہ کچھ غیری سے لاگ ہوں خاکسار نہیں مجھ کو کسی سے لاگ
 نے دانہ فنادہ ہوں نے دام چیدہ ہوں

پوچھو نہ ہمدرد مری حسرت کی داستاں
حراماں نصیب کر کے تفضالائی ہے یہاں
نا کامیاں نصیب میں وہ ہیں کہ الاماں
ظاہر ہیں میری شکل سے فسوس کے نشاں

خاراں سے دست ہند لال گزیدہ ہوں
سنبھلنے اپنی زلف کے کھولے نہیں شگنج
سبزان باغ ابھی نہیں گرم دلاں و غنج
باغ خیال دل سے ملنے ہوئے ہے رنج
ہوں گرمی نشاطِ تصور سے لغتہ سنج
میں عنذ لیب گلشن نا آفریدہ ہوں

مسکن نہ آسماں نہ زمیں ہے مری جگہ
کمر سی ہے اور نہ عرش بریں ہے مری جگہ
میں خود کہیں ہوں اور نہ کہیں مری جگہ
ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
ہوں میں کلام لغز و لے ناشنیدہ ہوں

ہے اک زمانہ بربر کہیں و مخالفت
دنیا کو ہے عروج میں میرے مزاحمت
پہناں ہے مشتری کی نظر سے مری صفت
جو چاہیے نہیں وہ مری قدر و منزلت

میں پوسف بر قیمت اول خریدہ ہوں
مشرک میرے کیوں ہے زمانے کو قال و قیل
میں بھی ہوں اپنے رنگ میں بے مثل و بیحدیل
ہے نیکوں نے فرض کر لیا بدخجہ کو بے دلیل
اہل و عیال کے زمرے میں ہر چند ہوں ذلیل
پر عاصیوں کے فرقے میں ہیں برگزیدہ ہوں

مرزا ہی سے نہیں ہے زمانے کو کچھ حسد
میں نے بھی بن گئے انسان دام و دود
اس طرح کھائے لینے میں جسکی نہیں ہے حد
پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد

ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردِ گنہگار ہوں

ہم سے بڑا و برا ہو تو بھلا کہتے ہیں لطف بیجا کو جوان پر ہے بجا کہتے ہیں
کچھ صواب اس نے کیا بھی تو ظاہر ہوئی کی وفام سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ آنکھوں کو برا کہتے ہیں

دل پر نشان ہے مغمیوں میں پریشاں اپنے ایسی آشفتنہ بیانی کو کوئی خاک سے
کہہ نہ بیٹھیں کہیں کچھ اور خدا خیر کرے آج ہم اپنی پریشانیِ حاطران سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

دردِ دل خود بھی جو رکھتے تو سمجھتے اسکو دردِ دیگر ہیں اندوہ فرا ہیں یہ تو
سارے سے مگر اب تیرے کہیں سب سن لو اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جوئے و نغمہ کو اندوہ رہا کہتے ہیں

راستہ دن بیتی، بیانیہ کی حالتِ غش سے ناکش خاک ہوں تیری بڑی گشتِ غش سے
رہنا کہ جاتا ہے ملتی ہو جیہ ہلکے غش سے دلیں جا کے ہوتی ہو فرصتِ غش سے
اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں

ہی ہو تر بخیرِ شرک ہے دلی سے مفقود ہم معبود ہیں نہ کہے کے نہ کعبہ معبود
رواقبہ میں تو صرف ایک جہتِ مقصود ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود

قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

یوں تو کانٹوں پر ہمیشہ ہمیں ترپایا ہے اب محبت کا تری لطف مگر پایا ہے
حالتِ زار پر تو بے جو ترس کھایا ہے پائے اوکار چبے تجھے رحم آیا ہے

خارہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں

سوزِ باطن کا جو کچھ حال ستم کرنے سنا دلنشین ہوئے کو تھا ہی کر کیا یک جھجکا
ہم تے بھی رنگ بیان کو وہیں اپنے بدلا اک شہر دل میں ہر اس کو کوئی گھر ایسا کیا

آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

کرتے ہم رد و قدح اس سے تو سہو دل انگ گفتگو کرتے ہوئے رہتا ہے نادِ بھنگ
ہاں میں ہاں اسکی ملاتے ہیں تو بڑھتی ہوا دیکھ لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ

اس کی ہر بات پر ہم نام خدا کہتے ہیں

سن کے یہ سانحہ مرزا سبھی رو دیں شاید جو سخن سنج ہیں اس غم کو نہ بھولیں شاید
بزمِ ماتم ہو پیا بزمِ سخن میں شاید وحشت و شیفۃ اب مرثیہ کہیں شاید

مہر گیا غالب آشفۃ نوا کہتے ہیں

۱۵ مہر گیا۔ ایک قسم کی گھاس جسکے متعلق روایت ہے کہ جو اسکو اپنے پاس رکھتا ہے لوگ اس پر مہرمان ہو جاتے ہیں گویا حبیب کا اثر رکھتی ہے جس سے تجھ رحم آیا ہے مانے ہی کچھ لیا ہے کہ تیرے راستے کے کانٹے "مہر گیا" کا اثر رکھتے ہیں اور ان ہی کی وجہ سے تو ہم پر مہرمان ہوا ہے ۱۲ مہر گیا آشفۃ نوا پریشان مایں کہنے والا۔ وحشت و شیفۃ دونوں غالب کے ہم عصر شاعر اور دوست تھے۔ اس شعر میں وحشت و شیفۃ کے الفاظ خاص طور پر ملحوظی پر کیا ہے۔ وحشت صاحب کا نام غلام علی خاں اور شیفۃ کا نام نواب مصطفیٰ خاں تھا۔ وہ جہانگیر آباد کے رئیس تھے جنکا شیفۃ صاحب ایک مانے ہوئے گن اور کس سچ تھے جو دہلی میں رہتے تھے وہ غالب کی عظمت کے حد سے زیادہ مت

عشق کیا جہنم قمری طوق گردن میں نہیں وہ جنوں کیا پھڑوں کز زم اگر تن میں نہیں
اسکو جنوں کیا کہیں جس کا مکان بن میں نہیں آبرو کیا خاک اس گل کی جو گلشن میں نہیں

ہے گریباں سنگ بیراہن جو دامن میں نہیں

پہلے دامن میں جو گلکاری تھی گلشن میں نہیں لطیف خونباری جو متاع کلاں میں نہیں
دل تو دل اب تو لہو گہائے گردن میں نہیں ضعف سے لے کر یہ کچھ باقی مے تن میں نہیں

رنگ ہو کر اڑ گیا خوں کے دامن میں نہیں

چونکہ دیواریں ہوئی تھیں سداہ آفتاب اسلئے وہ درہو ہے سجدہ کاؤ آفتاب
مٹی جو زردیدہ نگاہی اک گندہ آفتاب ہو گئے ہیں جمع اجزاء نگاہ آفتاب

ذرے اسکے گھر کی دیواروں کے وزن میں نہیں

در سیر خانہ کا میرے اک دربان خیر ہے موت کے مزمے میں ہوں جیسے طبیعت خیر ہے
ذرے افکار ہیں زمین خاک سید کا ڈھیر ہے کیا کہوں تاریکی زندانِ غم اندھیر ہے

بینہ نور صبح سے کم جسکے روزن میں نہیں

اس کو مارا اس کو زندہ کر دیا عجائز سے اسکو غم سے کیا بھل تو اسکو ناز سے
گھر بنایا اس نے ہر دل میں نئے انداز سے رونق ہستی ہے عشق خانہ ویران ملک سے

بقیہ ۵۵-۱۔ معتقدہ قدر شمس تھے ان دونوں کو اس مقطع میں یاد کرتے ہیں۔ ۳

انجن بے شمع ہے گر برق خرمین میں نہیں
 عمر بھر میں اس نے لے دیکر فقط یکساں طعن
 دیکھے انصاف سے تو سرسبز بیاہ طعن
 زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
 غیر سمجھا ہے کلدت زخم سوزن میں نہیں

جیتے جی اہل شک گل کے خوب نظائے ہوئے
 قبر میں پیشِ نظر وہ گل سے رسائے ہوئے
 مرے بھی پوئے یوں ہی ارمانِ دل سائے ہوئے
 بسکہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مائے ہوئے
 جلوہ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

کرنہ درماں چارہ گر مجھ خستہ ورنجور کا
 دل کی حالت دیکھ چھٹا ہو گیا زنبور کا
 ہر مسام اک زخم ہو گا اس تن محروم کا
 قطرہ قطرہ اک ہیو لاپے نئے ناسور کا
 نول بھی ذوقِ درد سے فاسخ مئے تن میں نہیں

کثرت سے پر جو شجی پر مینمانہ کو تھی
 ایک کش میں تم کے خم خالی کے اور بس نہ کی
 ڈٹ گیا میں زندہ پینے پر تو قلعی کھل گئی
 لے گئی ساقی کی نخوت قلمز آشاہی مری
 موج سے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

غم تو آئی کہ بھر کیونکر نہ اٹھے دل سے دود
 نیستی ہے اپنی ہستی اور عدم اپنا وجود
 کیا ادھیڑا پنج پیری نے تن کا تار و بود
 ہو فشاں ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود
 قدر کے جھکنے کی بھی گنجائش مئے تن میں نہیں

کس طرح مرزا ہو اسکی دیدہ خلقت میں قدر
 مال میں جس کا نہ مصروف نہ ہولت میں قدر

قد کی شہریت ہر جہت ہو قسمت میں قدر
حقی وطن میں شان کیا غالب ہو غریب میں قدر
بے تکلف ہوں ہر مشیت خس کہ گلشن میں نہیں

۵۰

اب جو مستانہ گھٹائے برستی ایک دن
آؤ مل جل کر اٹھائیں لطف ہستی ایک دن
دیکھ لو گے بخودوں کی تیز دستی ایک دن
ہم سے کھل جاؤ بوقت بے پرستی ایک دن
در نہ ہم پیٹیں گے رک رک کر ہر دستی ایک دن

جب گرد میں دام تھے ہر مغال تھا ہریاں
رات دن پینے پلانے سے تھی تب فرصت ہل
مظنی میں بھی نہ اس جسکے سے باز آن زباں
قرص کا پیتے تھے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ ہستی ایک دن

ہے بہا اس دور کی ایک ایک ساعت جانے
اس کی رونق کو نہ کچھ بے قدر قیمت جانے
زار نالی بھی جو ہوں تو ساز عشرت جانے
نغمہ ہائے غم کو بھی اسے دل غنیمت جانے
بے صدا ہو جائیگا یہ ساز ہستی ایک دن

زعم دانائی پر اس درجہ نہ کر ناداں نہ ہو
مثل گل پڑمردہ ہو گا ورنہ یوں خداں نہ ہو

اے مولوی محمد حسین آرزوے آب حیات میں کھلے کہ ایک دفعہ مرزا غالب قرضدار ہو گئے قرض خواہوں سے
نالس کردی۔ جواب دی ہی میں طلب سے گئے بمقام صدرالدين صاحب کی عدالت حق جس وقت یہی پر گئے انھوں نے
یہ شعر طرحا قرض کی پیتے تھے اے آرزوہ نے مدعی کو روپے اپنی گروہ سے ادا کر دینے اور اس طرح مسرزا
غالب قرض سے سبکدوش ہو گئے ۱۲۔

چار دن کی رفعت موبہوم پر نازاں نہ ہو غرہ اوج بنائے عالم امکان نہ ہو
 اس بلندی کے نصیب نہیں ہر پستی ایک دن
 شب سرمحل جو ہاتھ پائی وہ کرنے لگا کون کہتا ہے کغیروں نے اسے کسنادیا
 اس بُرے برتاؤ میں مٹرا نہیں اس کی خطا دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا
 ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیشدستی ایک دن

۵۱

ظاہر میں گو شغیف نہیں جہرباں نہیں ان کے ہمارے ربط کو فی درمیاں نہیں
 لیکن خفا بھی ہم سے وہ جانِ جہاں نہیں ہم پر جفا سے ترک وفا کا گماں نہیں
 اک چیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں
 تم پوچھنے جو آئے تو مجھ پر کرم کیا کچھ بھی اگرچہ رسم عیادت نہ کی ادا
 کیا کم ہے یہ نگاہِ ترحم سے دیکھنا کس منہ سے شکر کیجئے اس لطیفِ خاص کا
 پرستش ہے اور پائے سخن درمیان نہیں
 ہوتا نہیں وہ رام تو ہے اس کارم عزیز بڑھتا ہو جس سے شوق و شہتہ کیا ہر کم عزیز
 خفگی کا بھی تو شوخ کی ہر ہم کو غم عزیز ہم کو ستم عزیز ستم گر کو ہم عزیز
 ناہریاں نہیں ہے اگر جہرباں نہیں
 کیا جانے ذوقِ جور و جفا کو عدو سا ہینر ہم جس سے یاد آتے ہیں ہر ظلم ہی وہ چیز

اس لطیف معنوی کی کہاں غیر کو تمیز ہم کو ستم عزیز ستم گر کو ہم عزیز
 نامہریاں نہیں ہے اگر مہریاں نہیں
 کیا بات میں نے کی ہے کہ تم کو بری لگی حیرت سی نام بوسہ لب سن کے ہو گئی
 میں نے کیا سوال تو مجھ سے خطا ہوئی بوسہ نہیں نہ دیجئے دشنام ہی سہی
 آخر زباں تو رکھتے ہو تم گودہاں نہیں

قطع

ہر چند خولے یار میں اک الہاب ہے ہر چند عجب کو اس کو حضوری عذاب ہے
 ہر چند غیظ و غصہ بوقت خطاب ہے ہر چند جاں گدازی قہر و عتاب ہے
 ہر چند پشت گری تاب و توان نہیں
 لیکن جب اس سے رحم و کرم کی امید ہے جو گفتگوئے تلخ ہے حلوائے عید ہے
 اس ذوق و انبساط میں شکوہ بعید ہے جاں مطرب تراخ ہل من فریب ہے
 لب پر وہ سنج زمرۃ الاماں نہیں
 صادق اگر ہے عشق تو پھر کیا ہر خوف و بیم کر نذر یار گو ہر جاں بھی نہ ہی بیم
 پیدا وہ درد کر کہ ہو حال جگر سقیم خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم
 دل میں چھری چھو جو ترہ خونچکاں نہیں
 بے داغ سینہ ہو تو نہ سینہ اسے کہو خالی ہو سوزے تو جگر کو نکال دو

مضطر اگر نہ ہو تو سلام ایسی جان کو ہے ننگِ سینہ دل اگر آلتِ لہر نہ ہو
 ہے عارِ دل نفس اگر آذرِ فشاں نہیں

دشت میں مرکب پھڑپھڑاتا ہوں کھاکے پیچ و تار
 دیواروں در گریں کہیں ہو کچھ تو انقلاب
 دیوانہ ہوں تو کیا مجھے آنا نہیں حساب
 نقصان نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب

سو گز زمیں کے بدلے بیا بیاں گراں نہیں
 نغما بندگی کا مادہ میری سرشت میں
 بیتِ انصاف میں عمر کٹی یا کفشت میں
 ہوتا تھا اور خاک مے بختِ زشت میں
 گویا جہیں پر سجدہ بت کا نشان نہیں
 کہتے ہو کیا للہا ہے تری سرِ نوشت میں

ہو حرف گیر اگر ہے زباں خاص و عام کی
 پروا نہیں کسی کے خیالاتِ خام کی
 شہرت ملائکہ میں بھی ہے میرے نام کی
 پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی
 روح القدس اگر چہ ملا ہمزباں نہیں

مرزا سوالِ بوسہ لب کو وہ ہر گھڑی
 سن کر چوٹا لٹا ہے تو سوچتی ہر دور کی
 جب جاں بلب سے گاتو خود ہو گا مقتضی
 جان ہے بہائے بوسہ وے کیوں کہے ابھی
 غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

۵۲

میری تحریر جہیں لائے تفسیر نہیں
 میں جو آوارہ ہوں اس میں مری تفسیر نہیں

قابلِ چارہ مری گردش تقدیر نہیں مانعِ دشتِ نوردی کوئی تندر نہیں

ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

دل کا اک لورہ ہے جو لئے پھرتا ہے کشتاں بخود اتنا ہوں کہ ہے راہ بھی نظروں نہاں

کوئی منزل بھی تو پیدا نہیں جزوِ مگلاں شوقِ اس دشت میں دوڑاں ہر جھکو کر چلاں

جادہ غیر از نگہ دیدہ تصویر نہیں

جان تو ندر میں جلاد کو دی جاتی ہے اس کے خوش کرنے کی تدبیر تو کی جاتی ہے

لیکن امیدِ جفا قطع ہوئی جاتی ہے سیرتِ لذت آزار رہی جاتی ہے

جادہ راہِ رفتِ بزدل شمشیر نہیں

نہیں ناکامیِ فریاد کی پروا مجد کو نہ خیالِ آہ کی برباد روی کا مجھ کو

ہو نہ پوری نہ سہی ہے تو تمنا مجھ کو رنجِ نو مبری جاوید گوارا مجھ کو

خوش ہوں گریزاں زبونی کشِ تاثیر نہیں

خشک ہو زخمِ توبے چینِ دل اپنا ہو جائے جب تک اک زخمِ بیاور نہ پیدا ہو جائے

سنگِ طفلان جو نہ کھاؤں مجھے سودا ہو جائے سر کھاتا ہے جہاں زخمِ سراچھا ہو جائے

لذتِ سنگِ باندازہ تقدیر نہیں

کریا عفو کا جب وعادہِ راسخ اس نے کون شرمندہ ہو پھر شرمِ گنہگاری سے

نفس کہتا ہے کہ لے خوب گناہوں کے مئے جب کرمِ رخصتِ بیباکی و گستاخی دے

کوئی تقصیر بجزِ نجلتِ تقصیر نہیں

وہ بھی مرزا سا جریدہ ہے بقول ناسخ صاحب اوصاف حمید ہے بقول ناسخ
ہند میں شاعر چمیدہ ہے بقول ناسخ غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد تیر نہیں

تری رد گزریں جو ہم دیکھتے ہیں فضا ایسی جنت میں کم دیکھتے ہیں
گل و لالہ ہر صبا ہم دیکھتے ہیں جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں
ہوئے ہم جہ مشتاق اس کے سخن کے یہ آثار گویا ہیں دیوانہ پن کے
دہن ہی نہیں اس بیت سحر فن کے دل آشفنگاں خال کنج دہن کے
سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں

۱۔ یہ ترقی کی علامت اور ان کے کلام کی عظمت کا ہر ساعے اعتراف کیا ہے دوفی نے کہا ہے سہ
رہ ہوا پر۔ ہوا تیسرے کا اعدا نصیب دوقو یا ریلوں سے بہت دور ریل میں مارا
ستودار یا لکھی کہا ہے سہ ستودار تو اس غزل کو محلِ دو ریل کہہ نہ ہونا پڑا ہے تیسرے استاد کی طرف
عالم نے یہ مسطور گزراں ہمارے استاد کا اس رائے سے اتفاق کہ تا میر تقی میر کے طبع باریستا ہوئے ہیں کوئی مستر
باقی نہیں رہے جیسا کہ انھوں نے کہا ہے سہ
رہنچے کے تمہیں استاد ہیں ہو غالب کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی تیر بھی تھا
ناسخ لکھنؤ کے مشہور ساعر اور اپنے زمانے کے استاد تھے انھوں نے فرمایا ہے کہ جو شخص میر تقی میر سے عقیدت
ہیں رکھا وہ بے بہرہ ہے غالب نے مقلع میں ناسخ کے مہر تالی کو بابر دھاکے ۱۲۔

ترے قد موزوں نے پایا وہ عالم عجب کیا قیامت کرے خیر مقدم
جو تو ہو خسران تو محشر سلم ترے سرو قیامت سے اک قد آدم

قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

جو ہے حیرت آئینہ تجھ کو پیاری تو اس سے بھی بڑھ کر ہے حیرت ہماری
فقط اک نگہ کی ہے امیدواری تماشا کر اے مومن داری

تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

رہے ہجر میں رات بھر گرم نالے گئے قافلے جانبِ عرش ان کے
نہ ہوتا نشان تو نشاں بھی نہ پاتے سراغِ توفیق نالے داغِ دل سے

کر شبر و کافش قدم دیکھتے ہیں

نہیں رکھتے مرزا کسی سے مطالب نہ دل جانبِ عیش دنیا ہے راغب
تمنائے زر ہے نہ دولت کے طالب بنا کر فیروں کا ہم بھیس غالب

تمنا شائے اہل کرم دیکھتے ہیں

جلتا ہوں ان کی گرمیِ قہر و عقاب میں کیونکر مرے نہ پاؤں عذابِ عقاب میں
پوچھو نہ مجھ سے گرمیِ دوزخ کے باب میں ملتی ہے خوں سے یار سے نارِ التهاب میں

کافر ہوں گر نہ ملتی ہو لذتِ عذاب میں

لے جاؤ گے صوفیہ پر

آیا ہوں درد و غم کے لئے انتخاب میں دن زندگی کے کاٹ رہا ہوں غلاب میں

ہوں عرصہ دراز سے اس پہنچ و تاب میں کب سے ہوں کیا بتاؤں چہاں خراب میں

نبھائے ہجر کو بھی رکھوں گھر حساب میں

کیا کہتے ہوتی تھی شب غم کس طرح بسر اختر شمار یوں ہی میں ہو جاتی تھی سحر

توڑا ستم یہ اور نیا چشم شوق پر تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر

آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

آنکھوں میں پیشتر ہی نہ تھا نیند کا گزر کرتا تھا صبح ہجر میں سر پیٹ پیٹ کر

غفلت جو روتے روتے ہوئی شب کسی قدر تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر

آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

لکھ تو دیا انھیں کہ مرا حال ہے زبوں ہے ان سے آرزوئے تسلی تزا جنوں

آگاہ ان کی عادت و خصلت و خوبیوں قاصد کے آتے آتے خط اکا اور لکھ رکھوں

میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے تو ان میں

رہتے تھے ہم پیالہ جہاں ان سے خاص عام اٹھنا تھا ایسی بزم سے میں روز نشہ کام

پینے میں آج مجھ کو نہ ہو کس طرح کلام مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دو کجام

ساتی نے کچھ ملانہ دیا ہو شراب میں

لے تاہ آتش و دھج اہتاب نخلوں کا بھر کنا۔ فرماتے ہیں محبوب کی بدخوئی بھی میرے لئے سامان راحت ہے۔ دوزخ

کا آگ بھی نخل زنی اور بھرنے میں اس کی خوشی سے متا بہت کھتی ہے اس لئے یہ بھی میرے لئے سامان راحت ہے اگر میں

ایسا نہ سمجھوں تو کافر ہوں عشق کا ایمان یہی ہے ۱۲۰

آنکھیں بھی راہ میں جو بچھاتا ہوا چلے ممکن نہیں کہ مکر و فسوں غیر کا چلے
چالیں ہزار بار سے یہ پردہ غا چلے جو مکر و فاف ہو فریب اس پہ کیا چلے
کیوں بدگمان ہوں دوست دشمن کے بائیں

دھڑکا مجھے تو یہ ہے کہ دشمن نہ آئے جاتے ہوئے تمہیں مئے گھر سے نہ دیکھ لے
تم ہنستے ہنستے ہو گئے خاموش کس لئے میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ قریب سے
ڈالاجے تم کو وہم لے کس بیچ و تاب میں

وہ آن میرے گھر جو چلے آئے مست سے شکر خدا کہ ہو گئے قصبے تمام طے
جاتے لئے وصال کا وعدہ بھی کر گئے میں اور خط و وصل خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بول گیا اضطراب میں

سیردہ کچھ اثر ہیں نمایاں عتاب کے لیکن ہیں چپ خیال سے شرم و حجاب کے
آثار بات بات میں ہیں بیچ و تاب کے بے تہوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرف نقاب میں

آنا ہے یوں تو ان کو لڑانا نگاہ کا نظر میں بچا کے سب کی ملانا نگاہ کا
آفت ہے اُن مگر نہ اٹھانا نگاہ کا لاکھوں رگا و ایک پیرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

لے لٹاؤ سے ٹاؤٹ یا محبت مرا ہے۔ فرماتے ہیں دوست کی لاکھوں لگاؤ میں ایک طرف اور نگاہ کا پیرانا ایک طرف۔ اسی طرح مصروف ثانی میں لاکھوں بناؤ سنگار ایک طرف اور غصہ میں بگڑنا ایک طرف۔ دونوں مصرعے ہم اند اور لاجواب ہیں۔ عاشق و معشوق کے درمیان ہمیشہ ایسا ہی گزرتا ہے معشوق کی (باقی حصہ ۹۷)

وہ نالہ جو کہ عرشِ معلٰی کو بھی ہلائے وہ نالہ جو زمین کو بھی زلزلے میں لائے
 ۲ وہ نالہ اور کان تک اس شورخ کے بجائے وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
 جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں

جادو وہ چیز ہے کہ جو اس کو عمل میں لائے مشکل سے مشکل امر کو آسان کر دکھائے
 لیکن مجھے یہی تو ہے افسوس ہائے ہائے وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
 جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

تھے یا ترکہ پیالہ ہمارے سبھی کبھی دیکھا نہ ہم نے ہوش میں مرزا کو بھی کبھی
 وہ دن کہاں کہ شغل سے فرصت نہ تھی کبھی غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
 پیتا ہوں روزِ ابرو شبِ ماہِ تاب میں

۵۵

جامِ سبو کو رکھ نہ بچا کر سحاب میں شامل نہ کر صبوحی کو شب کے حساب میں
 وہاں کچھ کمی نہیں کہ ہے تو اضطراب میں کل کے لئے کر آج نہ خستِ شراب میں
 یہ سوئے ظن ہے ساقی کو تر کے باب میں

گردِ شہ سے پیوست نہ لگاؤٹ عاشقی کے لئے ہنس بڑی چیز ہے اور عاشق کی نظر میں مکہ چرانا لگاؤٹ سے بھی زیادہ
 ۲ دلفریب ایک طرح معنوں بناؤنگار میں مہابت دلفریب ہونا ہے مگر اس کا عہد سے مجھ پر ماہکے بناؤ سے ہر جہاد لہر باہو جاتا ہے
 مولانا آئندہ جو بیٹہ سادہ کلام کو پسند کرتے تھے اور عائشہ کی پیروی گوئی پر حرف رکھتے تھے اس شو کو سنکر نہایت
 خوش ہوئے مگر طرزِ بطور مزاج یہ کہا بہ تو ہماری طرز کا شعر ہے ابیں غائب کی کون سی خوبی ہوئی۔ ۱۳

یا تو ملائکہ سے بھی مخامخ مرتبہ بلند ہم سا نہیں ہے یا کوئی اب خوار و مستمند
 پہونچا رہا ہے ہر تنفس ہمیں گزند ہیں آج کیوں ذلیل کر کل تک تھی پسند
 گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

آخرب کیوں روح کا قالب سے انزع کیوں بڑھکے کرب سانس کا ہونا ہے انقطاع
 سننے سے اسکے کہتے ہیں کیوں ہوش اوداع جان کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دم سماع
 گروہ صد اسمائی ہے چنگ و رباب میں

کہتے ہیں صاف صاف یہ انداز چال کے لینا نہیں مردم سے ادھر دم کہیں اسے
 بے اختیار ہوں کہیں مجھ کو گرانہ دے رو میں ہے خوش عمر کہاں دیکھئے تھے
 نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پاس رکاب میں

کی لاکھ فکر ہستی آشیاب میں پے پے قصہ ہوانہ ان کے وجود و عدم کا طے
 جہنم میں مبتلا ہوں کہیں بھی ہوں طرف نشے انسا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بے
 ہنسا کہ وہم غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

ایجاد کیا کہ موجد و وجود ایک ہے سب معبدوں میں عابد و معبود ایک ہے
 کیا ذکر سجدہ ساجد و مسجود ایک ہے اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
 جہاں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

موج و حباب میں ہے مقرر وجود بحر ان کا وجود بھی ہے سراسر وجود بحر
 کہئے انھیں عرض تو ہے جو ہر وجود بحر ہے مشتمل نمودِ صور پر وجود بحر

بیاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و جاب میں
 بیٹے ہیں تانہ حسن سے ہم کو ہوا گہی
 بے رہروں کے واسطے سامان گہوی
 جب چھپ سکے نہ ذات سے پرے کی کیا رہی
 شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے ہی
 ہیں کتنے بے جاب کہ ہیں یوں جاب میں
 گو خود نما نہیں ہے وہ پردہ نشیں ہنوز
 نظارگی نہیں کوئی اس کا کہیں ہنوز
 ہے مونا ز خود بھی وہ ناز آفریں ہنوز
 آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
 پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں
 اشیا کی ہے تصور اشیا سے سب نمود
 دیکھا جو غور سے تو خیالی ہیں سب جود
 استی کی ولہے کی ہڈت ہرست بود
 ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
 ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
 مرزا کو ایک عمر سے ہے جستوئے دوست
 کچھ آرزو نہیں ہے بحر آرزوئے دوست
 آنکھیں ہیں منہشیں کی طرف دل ہرست دوست
 غالب بنیم دوست کراتی ہر لست دوست
 مشغول حتی ہوں بندگی بو تراب میں

کس طرح رو کوں گریہ شام و سحر کو میں
 کس کس کے سچ و غم میں کھپاؤنگا سحر کو میں
 رولے میں رو نہ بیٹھوں کہیں چشم ترکو میں
 جہاں ہوں لکھ دووں کہ بیٹھوں سحر کو میں

مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوہ گزر کو میں

مانا نہ دل سے تیرا چہ دشمنوں کو دوں آگاہ تیرے نام سے اغیار کو کروں
آوارہ و خراب تری جستجو میں ہوں چھوڑا نہ رشک لے کر تیرے گھر کا نام لوں

ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

جس راہ میں قدم کا بھی رکھنا تھا ننگ عار طے سر کے بل کیا اسے اللہ رے اضطراب
دم بھر کو بھی تو دل لے نہ لینے دیا قرار جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار

اے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کو میں

آہ میرے قتل کو کس زعم پر ہوئے انجان تم نے جان لیا جان من مجھے
دھمکی میں تو وہ آئے نہ معلوم ہو جسے ہے کیا جو کس کے بازو ہو گئے میری بلا ڈرے

کیا جانتا نہیں ہوں تمھاری کمر کو میں

میں جانتا تھا مجھ کو فقط ان سے کام ہے الفت ہو ما سوا سے تو سودائے خام ہے
اس پر بھی ہے بہ قدر تو میرا سلام ہے لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ نام ہے

یہ جانتا اگر تو لٹا تا نہ گھر کو میں

کرتا ہوں سو قدم بھی اگر طے نہ تو کیسا تھ یعنی ہر اک قدم پہ ہوں کہ خضر نو کیسا تھ
آہستہ رو کے ساتھ کبھی تیرو کیسا تھ چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کیسا تھ

پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

ہر چند بت کدوں ہی میں سب عمر دی گزار لیکن خدا گواہ کہ ایماں ہے برقرار

ہاں شوق دید کا تو ہوں بیشک گناہگار خواہش کو محنتوں نے پرستش دیا قرار
 کیا پوچھا ہوں اس بہت بیدار کو کہ میں
 پھر گم ہوا تلاش میں اس کی میں دلفگار ہوش و حواس پر نہ رہا پھر کچھ اختیار
 پھر سعی و جستجو کا جنوں سر پہ ہے سوار پھر بخود ہی میں بھول گیا راہ کو تے یار
 جاتا دو گرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں
 پر سان حال کوئی ہنر کا نہیں رہا باقی جہاں میں قدر ہنرور نہیں ذرا
 مجھ کو یہ زعم اب بھی ہیں گاہک ہزار ہا اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہل دہر کا
 سمجھا ہوں دلپذیر متاع ہنر کو میں
 مرزا میری دعا بھی یہی ہے بعد نیاز دیکھوں جمال بار میں اے رب کار ساز
 جس طرح پہلے کہہ گیا ہے اک سخن طراز غالبؔ خدا کرے کہ سوار سمنند ناز
 دیکھوں علی بہادر عالی گہر کو میں

اے مقطع میں نواب علی بہادر جاں وائی باندہ کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے مرزا غالب کو اپنے یہاں مدعو کیا تھا
 ایک خط میں انوار الدولہ رفیع کو یوں تحریر فرماتے ہیں میرے باندہ بندیل کھنڈ آنے کا میں نے سر سامان کر لیا
 ڈاک میں روپیہ ڈاک کا دے دیا قصد برتھا کہ فتح پور تک ڈاک میں جاؤں گا وہاں سے نواب علی بہادر کے ہاں کی
 سواری میں جا کر باندے میں ہفتہ بھر رہ کر کالمی ہوتا ہوا آپ کے قدم دیکھتا ہوا سبیل ڈاک دلی چلاؤں گا
 ناگاہ مصور والا بیمار ہو گئے (ظہر باد شاہ) اور مرض نے طول کھینچا وہ ارادہ قوت فعل میں آیا۔

کون کہتا ہے خفا مجھ سے وہ مغرور نہیں کینہ و بغض جو مجھ سے ہے وہ متور نہیں
 لے سکے نام مرا کوئی یہ مقدر نہیں ذکر میرا بدی بھی اسے منظور نہیں
 غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں
 بعد اک عمر کے بیدار ہوا طالع شوق خوش نصیبی ہے کہ پرکاتو ذرا طالع شوق
 آج تو برسرِ یاری ہے مرا طالع شوق وعدہ میر گستاں ہے خوشا طالع شوق
 مردہ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں
 ہے فقط نقطہ موہوم اگر ہے عالم دہن اس شونخ دل آرا کا مگر ہے عالم
 وہم ہی وہم ہے گو پیش نظر ہے عالم شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم
 لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں
 غور سے دیکھ اگر رکھتا ہے چشمِ باطن تجھ پہ کھل جائے گا یہ عقدہ مشکل کن
 جزو ہو کل سے جدا یہ نہیں ہرگز ممکن قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
 ہم کو تقلید تنگ ظرفی منصور نہیں

اے عاتب صاحب نے ایک خط شاہ عالم ہاروی کو لکھا :-

مشفق، مکرئی! چودھری عبدالغفور صاحب کو میرا سلام کہئے گا اور یہ پیغام پہنچائیے گا کہ حضرت صاحبِ عالم
 کی متنائے دیدار بقید بارہ کتا یہ اس سے ہے کہ اور کسی کا بھی دیدار مطلوب ہے۔ خواہش وصل مقدر ہو جو نہ کو
 نہیں۔ معروضاتی ترمیم کے ساتھ لکھا۔

وائے ناکامی امید کہ ہمت نہ رہی باغم جس سے اٹھاتے تھے وہ قدرت نہ رہی
خوصلہ دل کا ہوا پست وہ جرات نہ رہی حسرت لے ذوق خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی
عشق پر عہدہ کے گوں تن رنجور نہیں

ہنس کے کہتے ہیں گئے آپ اگر جنت میں ہوں گے غلمان ہی غلمان ہاں یا جوریں
کچھ تعجب نہیں جو آپ وہاں جو رہیں میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں کھیں
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم جو نہیں

یہ تو ممکن نہیں تو دل سے مجھے بھولا ہو ہاں جو اغماض سے لے کام تو چارہ کیا ہو
کچھ پرانہ بھی رہے یاد کا تو اچھا ہو ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو
تو تغافل سے کسی رنگ میں معذور نہیں

لے خوشا بزم طرب جس میں ہم ہیں ہم لوگ دافیع رنج و الم دشمن غم ہیں ہم لوگ
آج تک راہرو نقش قدم ہیں ہم لوگ صاف ورد کی شہ پیمانہ ہم ہیں ہم لوگ
وائے وہ بادہ کراشردہ انگور نہیں

ہے فدائی مرے نکمتوں کا فدائی غالب میری حکمت کا شاگر ہے شنائی غالب
پوچھو مرزا سے مری نغمہ سرائی غالب ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب
میرے دعوے پر یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

قابل رجز فغان دل ناشاد نہیں آہ وزاری یہ مری لائق ایراد نہیں
ہے فقط یاد دہانی کوئی فریاد نہیں نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں

ہے تقاضا، جہاں شکوہ سیرا نہیں
 عاشقوں کو نہیں محبوبے جاں بھی محبوب
 ہاں سمجھتے ہیں رضا ہوئی دشمن محبوب
 ننگِ عشاقِ مخافہاد کا بیجا اسلوب
 عشق و حروری عشرت گہر کی انوب
 ہم کو تسلیم نکونامی فرحاد نہیں
 رکھتی تخی خانہ نشینی تنگ در سے حروم
 اب کاوٹ دم و حشت ہو نہ دل ہے مغموم
 گویا ہاں میں ہے آبادی و رونقِ مقدم
 کم نہیں وہ بھی خرابی میں یہ وسعت معلوم
 دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھریا نہیں
 ہر تغیر سے زمانہ کے ہے عبرت مطلب
 دور اس کا سبق آموزی عالم کا سبب
 یہ مودب وہ ہے جو خوب کھانا ہے ادب
 اہل بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
 لطمہ موج کم از سیلی استاد نہیں
 کس خموشی سے توجہ لائے ہم جو رجفا
 آہ و نالہ کو کیا ضبط سمجھ کر شکوہ
 پھر بھی سمجھا نہ ستم گارے پا بند رضا
 وائے حرومی تسلیم و بداحالِ وفا
 جانتا ہے کہ ہمیں طاقت فریاد نہیں
 اشیانے سے قدم اب تو نکال اپنا کہیں
 اب نہیں ہے وہ زمانہ کہ رہے گوشہ نشین
 شکر کر آج کوئی دام نہیں فرشِ زین
 بدگل کے تلے بند کرے بے گل چیں
 مرده اسے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں
 دل کے لینے کو تو ہر دم تھا تقاضا لا
 بوسہ مانگا تو بہ تکرار یہ بولا لا لا
 ف خوب گل چہرے اڑا کوئی حرام ہی نہیں۔

مقا تو معدوم دہن لانے معما کھولا نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا
 دی ہے جائے دہن اس کو دم ایجا نہیں
 شبنم اس عشرت گلزار یگریاں کیوں ہے دیدہ نرگس حیرت زدہ حیراں کیوں ہے
 منقبض غنچہ گل وقت بہاراں کیوں ہے دیدہ نرگس حیرت زدہ حیراں کیوں ہے
 گر چہ راغان سر رہ گزر بار نہیں
 تم اگر بھول گئے اپنی حکایت غالب سن یو مرزا سے وہ پردرد روایت غالب
 ہو گئی سہو کی یہ کیا تمہیں عادت غالب کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شرکایت غالب
 تم کو بے چہری یا ران وطن یاد نہیں

مرے عقائدِ راسخ میں کچھ فساد نہیں خدا نخواستہ میں منکر معاد نہیں
 غلط کہ یاد مجھے طولِ روزِ داد نہیں نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
 شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں
 یہ بات ساقیِ ہوش نے کیا بنائی ہے کہ ہونہ ابر تو پیئے میں کیا برائی ہے
 ہمیشہ کیا اسی صورت سے پی پلائی ہے کوئی کہے کہ شبِ مر میں کیا برائی ہے
 بلا سے آج اگر دن کو ابر باد نہیں
 کریں رقیبِ برائی بھی تو بُرا نہ کہیں بھلائی لاکھ ہو مجھ سے مگر بھلا نہ کہیں

کبھی زباں سے کوئی کلمہ خیر کا نہ کہیں جو آؤں سامنے ان کے تو مرجانہ کہیں

جو جاؤں پاس سے ان کے تو خیر پاؤں نہیں

دل و ہجر غم و ایزدائے رشک بہتے ہیں سرشکِ خونِ جگر چشمِ تر سے بہتے ہیں

عرو کے ساتھ وہ مصروفِ عیش ہوتے ہیں کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں

کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

کھلا ہی رہتا ہے اٹھوں پہر فیضِ کباب اس آستانے سے ملتا نہیں کسی کو جواب

جو صرف راہِ خدا ہو نہیں کچھ اس کا حساب علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب

گردائے کوچہ میخانہ نامراد نہیں

رہے جہان میں ہم مبتلائے رنجِ مدام کھلی جو آنکھ تو دیکھانہ بزمِ غم و آلام

سنا نہیں کبھی ہم نے سرور و عیش کا نام جہاں میں ہوں غم و شادی ہم ہیں کیا کام

دیا ہے ہم کو خزانے وہ دل کشاد نہیں

اک التماس تو مرزا کی بھی سنو غائب کرو وہ بات نتیجہ بھی جس کا ہو غائب

خفیف ہو گئے یہ چھیڑاں سے چھوڑو غائب تم انکے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غائب

یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

روز مضمون نیا باندھتے ہیں روز مرہ بھی جدا باندھتے ہیں

تجھ کو ہم برق ادا باندھتے ہیں تیرے تو سن کو صبا باندھتے ہیں
ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں

نالہ دل کی حقیقت کیا ہے کامیاب اس سے کوئی ہوتا ہے
چھیڑنا اس کو فقط منشا ہے آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے
ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

تجھ کو وہ چال ہے حاصل لے عمر دم میں لے کرتی ہے منزل لے عمر
تیری رفتار ہے کامل لے عمر تیری فرصت کے مقابل لے عمر
برق کو پا رہنا باندھتے ہیں

بند کا جب کہ ہے بندہ مفہوم مرگ کی پھر ہے توقع موہوم
کیوں رہیں شوقِ اجل میں مغموم قید ہستی سے رہائی معلوم
اشک کو بے سرو پا باندھتے ہیں

سریں رکھتا ہے نہ یہ نشہ مل نہ اسے نازش عشقِ بلیبل
ناز ہے حسن بہر اپنے باکل نشہ رنگ سے ہے واشد گل
مست کب بند قبا باندھتے ہیں

ان کی بندش کو سخن چیں مت پوچھ کس طرح لیتے ہیں تمہیں مت پوچھ
شعرا کی غلط آئیں مت پوچھ غلطیہائے مضا میں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

مجھ سے وحشی کا کیا کیا درماں ڈال دی پاؤں میں گویا جولاں
 چارہ گراپنے ہیں کتنے ناداں اہل تدبیر کی دامانہ گسلاں
 آبلوں پر بھی حسا باندھتے ہیں
 تھے وہ مرزا ہی سے پیماں غالب ہم سے دھوکا نہیں آساں غالب
 ہم کو سمجھا کوئی ناداں غالب سادہ پرکار ہیں خوباں غالب
 ہم سے پیمان وفا باندھتے ہیں

۶۱

جب تیری خاک رہ کی برابر نہیں ہوں میں کیا شکوہ سنچ جو مقدر نہیں ہوں میں
 بے تے میں سنگ در کا بھی ہمسر نہیں ہوں میں قائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
 خاک ایسی زندگی پر کہ پتھر نہیں ہوں میں

۱۔ خط بنام نواب کلب علی خاں۔ بعد تسلیم معروض ہے حب بادشاہ دہلی نے مجھ کو نوکر رکھا اور خطاب دیا اور
 خدمت تاریخ نگاری سلطین نمودار مجھ کو تعویض کی تو میں نے ایک غزل طرز تارہ ریحی مقطع اس کا یہ ہے
 ”عانت و ظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دما۔۔ ۶“ اب مقطع کی صورت بدل کر حضور کی نذر کرنا ہوں خدا کرے کہ خدمت
 کو پسند آئے سے بڑھا ہوا ہوں قابل خدمت نہیں اسد نہ خیرات خوار محض ہوں نوکر نہیں ہوں میں
 خط میں ایک قطع بھی لکھا تھا جس میں مقطع بدل دیا ہے۔ قطع حسب ذیل ہے۔ ۱۔

در برابر کلب علی خاں کے ہوں مقیم
 شانہ گزائے ہر در نہیں ہوں میں
 بڑھا ہوا ہوں قابل خدمت نہیں اسد
 خیرات خوار محض ہوں نوکر نہیں ہوں میں

ہو جائے مضطرب تو نہیں کچھ خطائے دل انصاف شرط ہے کہیں راحت بھی پائے دل
دن رات جو چرخ کہاں تک اٹھائے دل کیوں گردشِ ملام سے گھرا نہ جائے دل

انسان ہوں پیالہ و سائے نہیں ہوں میں

بیکار کیوں سمجھتے ہیں اہل جہاں مجھے نقصان کیا کسی کو ہے میرے وجود سے
سہواً نظم نہیں ہوں کہ معنی بدل گئے یارب مجھے زمانہ مٹاتا ہے کس لئے

لوحِ جہاں پر حرف مکر نہیں ہوں میں

تجویرِ قتلِ جرمِ الفت کے واسطے ہے ننگِ مدعیِ عدالت کے واسطے
یہ جو روِ ظلمِ اہلِ محبت کے واسطے حد چاہیے نرا میں عقوبت کے واسطے

آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

حُفرتِ حقیر جانتے ہیں کس لئے مجھے بے آبرو کیا مری تقدیر نے مجھے
نسبت نہیں ہے کوئی جمادات سے مجھے کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے

لعل و زمرہ و زرو گوہر نہیں ہوں میں

اجرامِ چرخ بھی تو نہ غروم ہوں دریغ اور مجھ سے کہ تنگ ہو ہی توں کاتوں دریغ
بندہ نواز کس لئے آخر ہے یوں دریغ رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ

رتے ہیں ہر وہاں سے کمتر نہیں ہوں میں

گردوں نے بوسے پاؤں کے کس شوق سے لئے سر پر قدم تمہارے زمیں تک نہ لئے
یہ روک ٹوک ہے تو فقط ہے مرے لئے کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوسے کے لئے

کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں
 مرزا کی طرح شغل تمہیں بھی کوئی نہ تھا
 بے کار بیٹھے بیٹھے زمانہ گزر گیا
 خوابیدہ بخت شکر ہے بیدار تو ہوا
 غالب و ظیفہ خواہر ہود شاہ کو دعا
 وہ دن گئے کہ کہتے تھے لو کہ نہیں ہوں میں

۶۲

تمہیں کبھی زلفیں جو زریب سنبلستان ہو گئیں
 خار بن کر جلوہ گرد و زرخاں ہو گئیں
 تشکلِ نرگس چہنہائے شوخ و فتال ہو گئیں
 سب کہاں کچھ لار و گل میں نمایاں ہو گئیں
 خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پہاں ہو گئیں
 آہ لے عہدِ جوانی وہ انگلیں اب کہاں
 تو ہی جب نصرت ہوا پھر کیا ہے عمر جاواں
 ولولے ہی دلیں تھے کچھ اور جہنگ تھے جواں
 یاد تھیں ہم کو بھی زرگارنگ بزمِ آرا تیاں
 لیکن اب نقش و نگار طاقِ نسیاں ہو گئیں

لے یہ عزلِ دلہا زدہ و اجارِ بس اس تمہید کے ساتھ شائع ہوئی تھی کہ اس ہفتہ میں جو مشاعرہ ہوا صاحبِ مرزا نور الدین بہادر
 جو کھنوسے تشریف لائے تھے اور نہادہ والا تار و لولہ افروز شغلِ متاعہ تھے ایک عزلِ مرزا علی مرتضیٰ
 اور عزلِ جنابِ محمد رسول اللہ صلاں غالب کی راقمِ اجار کے پاس پہنچی۔ جو کہ اردو اخبار میں شائع کر دی گئی۔ غالب
 منشی حقیر کو بھی اس عزل کے متعلق لکھا ہے۔

”بھائی خدا کے واسطے غزل کی داد دینا اگر نیت یہ ہے تو میر و مرزا کیا کہتے تھے اگر وہ رنجہ تھا تو پھر یہ کیا ہے
 صورت اس کی یہ ہے کہ ایک صاحبِ شہزادگانِ تیموریہ میر سے کھنوسے یہ زمین لائے حضور نے خود بھی غزل کہی اور
 مجھے بھی حکم دیا سو میں حکم بجالایا اور غزل لکھی۔“

ہو گیا ہر چند پہلو سے جدا نعت جگر دیکھتی آنکھوں ہوا گم یک بیک نور نظر
دیدہ بے نور واسطے شوق سے اٹھوں پہرے قید میں یعقوب نے لی گونہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزِ دلیوارِ زنداں ہو گئیں

سیکڑوں قربانی رشک رقابت مر گئے ہیں زبانِ خلق پر دن رات جھکے تذکرے
غیر کا نظارگی ہونا نہ چاہا عشق نے شہرِ رقبہوں سے ہیں ناخوش پر نہاں مصرے
ہے زلیخا خوشی کہ مجھ ماہ کنعاں ہو گئیں

ہم کو یہ سمجھے ہوئے ہیں اس قدر بے ننگ نام ننگ ہے ان کہتے ہم ہوں اگر ان کے غلام
خیر اگر چاہا خدا نے پھر تو بن جائے گا کام ان پریزادوں سے لینے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے ہی حوریں اگر وال ہو گئیں

دل میں تو بیشک اترتی ہیں یہ چہریاں بار بار آن واحد کے لئے لیکن نہیں ان کو قرار
تیرہن کر آ رہی ہیں جاری ہیں برق وار وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب بار بار
جو مری کوتاہی قسمت سے شرکاں ہو گئیں

دیدیا ہے اذن درباں نے تو کھا کرتیج و تاب کم ہوا منت سماجت سے مری امر کا غتاب

لے قاعدہ کے عاشق ہمیشہ قبہوں ناخوش رہتے ہیں مگر زلیخا سے مستی رہی یعنی وہ مصر کے عورتوں کو دیکھ کر خوش ہوئی تو
زلیخا پر طعنہ زن تھیں کہ تو نے ایک غلام سے عشق کیا ہے۔ زلیخا نے انہیں اپنے گھور دیکھا۔ جب وہ انہیں تو ایک ایک لیموں
پھر ایک ایک جھری سب کے ہاتھ میں دے کر ہلاکت کی کہ جب یوسف انہیں تو جھری سے لیموں کاٹ دیں مگر جب یوسف
ساتنے آئے تو ان کے حال کو دیکھنے میں اتنی خوش ہو گئیں کہ سب نے انتہائی وارفتگی میں بجائے لیموں کاٹنے کے اپنی انگلی
کاٹ لی تب زلیخا نے کہا کہ تم مجھ پر طعنہ زن تھیں اب جن کا اثر دیکھ لیا۔

ہو گیا ہے سہل گو فعل میں ہونا بایاب واں گیا بھی میں تو انکی کا یوں کا کیا جواب

یاد تھیں جتنی دعائیں صرف رباں ہو گئیں

کام اچھا دے گیا صبر و سکون انجام کار ورنہ پہونچی تھی یہ نوبت پیر بن ہوتا رتا ر

دل فغاں کرتا تو پھر ہاتھوں کو کیوں تاقرار بسکرو کا میں نے اور سینے میں ابھریں بار بار

میری آہیں بخیر چاک گر یہاں ہو گئیں

میکرے میں تشنہ لب جو زندہ کام آگیا چشمہ آب بقانگ وہ مے اُشام آگیا

جی گیا جو کشتہ شمشیرِ آلام آگیا جاں فزا ہے باد جس کے ہاتھ میں جام آگیا

سب بیکریں ہاتھ کی گویا رگ جال جا گئیں

اپنے نصب العین ہیں جملہ مذاہب العلوم نقش ہیں دل پر تمام انکے قوانین و علوم

پہنچ ہیں اپنی نظر میں لاکھ ہوان سکی دھوم ہم موہ رہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم

ملتیں جب مٹ گئیں اجزاء ایماں ہو گئیں

ابتلا میں تو بہت کچھ دل کو تر پاتا ہے رنج غمزدہ کی جان کو آٹھوں پہر کھاتا ہے رنج

ضبط و استقلال سے آخر تنگ آتا ہے رنج رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج

مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کراہاں ہو گئیں

دوستوار مرنے کا میرے کیوں راتے ہو مذاق یہ لہو رو نما بھی ہے آنکھوں کا حسن آفاق

لے لے مضمون کو مزا غالب میر جہدی قریح کے ایک خط میں اس طرح کہلے میری جہدی اصح کا وقت ہے جاڑا تو بڑ

ہے آنکھ میں سامنے رکھی ہوئی ہے دو حرف لکھتا ہوں آگ تاپتا جاتا ہوں آگ میں گرمی بھی مگر ہانے وہ آتش سال

کہ جب دو حرف لے لے فوٹارنگ پے میں دو رنگی دل تو نا ہو گیا۔

ہے شبِ بھراں کی تاریکی زیادہ دلوں کو شاق
 اُنک ٹوٹا ٹکھوں پہنے دو کہے شامِ فراق
 میں یہ سمجھوں گا کہ دو شمعیں فروزاں ہو گئیں
 بزم میں جو ہنسیں نہ رہے راتیں اسکی ہیں
 صبحِ نظارہ میں کر دیتا ہے راتیں اسکی ہیں
 اس بھی وہ خوشِ نظیب ہے راتیں اسکی ہیں
 نیند اس کی ہے دماغ اس کے راتیں اسکی ہیں
 تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
 کس غضب کا ہے یہ طوفاں خیز و نا آلا
 اس کی آنکھوں نے تو باندھا ابر بار کا سماں
 کر دیے اس نے بھی تمزاک کی طرح دریا رواں
 یوں ہی گرونا رہا غالب تو اے اہل جہاں
 دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

وخت ہے اور طاقتِ رفتار بھی نہیں
 دامنِ بقدرِ خلعتِ یکِ خار بھی نہیں
 ہمساجنوں زدہ کوئی نادار بھی نہیں
 دیوانگی سے دوشِ پزناں بھی نہیں
 یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں
 ہو کر غریبِ ورطہٴ ترماں ابھر چکے
 یہ یاں جیتے جی ہے تو سمجھو کہ مر چکے
 دن اپنے جب کہ شوقِ قہاں گزر چکے
 دل کو بنا زِ حسرت دیدار کر چکے
 دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں
 لے میں تجھ سے کرتے ہیں جو کسے راہ لے
 البتہ تجھ کو پا نہیں سکتے ہی سست پے

ممکن کبھی ہوئی نہیں کوئی محال شے ملنا تو اگر نہیں آساں تو سہل ہے

دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

میں اک نحیف و زار ہوں طاقت تو اس پر یہ دل کے ولولے پر شوقِ جاں تاں

حیرت یہ کہہ رہی ہے کہ اب جا بے کہاں بے عشقِ عمر کٹ نہیں سکتی ہے اویاں

طاقت بقدر لذتِ آزار بھی نہیں

سودائے سرے و پر اگندگی ہوشِ وحشت ابھارتی ہے کہ کرنا و خروش

شکر توں ہائے کس سے کھائے جنوں کا جوشِ شوریدگی کے ہاتھ سے سرے و بال دوش

صحرا میں لے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

دشمن ہی کچھ عناد کو سمجھا کریں شرفِ پھرنے بھی دو جو پھرتے ہیں رات و سحرک

لیکن ہمیں جو بغض ہو کچھ بھی تو لو حلفِ گنجائشِ عداوتِ اغیار یک طرف

یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

فریاد میں جو میں نے ہلا دی کبھی زبانِ قائم نہ پھر زمین رہے گی نہ آسمان

آساں میری آہ بہاں سوز کو نہ جانِ ڈرنا لہائے زار سے میرے خدا کو مان

آخر لوٹے مرغِ گرفتِ آزار بھی نہیں

ہے زخمِ زارِ سینہ کو پیالے سے روکشیِ زخمی جگر کو خنجرِ بڑاں سے روکشی

کرتا ہے اس کا تیر نظر جاں سے روکشیِ دل میں ہے یار کی صفِ ترگاں سے روکشی

تالا نہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

لیتے ہیں کام اداؤں سے آلاتِ حرب کا خنجر کی اور تیر کی حاجت نہیں ذرا
 کرتے ہیں خونِ خلق نہتے ہیں وہ تو کیا اس سادگی پر کون نہ مرجائے لے خدا
 لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں
 مرزا جو بادشاہ تھا اقلیمِ شعر کا جس کا ہے ملک نظم میں جھنڈا اگڑا ہوا
 فرزا نہ کوئی ہو گا یہ غالب گمان تھا دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا
 دیوانہ گر نہیں ہے تو ہوشیار بھی نہیں

۶۴

رفوگر کس طرح شک ہو بھلائی سے ٹہری پن میں کہ بیٹھا ہے رفوگر نے مرے زخموں کے دم میں
 سمجھ لیتا جو ہوتی تھکو کچھ بھی آنکھ اس فن میں نہیں ہزخم کوئی بخینے کے درخور مرے تن میں
 ہوا ہے ناراض نیک یاس رشتہ چشمِ سوزن میں
 دمِ نظارہ دیوار و درہوں وقفِ جبرانی کہ اچھا رنگ لائی اشکِ چشمِ ترکی طغیانی
 ان آنکھوں کی بدولت پھر گیا امید پر پانی ہوئی ہے مانعِ ذوق تماشا خانہ ویرانی
 کھنسا سیلاب باقی ہے بزرگِ پنبہ روزن میں
 کبھی ابرو کے سرِ صدقے میں فقیہِ بزل ہوں کبھی زخمی نگا ہوں کجِ راحتِ خوارِ پیکال ہوں
 و نورِ سوزن سے جلوہ گاہِ داغِ پہنان ہوں و دلِ بیتِ خانہ بیدار کاوشِ شہائے شرمال ہوں
 نیگین نام شاہد ہے مرا ہر قطرہِ خوں تن میں

نہ چھوکیا بلا ہے تیرگی شہائے بحراں کی چمک فتنے کی ہے اس میں فیا ہر دشتاں کی
سیاری مات ہے بختِ سیر کی فرد عصیان کی بیاں کس سے غفلت گستری میرے شہستاں کی

شب مر ہو جو رکھ دیں پندہ بواروں کے روزں میں
ہنسی یاروں کیا کی اک نصیحت جھکو فرمائی ناب وہ جوشِ وحشت ہے نہ فرطِ ناسکِ بانی
سکوں سا ہو گیا دل کو گیا سامانِ رسوائی نکو ہش مانع بے ربطی شورِ جنوں آئی

ہوا ہے خندہ احبابِ بخیمہ جیبِ ودامن میں
نہے تقدیرِ آئینہ کر یہ ہوسائے اس کے کہاں پیدا دیا شانِ خدا اس کے مقدسے
یہ حیرت ہے فیا پائی ہے کیا اسکی کجی سے ہوئے اس جہر و ش کے جلوہ مثال کے آگے
پراشتال جو ہر آئینہ میں مثلِ درہ روزں میں

کروں کیا ہمتیہوں سے مری حالتِ خالفتے مرا مذہبِ جدا سب مری ملتِ مخالف ہے
مجھے ڈالا ہے نا جیسوں میں کیا سمتِ خالفتے نہ عالوں نیکوں یا بدہوں پر محبتِ مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلِ سخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلِ سخن میں

مقامِ سکوہ کیا ہے درد اگر اکھٹوں جھکو ذریعے بھی بخشے درد کی برداشت کے مجھ کو
سکرو و ش نہ ہوگی اس کے آستانے جھکو ہزاروں دل دیئے جوشِ جنوں عشق نے مجھ کو

سیر ہو کر سویلا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں
خیالِ گیسوئے پرہیز میں پابندِ حولاں ہوں بتوئے دامِ کیمیا ہوں اک سیرِ حاسماں ہوں
اد پرانی مزار کی طرح کیونکر نہ قرباں ہوں آسہ زندانِ تاثیرِ الفت ہائے خواہاں ہوں
حمِ دشتِ نوازش ہو گیا ہے طوقِ گردن میں

طمانیتِ دلِ اربابِ زریں خاک نہیں خیالِ زر کے سوا اور میں خاک نہیں
چٹو رہی ہے یہاں اور گھر میں خاک نہیں مرنے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خونِ جگر سو جگر میں خاک نہیں

محال ہے کہ وہاں نجاتِ نارِ سالے جائے کوئی اٹھا کے چین تک قفسِ مرا لجاوے
غرض ہے کیا اسے صیاد کی بلا لے جائے مگر غبارِ ہونے پر ہوا اڑ لے جائے
وگرنہ تاب توں بال و پر میں خاک نہیں

ہوئے ہیں فرشِ زمیں گل بہار بے حد ہے کفرِ ادب سے سر راہِ مردِ خوش قد ہے
وجودِ عرضِ مرکبِ گلوں سے شاید ہے یہ کس بہشتِ شمائل کی آمد آمد ہے
کہ غیرِ جلوہ گل رہ گزر میں حناک نہیں

تو فکرِ دل مجھے ہوتی تو یوں نہ گھل جاتا سنبھالتا کسی صورت سے اس کو بھلاتا
مجھے ہی جب نہیں پر وا وہ کیوں نہ کھانا بھلا اسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا
اثرِ مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں

کیا خدا نے نہ مجھ کو کسی سے شرمندہ ہوا کسی کی نہ منت کشی سے شرمندہ
نہیں ہر کچھ بھی تو ہوں اپنے جی سے شرمندہ ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیرِ گھر میں خاک نہیں

مدام طالبِ حسن المآب ہیں مے کش کسی کی یاد میں بلے ارتباب میں مے کش
زمانہ کہتا ہے مست شراب ہیں مے کش خیال جلوہ گل سے خراب ہیں مے کش

شراب خانہ کی دیوار و در میں خاک نہیں

جو دیکھتے ہیں مضامین تازہ کی آمد مذاق اڑاتے ہیں مرزا تمام اہل حسد
کہا جب ہی تو یہ غالب نے ہو کے دقِ بچید ہمارے شعر ہیں اب صفِ دل لگی کے اسد
کھلا کہ فائدہ عرض ہنریں خاک نہیں

۶۶

ہم سے نہ کہتے بار بار کہتے ہو جائے کیوں اپنے ہی دل کو چھپے زخم جگر دکھائے کیوں
فرطالم سے خونِ دل اشک میں بہہ جائے کیوں دل ہی تو ہو رہے سنگ و خشت در سے بھر جائے کیوں

روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

اس میں کسی کو فعل کیا ملکِ مد نہیں زمین سر پہ اٹھائے ہم اسے تو نہ جائیگے کہیں
اپنا نشانِ مٹائیں گے صورتِ نقشبندیہیں دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستان نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر رہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

چشمِ بشر میں ہو اگر حسرتِ ہر نیم روز دیکھ سکے نہ بھر کے جی طلعتِ ہر نیم روز
تاب کہاں کہ ہو اسے رویتِ ہر نیم روز جب وہ جلالِ دلفروز صورتِ ہر نیم روز

آپ ہی ہوں نظارہ سوز پرے میں منہ چھپائے کیوں

خوف سے سیسے روبرو انہیں سکتے نہروا
 انکو کہاں یہ تاب ہے دیکھیں جوتیری جلوہ گاہ
 دشنہ غمرہ جاں ستاں ناوک نانابے پناہ
 سکتے ہو آئینہ کو بھی ڈال دے تو اگر نگاہ
 تیرا ہی عکس رخ سہی سائے تیرے آئے کیوں

دہر میں شادی و الم اصل میں نول یک ہیں
 زندگی و محن ہم اصل میں و نول یک ہیں
 قید حیات و بند غم اصل میں و نول یک ہیں
 قطرہ آب آب ہم اصل میں و نول یک ہیں
 موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اُف اے عرو کا سادہ پن گئی بواہوس کی شرم
 باندہ کر آیا تھا کفن رہ گئی بواہوس کی شرم
 ٹال گیا وہ تیغ زن رہ گئی بواہوس کی شرم
 حسن اور اس چہرے میں ظن رہ گئی بواہوس کی شرم
 اپنے پر اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

ہمکو یہ جن کہ چھٹ بجائے راہ صواب پاس وضع
 اسکو یہ ضدادھر سے ہو کچھ تو جواب پاس وضع
 مانع رکھ و راہ ہے خوف خراب پاس وضع
 واں وہ غور عز و ناریاں یہ جواب پاس وضع
 راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلکے کیوں

میں ہوں تلاش یار میں کہتے ہو جس کو گم رہی
 بک نہ لگاؤ ہمدموں تم نے یہ بات کیا کہی
 اسکی جفا و جہر سے مجھ کو ہے خوب آگہی
 ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بیوفا ہی
 جسکو ہو جان و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں

کم ہوئی مے کشی نہ کچھ دورِ رام بند ہیں
 بزم سے اٹھ گئے بسویا کہیں جام بند ہیں
 عیش و خوشی سے میرزا خاص نہ عام بند ہیں
 غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
 روئے زار زار کیا سمجھئے ہائے ہائے کیوں

تو نے اشک سے مجھے کیا یہ بتا دیا کہ یوں صاف جواب دے مجھے میرے سوال کا کہ یوں
چپ سے چپے کا کام کیا اب تو ذرا ہلکا کر یوں غنچہ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کر یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

غمزہ جو اس کا دیکھ لے سینے میں پھر نہ دل ہے تار و کرشمہ دیکھ کر ہوش اڑ رہا ہے
تیغ نگہ اگر چلے ہو کے لہو جگر ہے پریش طرز دہری کیجئے کیا کہ بن کہے
اسکے ہر اک اشارہ سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

ہم و امید میں ہے کیا کہیں کس طرح جئے حسرت و یاس میں غرض مگر کے دن گنوا دیئے
ہاتھ اٹھا اٹھلکے ہم دل سے دعا کیا کئے رات کے وقت ہے ساتھ قریب کو لے
اے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

لی ہیں جگر میں چشکیاں طور جفا تو دیکھئے فہ کو جواب کیا دیا طرز ادا تو دیکھئے
کیسا حجاب اٹھا دیا شرو جفا تو دیکھئے غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھئے
سلمانے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

سکتے میں خاص عام ہیں عجب خیال یا رے ہونٹ سینے بھٹے سے ہیں آج تو اہل بزم کے
حکم سکوت بھی ہیں گو نہ دیا ہوشو نے بزم میں اس کے روبرو کیوں نہ خوش بیٹھئے
اس کی تو خاموشی میں بھی ہے مدعا کہ یوں

کیا کہیں بزم یار میں بات ہی کچھ بگڑ گئی مفت میں ہو گیا مرن نہ نظر تھی دل لگی
دیر تک ہنسی رہی بات بن آئی غیر کی میں نے کہا کہ بزم ناز چاہئے غیر سے تھی

سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں
اسکو دکھاؤ عشق کا ہوش و خروش کس طرح لائے زباں پہ حال دل شمع خموش کس طرح
شوق وہوس کریں یہاں دیدہ و گوشت کس طرح مجھ سے کہا جو یانے جاتے ہیں ہوش کس طرح
دیکھ کے میری بچو دی چلنے لگی ہوا کہ یوں

آمد و شد وہاں جو غمی طبع اسی میں شاد تھی تا دیر بار ہو گئے رد کی یہی مراد تھی
خاک میں بھی اگر ملا خاک بھی وقف یاد تھی کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
آئینہ دار بن گئی جہرِ نقش پاک یوں

عشق میں صدق ہو اگر اسکا مال ہے وصال جزو جو کل سے جاملہ ہو گیا ایک ان کا حال
وہ سکون و اتحاد کیوں نہ ہو پھر یہ اتصال گر تے دلیں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال

موج مجب آب میں مائے ہست و پاک یوں
یوں تو ہیں ہند میں بہت فن سخن کے مدعی ہیں یہ جدا ہی بند شبن طرز اداسے اور ہی
حق تو یہی ہے میرا ختم ہوئی سخنوری جو یہ کہے کہ رختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی
گفتہ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

ردیف (و)

(۶۸)

کچھ بات ہو بطر زمامت ہی کیوں نہ ہو عزت ہے ہم کو خواہ اہانت ہی کیوں نہ ہو
کچھ رکھئے ہم سے دیں کدورت ہی کیوں نہ ہو وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیئے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

ممکن نہیں ہے دل میں گزرا بساط کا دل میں وہ شوق و ذوق کہاں ارتباط کا
اب وہ نہ میں رہا نہ زمانہ نشاط کا چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگا اختلاط کا
ہے دل پر بار نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

آزادگی کا اپنی مجھے مل گیا صلہ ٹوٹا ہے النجائے اعانت کا سلسلہ
شکوہ کسی کا ہے نہ کسی کا مجھے گلہ ڈالا نہ بے کسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو

لیں چٹکیاں جگر میں جو مجھ سے کبھی ملا چھوڑا ہمیشہ شکوہ دشمن کا سلسلا
کی بات بھی تو وہ کر دیا جس گول ہلا ہے مجھ کو تجھ سے تذکرہ غیر کا گلا
ہر چند برسبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

یکسوئی ہو بشر کو میسر یہ ہے حال اس کیلئے غلوت و غلبوت کا ایک حال

تنہا بھی ہوتا نفس سے ریتی پر قیل وقال ہے آدمی بجائے خود اک محتر خیال

ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

ہم انقلاب سے متاثر ہوں کیا مجال ہرگز نہ لیں ہزار سبق دے جہاں کا حال

وارستگی میں رتبہ وغیرت کا رکھ خیال ہنگامہ زربونی ہمت ہے انفعال

حاصل نہ کیجئے دہرے عبرت ہی کیوں نہ ہو

آزادگی جہان سے فزائگی نہیں کیا رم ہے اور چیز جو دیوانگی نہیں

دنیا سے بھاگنا کوئی مردانگی نہیں وارستگی بہانہ بے گانگی نہیں

اپنے سے کرنے غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو

رکھتا ہے شاہراہ فنا میں قدم کوئی ہوتا ہے محو دل سے خیالِ عدم کوئی

اس فکرِ جاں گداز سے چھٹتے ہیں ہم کوئی ملتے فوت و صفت، ہستی کا غم کوئی

عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو

کرتے پھر یں رقیب چناں و چنیں آسہ جاتے ہیں اسکے کوچے سے مرزا کہیں آسہ

دیکھیں گے آپ قبر ہماری وہیں آسہ اس فتنہ نو کے دے اب اٹھتے نہیں آسہ

اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

ستایا تو نہیں میں نے کسی مرغِ نوازن کو مجھے یوں دیکھتے ہیں جیسے دیکھیں اپنے دشمن کو

فغان کرتا ہوں میں جب یاد کرتا ہوں نشین کو قفس میں گرا چاہی جانیں میسے شیون کو

مرا ہونا برا کیا ہے تو اسنجان گلشن کو
یہ ماننا غیر صورت اشنا اس کا نہ حرم ہے مگر یہ روسیہ اس کے تجس میں تو ہر دم ہے
وجودِ غیر جب تک ہے تو مجھ کو کچھ نہ کچھ غم ہے نہیں مگر ہمدی آساں ہو یہ شک کیا کم ہے
ندی ہوتی خدایا آرزوے دوست دشمن کو

بھرا یا بجیرہ گردل بھی ظالم میہی حالت پر انڑوالا نہ اس منظر نے بھی تیری طبیعت پر
ہنسی آتی ہے مجھ کو تیرے دوائے رغبت پر نہ دکھلا آنکھ سے تیری اک نسواں ہر اہت پر
کیا سینے میں جسے خونچکاں مڑکاں سوزن کو

ہوئی ہے کیا بلا دیوانگی عشق پر یوش میں کیا لائے سکوں مطلق تہیں قلبِ شوش میں
جنوں کی حرکتیں قائم ہو گئیں حالتِ خش میں خدا شرمائے ہاتھوں کو کرکتے ہیں کشتاں میں
مُسبھی میرے گریہاں کو کبھی جاناں کے دامن کو

ہم اپنا غرقِ خوں ہونا بجا آساں سمجھتے ہیں رواں ہونے لگے پر تیغ کا آساں سمجھتے ہیں
دکھنا جانبِ مقتلِ ترا آساں سمجھتے ہیں ابھی ہم قتل گاہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شننا و جوئے خوں میں تیرے توسن کو

رہا دستور آہن سے سناں و تیر بنے کا ہمیشہ مادہ اس میں رہا شمشیر بنے کا
زمانہ اب ہے اس کے لائق تو قبر بنے کا ہوا چرچا جو ہرے پاؤں کی زنجیر بنے کا
کیا بیتاب کال میں جنبشِ جوہر ہے آہن کو

مجھے کیا ہیں سے ہرگز گھبے یا گھر کے کھل جائے
 دُر خوش آب پانی کی جگہ یا روز برسائے
 سینہ سختی سمجھتا ہوں اگر کالی گھٹا چھائے
 خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ارائے
 سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برقِ خرمن کو

زہے قسمت کہ اسکے سامنے مثالِ جاناں ہے
 بتوں کو جان کر سگانِ کعبہ دل و قرباں ہے
 اگر دیکھیں حقیقت میں تو وہ بکا سیمال ہے
 وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
 مرے بت خانہ میں نو کبے میں گاڑو برہمن کو

پھر اب اس بکفِ شوقِ اجل نے چار سو مجھ کو
 لے پھرتی تھی در در جاں دہی کی آرزو مجھ کو
 رہی جلا دہی کی زندگی بھر جستجو مجھ کو
 شہادتِ تھی مری قسمت میں جو دی تھی خود مجھ کو
 جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

جو ہونا مالِ میٹھی نبیند کیونکر خاک پر سوتا
 زرو گوہر کے ہونے کس طرح ٹھنڈے بگر سوتا
 متاعِ رفتہ رہ جاتی تو پھر کیا بے خطر سوتا
 نہ لٹتا دن کو تو کب ات کو یوں بے خبر سوتا
 رہا کھٹکا نہ چوری کا دغا دیتا ہوں رہن کو

مضامین کے خزینے ہستے ہیں سینے میں شاعر کے
 تزیینہ دار و مالک ہیں سمنور ان ذخائر کے
 گہر کی قدر کیا ہے سامنے الفاظِ نادر کے
 سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں بجا ہر کے
 جگر گیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جاکے معدن کو

دراقدس کا اک زبان ہے فقور چیں غالب
 سکند کو بے خراسان بوسی ہیں غالب
 اسی دروازہ پر کھتا ہے مرزا بھی جیں غالب
 مرے شاہِ سلیمان جاہ سے نسبت نہیں غالب
 فریبوں و جمل و بخت و دربار و بہن کو

سکرسانی سن ہوئے اس خستہ تن کے پانو
جاتا کہاں کہ ہو گئے ایک ایک من کے پانو
کیا جانتا تھا وہ نہیں جھوٹے سخن کے پانو
دی سادگی سے جان پڑوں کو یکن کے پانو
بیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو

جی میں ہے پوجئے بت نازک بدن کے پانو
جیسے بھاری پوجتے ہیں برہمن کے پانو
ہاتھ آئیں کس طرح گراس پرفتن کے پانو
دھوتا ہوں میں تو پیئے کو اس سیم تن کے پانو
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو

کہتے تھے اپنے نفس کو ہم نازیب یہہ
بچتے تھے اس کے سایہ سے گویا بلا ہے یہہ
اتارہ اب ہمارے لئے ہو گیا ہے یہہ
بھاگے تھے ہم بہت سوا ب اکلی نزل ہے یہہ
ہو کر اسیر داتے ہیں راہ سزن کے پانو

سارا بدن ہے فرط جراثیم سے چورچو
عاجز ہوں دواؤ دوش سے تو کیا قصور
جراح کچھ علاج تو ان کا بھی کر ضرور
مریم کی جستجو میں پھرا ہوں بخود دور دور
تن سے سوا فکار ہیں اس خستہ تن کے پانو

مدچاک لے صورتِ مدبر بچار بگ
محکمیں تھانہ کچھ بھی غم برقع و تگرگ
پھر ہو چلا ہے قبر میں وحشت کا ساز و برگ
اللہ کے ذوقِ دشتِ نور دی کہ بعد مرگ
ہٹتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانو

گلاب کی شاخ شاخ ہوئی جام گل بکھ ہیں قمریوں کی تاک میں سب ہر وصف نصیب
 کس کس کی جان دیکھے امسال ہوتلف بے خوشی گل بہار میں یاں تنگ ہر طرف
 اڑتے ہوئے اچھتے ہیں مرغِ چمن کے پائو
 ناز و نزاکت ایسی بھی دیکھی سنی نہیں رفتار کے خیال سے تعلق ہے وہ حسیں
 ظاہر ہیں سب تکان کے آثارِ ہم نشین شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
 دکتے ہیں آج اس بیتِ نازک بدن کے پائو
 ایسا سخن شناس تو شاید سنا نہ ہو بڑھ کر سخن ظفر کا جلوب چاٹنا نہ ہو
 مرزا یقین کیوں مجھے اس قول کا نہ ہو غالب مرے کلام میں کیوں کر مرزا نہ ہو
 بیٹا ہوں دھوکے خمر و شیریں سخن کے پائو

یہ قدم رنجِ پاک کیا کوئی کم ہے ہم کو ان کا لانا ہی سرِ بزمِ کرم ہے ہم کو
 خاکِ بوسی کا عجب شوقِ تم ہے ہم کو واں پہر پہنچ کر جو غش آتا ہے ہم کو
 صدر آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو
 سر میں سودا ہے چمن ہے نہ ہواے گلشن تیرے در سے ہے ہمیں پائو اٹھانا بھی کٹھن
 لاغری وہ ہے کہ اک بال ہیں گویا ہر تن ضعف سے نقش پئے مور ہے طوقِ گردن
 تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ دم ہے ہم کو

آج ہمدرد زمانے میں کہاں پیدا ہے
ایک کا ایک کو ہو درد تو بے جا کیا ہے
غم سے جو واسطہ میرا ہے وہی دل کا ہے
دل کو میں اور مجھے دل نحو و فار کھتا ہے
کس قدر ذوق گرفتاری ہم ہے ہم کو

وائے غفلت کہ نہیں اتنی خبر بھی اب تو
سامنے کون ہے اور آپ نے دیکھا کس کو
ہم سے اب یہ وہ دانستہ ہو غماض ہو جو
جان کر کیجئے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو
یہ نگاہ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

رہنے دیں دوست اسی طرح ہیں گوشہ نشین
سیر گلزار سے دل اور بھی ہو گا غمگیں
کھائیے زخم جگر پر یہ ہمیں تاب نہیں
ریشک ہم طرحی و درد اثر بانگ حزیں
نالہ مرغ چمن تیغ دودم ہے ہم کو

صاف ظاہر ہے کہ وعدہ تھا مگر صاف نہ تھا
وقت اصرار کھلا آکے نتیجہ اس کا
ایسی قسموں کا بھروسہ ہمیں کیونکر ہوتا
سراڑانے کے جو وعدے کو مکر چاہا
بنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

بے سبب شک رواں کا تو نہیں باز رہتا
عین جو ہے یہ ان کا کہ ہوا آنکھیں خونبار
نہ ہو روئیں تو مرقاں پر کہاں سے بہا
دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ ولیکن ناچار

پاس بے رونقی دیدہ اہم ہے ہم کو
داخل شکوہ سمجھتے ہو جو خاموشی کو
کیا کریں چین کسی طرح نہ جب لینے دو
حال کیا ہو جو کبھی نالہ پُر درد سنو
تم وہ نازک کہ خموشی کو فضاں کہتے ہو

ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو
 عقل حیران ہے کس وجہ سے چوڑی دھلی
 کچھ تو ہے جس لئے طے کی ہے مسافت اتنی
 ایک بیک چوڑی کیوں لغت راحت گھر کی
 نکھٹو آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی
 ہوسیں سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
 جب چلے گھر سے تو تھی دلیس پہاں و دی لہر
 بیٹھ رہنا ہیں اور ترک سفر ہے اک قبر
 قصد ہے دور کا مانع جو نہ ہو گردش دہر
 مقطع سلسلہ شوق نہیں ہے برہنہ
 عزم سیرِ نجف و طوفِ کرم ہے ہم کو
 آپ کی طرح ہے مرزا بھی کرم کا طالب
 دل کھینچا جاتا ہے اربابِ کرم کی جانب
 وجہ نقل و حرکت کیا کہوں مرزا صاحب
 لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب
 جادہ رہ کر کشش کافِ کرم ہے ہم کو

۷۲

کیا قابلِ خطاب وہی روسیہ ہو
 مجھ پر نہ بھول کر بھی کرم کی نگاہ ہو
 چاہو اسی کو دل میں اگر اس کی چاہ ہو
 تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
 مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گتہ ہو

سے غالب صاحب نے نوابِ علاقائی کو ایک خط میں لکھا "اشعار تازہ مانگتے ہو کہاں سے لاؤں۔ عاشقانہ اشعار سے
 مجھ کو وہ بعد ہے جو ایمان سے کفر کو۔ گوشت کا بھٹا تھا بھی کرتا تھا فطرت پاتا تھا۔ فطرت موقوف ہوئی مزرع
 زغرل دمیر، ہزل و بجو میرا آئین نہیں پھر کہو کیا لکھوں۔ بوڑھے پہلوان کے سے پیچ تلنے کو (بانی ص ۳۱ پر)

الزام رکھ کے بغیر یہ کیا صاف ہو گئے گویا یہ خون ہی نہیں ذمہ جناب کے
 فرماتے ہو کہ قتل کیا تجھ کو غیر نے بچتے نہیں مواخذہ روز حشر سے
 قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

جس طرح قتل و خون میں جس بے ہراس ہیں کیا وہ بگلیوں ہی دشمن جانِ اناس ہیں
 کیا یوں ہی ان کے خیفہ بھی وقف میں ہیں کیا وہ بگلی بے گنہ کش حق ناشناس ہیں
 مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو

مخل تمام ثنویں تہا میں ہے بے قرار تنکے ہیں غیر بھی ٹھہر بد سے بار بار
 یہ رشک کس طے نہ رہے مجھ کو دل فگار ابھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار
 مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

رکتانہ میکرہ سے تو رکھتا جگہ کی قید آزاد کے لئے نہیں زہیبا جگہ کی قید
 وارستگی باہر ہے نوبے جا جگہ کی قید جب میکرہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
 مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خالقا ہ ہو

باقی ۲۹ کا - دیکھا ہوں اگر اطراف و جوانب سے استعارا جلتے میں اسٹار یا جلتے میں باور کرا اور مطابقی
 واقع سمجھتا تھا ہے، دیکھ کر دل بہت تپتا تھا ہے اور تما لامر قود، اس پر ہے کہ تم یہاں اور کاش اپنے والد اب کر کیا تھا
 چلے آئے اور مجھ کو دیکھنے کے لئے نہ مائل تو تم کو میرے جو رہا ہے۔ مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہے۔
 لئے حالانکہ اس تعریفی ترغیبوں کی کہ کس قدر سرد و خائفانہ مساوی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ میکرہ جہاں ولیفوں
 کے ساتھ مراد ہے کا اظہار ہے۔ وہی چھٹ گناہ سجدا و سجود اور خائفانہ میں بیٹھ کر لی لینی کوئی عار نہیں ہے
 ہے یعنی یہ مقامات اس تعریف کے بالکل لائق نہیں ہیں وہاں بھی میکرہ چھٹنے کے بعد یہی لیسے سے انکار نہیں ہے اور
 حجاب پہنے کی تصریح نہ کرنا میں مقتضائے ملاءمت ہے۔ مراد غالب شوخی برتے سے بھی نہیں چوکتے یعنی مسجود و مدرسہ
 اتناہ حالت عزت ہیں مگر عاتک صاحب ان سب کو مساوی سمجھ لیا ہے۔ ۱۲

ہر چیز باغِ فلد کی ہے منتخب درست تور و قصور و شہدانا روعنب درست
 مشہور ہے کہ ہے وہ مقامِ طربِ رست سنتے ہیں جو بہشت کی قلوبِ سب دست
 لیکن خدا کرے وہ ترا جلوہ گاہ ہو
 سونانہ ہو گا دیس اگر ہم نہ ہوں کہیں ذاتی نہ کوئی گھر ہے نہ گھر کی کہیں زمین
 مرزا وجود شاہ ہے رونقِ فنا دیں غالب بھی گرنہ ہو تو کچھ ایسا فر نہیں
 دنیا ہو یا رب اور مرابا شاہ ہو

۷۳

تمہیں نہ ضبط سے جب کام ہو تو کیونکر ہو تمہیں نہ فرصتِ تندرست ہو تو کیونکر ہو
 اب اس سے حضرت دل بات ہو تو کیونکر ہو گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو
 کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو
 حصولِ وصلت و دیدار تو ہے امرِ محال فقط ہے باعثِ تسکینِ تصورِ مثال
 امید و یاس کو سمجھا ہے آرزو کا مال ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
 کہ گرنہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو
 کبھی خیال کا اظہار مدعا کیجئے کبھی یہ وہم کہ ہرگز نہ یہ خطا کیجئے
 کہاں تک اپنے مقاصد کا التوا کیجئے ادب ہے اور یہی کش مکش تو کیا کیجئے
 حیا ہے اور یہی گو مگو تو کیونکر ہو

تمہارا دل ہے کر رشک و حسد کا بغینہ بھرا ہی رہتا ہے بغض و نفاق سے سینہ
یہاں تک اپنے مقابل سے ہے تمہیں کینہ الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

وہ رشکِ ہر رہا رات بھر تو جلوہ نما نمود ہونے نہ پائی سحر کہ چیل نکلا
مری نگاہ میں اندھیر کیوں نہ چھل جاتا جسے نصیب ہو روز سیاہ میل سا
وہ شخص دن نہ کہہ رات کو تو کیونکر ہو

یہ دُفِ طشقہ ہے ہم نے لوس پیا تو تم نے غایتِ نخت سے سر کو ٹھکرایا
نہ ترم کچھ تمہیں بندوں کی ہے زخوفِ خدا تمہیں کہو کہ گزارہ صنم پرستوں کا
ہتوں کی ہو جو تمہاری سی خو تو کیونکر ہو

کریں گے حضرت دل خاکِ تمہاری قد ہونی نہ کچھ بھی ہماری سوائے خواری قد
انہی کے ہوں وہاں ہم جہاں ہی ہماری قد ہمیں پھر ان سے امید اور انہیں ہماری قد
ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیونکر ہو

ہمیں تو آیہ قرآن تھا جو مضمونِ نفا بجا ہے ہم نے جو پڑھ کر کہا ہے آمنا
وفا ضرور کریں گے وہ وعدہ فردا غلام نہ تھا، ہمیں خط پر گسانِ تسلی کا
نہ مانے دیدہ دیدار جو تو کیونکر ہو

سکوں سے کام نہ لوں غطاب میں تو قصو مگر ہوں غبط میں اسِ خطر اسے مغزو
زمانہ بھر میں نہ مرزا سا پائے گا صبور مجھے جنوں نہیں غالب نے بقولِ حضو
فراقِ یار میں سکین ہو تو کیونکر ہو (لے ماشیہ ۳۳۱)

جوتاب مضطرب ہو اشک آنکھوں کوں کیوں ہو کس دل کی بیٹابی کا در پرہ بیاں کیوں ہو
جو ہو درویشنا تو شکوہ درد نہاں کیوں ہو کس کوئے کے دل کوئی نواسخ فغان کیوں ہو
نہ ہو جبل ہی پہلویں تو پھر نہ مٹی باں کیوں ہو

وہ ہر سلسلہ توڑیں تو تم کب تک سے جوڑیں رہیں ہم مجھ نظارہ کہاں تک جب منہ موڑیں
خفا وہ ہیں بس ہوں ہم ترستہ تنہا کیوں توڑیں وہ اپنی خورہ چھوڑینگے ہم اپنی صنم کیوں چھوڑیں
سبک دہنے کیا پوچھیں کہ ہم سے گر گراں کیوں ہو

چھپا رکھا تھا ہم نے اپنے دل میں راز الفت کو نہ کی اف ہر استقلال سے جمیلا ہر الفت کو

حاشیہ ۱۳۱ کا:۔ عرل اور نر کے ساتھ دلی کے اندوہنا میں جی بے غلغلو میں مشاۃ ہو اواس میں غزل غائب صاحبِ طبع نے نثر کیلئے طرزِ ہمیدہ بادشاہ ظفر داکر نے تجھے قطع میں غائب لے بادشاہ کے طوطی مصرع کو اس طرح نظم کیا ہے مجھ جنوں نہیں غائب لے بقول حفصہ:۔ "فراقِ یار میں سکیں ہو تو کیونکر ہو"۔

لے مرزا غائب نے غافل تہ کو نکھا کہ میں نے ان دلوں و غریبوں تکھی ہیں۔ ایک تو دیدار ہو مسودہ آپ کے پاس بھیج چکا ہوں۔ دوسری غزلِ زمان کیوں ہو گماں کیوں ہو اب بھیجتا ہوں۔ نیز دوسرے خط میں انھیں کو لکھا:۔

"تم سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ برابر کئی خطوں میں تم کو غم و اندوہ کا شکوہ گزار پایا ہے۔ پس اگر کسی بعد در پردہ آیا ہے تو شکایت کی گنجائش نہیں ہے بلکہ یہ غم تو نصیبِ دوستان و خورِ افراش ہے بقول غائب لے
کسی کوئے کے دل کوئی نواسخ فغان کیوں ہو نہ ہو جب دل ہی سے میں تو پھر مرنے کیوں ہو

ہے یہ شعر ہے

بہ فتہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے ہوئے تم دوست جس کے دشمن اسکا آسمان کیوں ہو

خبر کیا تھی ہمارے دردِ پہنائی کی خلقت کو کیا غمِ خوانے رسوائے آگ اس محبت کو
نہ لائے تاب جو غم کی وہ میرا زرداں کیوں ہو

نہ کرنے لے ہمیں وحشت میں سجدہ اپنی چوکت کا پہاڑوں تک کرے گارہری سودائے سراپنا
ہمیں ہے کچھ نہ کچھ تو چارہ جونِ جنوں کرنا وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر بھوڑنا ٹھہرا
تو پھلے سنگِ دل تیرا ہی سنگِ استال کیوں ہو

نکل و سرور یا حسین کا مفعول ذکر کر ہم دم کڑا دل کسے کسبِ حالات مجھ سے کہہ کر ہمد
یہ ہے پوچھنے پر تو نے تھا ماکوں بر ہمد قفس میں تھم سے رو دا دین کہتے نہ ڈر ہمد
گری ہے بس پہ کل بجلی وہ میرا تنیاں کیوں ہو

نظر بندی یہ کیسی ہے معا کیا ہے سمجھاؤ طبیعت کو عجب الجھن ہے اگتھی کو سلجھاؤ
اگر پردہ نہیں بد نظر تو سامنے آؤ یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں لیکن یہ بتلاؤ
اگر دل میں نہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

کچھ ایسا ہی ہر انسان کی طبیعت کا تعاضب ہے کہ یہ اپنی خطا کو غیر کے سر ڈال دیتا ہے
ہمیں ٹھہرے گنہگاروں میں یہ انصاف اچھا ہے غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو حرم کس کلبے
نہ جھینچو گرم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

یہ رُخ کا آئینہ دنیا کی حیرانی کو کیا کم ہے پریشاں رُخ عالم کی پریشانی کو کیا کم ہے
نگاہ تیز جانبا زوں کی قربانی کو کیا کم ہے یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جسکے دشمن اسکا آسمان کہیں ہو

عنایت تم نے کی جس پر اسی کا ناک میں دم ہے ہوئے غمخوار جس غمگیں کے تم وہ طبع غم ہے
تمہاری مہربانی میں بھی جلا دی کا عالم ہے یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جسکے دشمن اسکا اسمال کیوں ہو

مصیبت رشک کی ظلم عدو دن رات بہتے ہیں تمہاری مہربانی سے پریشان حال بہتے ہیں
ہنسی سوچی ہو تمکو اشک یا آنکھوں سے بہتے ہیں یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہوئے جب تم تو میرا امتحان کیوں ہو

ابھی آئے ابھی جاتے ہو جانا کس کو کہتے ہیں یہ آنا ہے تمہارا تو نہ آنا کس کو کہتے ہیں
کرم سمجھا ہے اس کو تو جلا نا کس کو کہتے ہیں یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہوئے جب تم تو میرا امتحان کیوں ہو

جو کہتا تھا بری ہے غیر کے گھر محفل آرائی تو ہنس کر مالتے تھے جھکو ٹھہرتے تھے سودائی
لگے اب بحث بھی کرنے جتا کر اپنی دانائی کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں سوائی
بجائے ہو سچ کہتے ہو پھر کہنا کہ ہاں کیوں ہو

چلا جادو و جب مرزا کا اسکے روبرو غالب کرے گی کیا اثر پھر خاک تیری گفتگو غالب
بر بزم اس ہے بے فائدہ کیوں جدو و غالب نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ نتجہ پر مہرباں کیوں ہو

رولف (بی)

(۷۵)

سب ریتوں کے ساتھ مراعات چاہیے آپس میں اتحاد ہو وہ بات چاہیے
 رندی و زاہدی میں مساوات چاہیے مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے
 بھوں پاس آنکھ قبلہ حاجات چاہیے

رُخ کے قریب زلف کی ظلمات چاہیے دن سے ملی جلی ہوئی یہ رات چاہیے
 ہرنے کا اس کی ضد ہی سے اثبات چاہیے مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے
 بھوں پاس آنکھ قبلہ حاجات چاہیے

مصروف آپ مشق جفا میں نئے عمر بھر مطلق نہ تھی کسی دل مظلوم کی خبر
 بیٹھے ہیں اب تو ہاتھوں تلے ہوئے جگر عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک شخص پر
 آخر تم کی کچھ تو مکافات چاہیے

جرات تو دیکھ اس دل کو تاہ دست کی اس نامراد نے کبھی ہمت نہ پست کی
 اب غم ہے نیست کا نہ خوشی اس کو ہست کی وہ داد اے فلک دلِ حُسن پرست کی
 ہاں کچھ نہ کچھ تلافی مافات چاہیے

صورت کو ان کی روح جب اپنی ترس گئی تدبیر کار گر نہ ہوئی کوئی دید کی

اس سے زیادہ شکلِ رسائی کوئی نہ تھی سیکھے ہیں مہرِ فوں کے لئے ہم مصدقہ

تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے

یہ لوٹتا ہے ثروت و اقبال و جاہ کو کرتا ہوں غافل اس سے دلِ عیش خواہ کو

سمجھا نہیں ثواب کبھی اس گناہ کو سے سے غرض نشاط ہے کس رویا کو

اک گونہ بخودی مجھے دن رات چاہیئے

بے کار شے ہیں ہم وہ محرک اگر نہ ہو ق مژرا یہ راز وہ ہے جو پاتے ہیں راز جو

ہستی کا سب ظہور عدم سے ہے جان لو نشو و نما ہے اصل سے غالبِ فرغ کو

غاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیئے

ہر باغ کی ہے باغِ جہاں میں فضا جدا ہر گلستاں نے پائی ہے آبِ ہوا جدا

ہر گل کی بو جدا ہے روش اور ادا جدا ہے رنگ لار و گل و نسیم جدا جدا

نہرِ رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے

سر میں اگر خودی ہے نہ نام بے خودی خود میں ہے تو نہ کر ہو سِ خام بے خودی

کر سجدہ شکر کا جو طے جام بے خودی سر پہ ہے خم پر چاہیئے ہنگام بے خودی

رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیئے

قائم ہو ایک حال پر کس طرح آدمی کرنی ہے راہ طے اسے جذبِ سلوک کی

ہر فعل کی ہے حالتِ موجودہ مقتضی سر پہ ہے خم پر چاہیئے ہنگام بے خودی

رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیئے

خالی نہ ہو حقیقت عرفاں سے کوئی بات انسان حرف حرف سے پیدا کرے نکات
 نظارہ صفات سے ہو جائے خود ذات یعنی بحسب گردشِ پیمانہ صفات
 عارف ہمیشہ مست ہے ذات چاہیئے

۷۶

ذرا سی جان تن میں، فدا کرنے کو ہوں وہ بھی رگوں میں جو ہو تھا ہے سرشک لالہ رگوں وہ بھی
 جگر رکھتا تھا لیکن بہا با حالِ زبوں وہ بھی بساطِ تجزیں تھا ایک ل اک قطرہ خوں وہ بھی
 سورتا ہے باندا ز چکیدن سمرگوں وہ بھی

یہ کیا کم مہربانی ہے کہ ٹالابات کو اس نے وگرنہ مفت میں لینے کے دینے پڑ گئے ہوتے
 خدا نا خواستہ دل سے نہ وہ روٹھنا نہ ہم روٹھے ہے اس شہر سے آزر دہ ہم چندے تکلف سے
 تکلف بر طرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

نکالے کوئے ارمانِ دل آخر مقدر نے کہ ہم ہوں منتظرِ پیکِ اجل کی آمد آمد کے
 طبیعت کو ذرا الجھاؤ سہاے اس تصور سے خیال مرگ کیا نسکیں دل آزر دہ کو بخشے
 مے دامِ تنہا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

سرشکِ خوں بہانے سے تو تھا یہ دعا ہم دم کہ دل کی آگ اس پانی سے کم ہو گی ذرا ہم دم
 مگر اس سے تو سوزِ قلبِ دونا ہو گیا ہم دم نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہم دم
 کہ ہو گا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی

بجائے زور بازو پر جہاں تک اپنے اتراؤ
کرو تعریف اپنی سرخرو اس کو نہ ٹھہراؤ
میر مقتل زیادہ اس کے جوہر کو نہ چمکاؤ
نہ اتنا برش تیغ جہنسا پر ناز فرماؤ

مے دریائے بیتابی میں ہر اک موج خوں وہ بھی

توقع کیا سوال اس سے اگر اک دور کا کیجئے
مناسب ہے کہ اشک حسرت و ارباں پیال کیجئے
سبھو خالی دکھا تپا ہے جو عرض مدعا کیجئے
سے عشرت کی خواہش ساقی گڑوں پر کیا کیجئے

لئے بیٹھا ہے اک دو چار جام واز گوں وہ بھی

امید و بیم میں مرزا ہو را کہ مدت کو سرگرداں
نہیں بننے میں تا اس سے ملے کا کوئی سامان
کسی صورت پر شکل دیکھئے ہوتی بھی ہر آساں
مے دولیں ہو غالب شوق وصل شکوہ ہجر اہل
خلا وہ دن کہے جو اس سو میں یہ بھی کہوں وہ بھی

نکالے گی نہ چکر سے ہیں گردش زمانے کی
یہ گردش حقیقت بھی ہر نہایت دل لگانے کی
زین پر لب کوئی صورت نہیں آرام پانے کی
غم دنیا سے گری پائی بھی فرصت ہر ٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

اسے اپنی پیش کا حال کچھ کہہ تو دیا یارب
مگر خط کو مہر ہوہ ٹھہ بھی لے امیر کیا یارب
جلا ہی دے کہ سوز دل تو ظاہر ہو ذرا یارب
کھلے گا کس طرح مضمون مے مکتوب کیا یارب
قسم کھائی ہے اس کا فتنے کا خد کے ہلائے کی

اگر ہے آہ آتشبار نالہ آتش افشاں ہے نہیں چارہ کہ عالم آتشکارا زہر نہیں ہے
دباؤں یہ دیکھتی آگ کو نکر عقل حیراں ہے لیٹنا پر نیوں میں شعلہ آتش کا آساں ہے
دے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

کوئی بے کار ان کا جانب گلزار جانا تھا گلستاں کو مگر اس رنگ سے مقتل بنانا تھا
گلوں کو بھی نوپنے زخم خوردوں بلانا تھا انھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا
اٹھے تھے بیر گل کو دیکھنا شوخی مہمان کی

مقدر ہی میں تھا کچھ نتیجہ سے افسوں ساز پر مرنا بد انجامی تھی اپنی خوبی آغا زہر مرنا
مناسب تو نہ تھا اس ظاہری انداز پر مرنا ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا
نرا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

غم دور اس کے شکووں حقیقت کش گئی اپنی طبیعت کی وہ قوت اور وہ جولانی غلط گئی
حسینوں کی اٹھائے بات کس کو تباہ اتنی لکڑ کو بے حواوت کا تحمل کر نہیں سکتی
مہرِ طاقت کے ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

رہنے میں نہیں سچی محبت کا نشاں غالب جنہیں کہتے ہیں فیضِ شربت اب میں کہا غالب
بیانِ حال میں قاصر ہوتا زکا زباں غالب کہوں کیا خوبی اوضاعِ ابتداء زماں غالب
بدی کی اسنے جس سے ہنسنے کی تھی یار ہائے سبکی

زنداں سے بھی زیادہ برا یہ مکان ہے اک قبیہ میں پڑے ہیں معیبت میں جان ہے
یہاں فقط خیال میں کائنات ہے کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضہ مور آسمان ہے

سیارے گھومتے ہیں فلک پر کیسے لئے اسباب اور کچھ بھی نہیں ان کی سیر کے
چکر دیئے ہیں چرخ کو تیری تلاش نے ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

بے چارہ دل حوادثِ دنیا سے بہ تنگ ہو کیوں نہ چور چور کہ کھایا ہے سخت سنگ
اس سنگ ن کے وہم سے ہو میری عقل دنگ حالانکہ ہے یہ سیلی خارا سے لارنگ
غافل کو میرے شیشے پر سے کاگان ہے

اپنا تو دل تھا آگ سے گویا بھرا ہوا کرتا قیام پھر وہ اس آتش کدے میں کیا
غالی تھا سوزِ عشق سے ہاں ل قییب کا کی اس نے گرم سینہ اہل ہوس میں جا
آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

کچھ بات جھک کے کان میں کہنا بہانہ تھا آخر کوئی سبب بھی تھا دامن کی آڑ کا
اب تم دھڑائی سے تو نہ جھٹلاؤ بڑلا کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

آنکھیں لگی ہیں جانبِ درِ انتظار میں تصویرِ سنا محوش ہے شوقِ نگار میں
آیا ہے گشتِ کر کے ابھی غارِ زار میں بیٹھا ہے جو کہ سایہِ دیوارِ یار میں

فرماںِ روائے کشورِ ہندوستان ہے

غم نے لہوِ پلائے کا اچھا صلا دیا اک داغِ جاں گدازِ جگر پر لگا دیا
اس داغ نے تمامِ جگر کو جلا دیا ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کس سے کہوں کہ داغِ جگر کا نشان ہے

اس پر جو ڈالتے نہیں وہ قہری نظر ظاہر ہوا نہیں ہے بھروسہِ رقیب پر
مڑنا کا بختِ برسرِ یاری ہے سرِ بر سر ہے بارے اعتمادِ وفاداری اس قدر
غائب ہم اس میں خوش ہیں کہ ناہر بان ہے



یا تو میں کرتا تھا غم سے آہِ وزاری ہائے اور تو کرتا تھا کچھ غمِ گساری ہائے ہائے
یادِ دمِ آخرِ جفا کی شرطِ یاری ہائے درختِ میٹھے تھے کوبےِ قارنی ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری نفقتِ شعاری ہائے

دل کا دل ہی میں رہا کچھ بھی نہ نکلا حوصلہ پست ثابت ہو گیا الفت میں تیرا حوصلہ
منہ چھپا یا مجھ سے بس اتنا کہ مالِ حوصلہ تیرے دل میں گرتا تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے بھر کیوں کی تھی میری غمِ گساری ہائے

عہد تجھ سے زندگی بھر کے لئے تو لیا کیا خبر تھی زندگی نکلے گی تیری بے وفا
 سامنے آیا مری تقدیر کا کھٹا ہوا عمر بھر کا تو نے پیمان وفا باندھا تو کیا
 عمر کو بھی تو نہیں تھی پاداری ہائے

اٹھ چکے ہیں جب کہ سامان بقائے زندگی ہو پھر اس سے کیا خوشی کیا دل کو بھائے زندگی
 کون مر کر جسے چوتھے میں جلے زندگی زہر نگتی ہے مجھے اب وہوائے زندگی
 یعنی تجھ سے تھی اسے ناساز گاری ہائے

ناز کی سے یاد کتنا تھا تر از رخ پھول سا صورتِ برگِ خزاں یا اب ہے مرجھا یا ہوا
 کس ہونے لے گلِ تر تجھ کو پتہ مردہ کیا گلِ فشانے ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا
 خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے

تجھ کو رہنا تھا ہمارے دیدہ نمناک میں یا مناسب تھا بنانا گھر دل صد چاک میں
 خوشبختن داری سے تیری آگیا دمِ ناک میں شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
 ختم ہے الفت کی تجھ پر پڑہ داری ہائے ہائے

کامیابی اب کہاں ہے بات ہی اے دل گئی وہ بہارِ عاشقی وہ رونقِ محفل گئی
 عہد لینے کی وہ ساری سچی لا حاصل گئی خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی
 اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے

منہ چھپا یا خاک میں کیوں آخر کیا خیال کیا کسی پر ہو گیا ظاہر تے دل کا خیال
 جب کہ رسوائی کا تھا ظالم تجھے اتنا خیال کیوں مری غمخواری کا تجھ کو اتنا خیال

دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے

اوپرے اوچھے وار جب اس نے لگائے بار بار
دکھ گئی نازک کلائی اور بازو شل ہوا
پھر بھلا کس طرح نکلے اپنے دل کا مدعا
ہاتھ ہی تیغ آنا کا کام سے جاتا رہا

دل پر رک گئے نہ پایا زخم کاری ہائے ہائے

کر دیا ہے بے طرح رنج و الم نے خستہ دل
موت کا آنا کٹھن ہے اور جینا ہے وبال
مج کرنا شام کا وقت زندہ کو ہے محال
کس طرح کاٹے کوئی شہائے تارِ نیرنگال

ہے نظر نو کردہ اختر شماری ہائے ہائے

کون ہے اب سینے والا کس کہنے ایسا حال
دور کیجئے کس کی صورت کچھ کر دل کا ملال
کوئی دیکھے تو مری حیراں نصیبی کا کمال
گوشِ غم و مہمِ پیام و چشمِ محروم جمال

ایک دل تس پریرنا امیدواری ہائے ہائے

نام گوشہ پر دنیا میں ہوا ہے نام و سنگ
حال منزل دیکھ کر اہل جہاں ہوتے ہیں دنگ
دل میں باقی تھی ابھی صحرا نور دی کی انگ
عشق نے پکڑا نہ تھا غائب ابھی وحشت کا رنگ

رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے



کیوں قیدِ زندگی سے دل اتنا ادا اس ہے
جب اس سے چھوٹنا ہے تو پھر کیا ہر اس ہے
کہتے ہیں جس کو موت وہ ہر وقت پاس ہے
سرگشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے
تسکین کوئے نوید کہ مرنے کی آس ہے

پھر تاپے رات دن یہ پریشان ادھر ادھر اس کو نہیں قیام کبھی ایک حال پر
 وحشت زدہ کے حال سے اور غفلت اس قدر لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر
 اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے

جنات کو دکھائی نہ اس درد کی جھلک محروم اس منزے سے رہے سر بسر ملک
 ہوں اس عطائے خاص جو منت کش ملک کیجئے بیان سرور تپِ غم کہاں تک
 ہر مو مرے بدن پر زبانِ سپاس ہے

ہونا ہے محبتوں ہی سے انسان بُرا بھلا محبت ملی بھی اس کو مگر کیا اثر کیا
 ہونا تھا آشنائی دل سے حق آشنا ہے وہ غرور حسن سے بیگانہ وفا
 ہر چند اس کے پاس دلِ حق شناس ہے

سودا می ہیں وہ جن کو ہے سہا سہو اجتناب انساں کو چاہیئے کہ پئے جائے بے حساب
 کرتا ہے خوب جذبِ رطوباتِ آفتاب بی جس قدر ملے شبِ ہتھاب میں شراب
 اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

مزا پہلے دشت میں چاروں طرف اسد رولوق فرا وہاں ہے درختوں کی صفِ اسد
 دُشمنیں ہے باعثِ قدر صرف اسد ہر اک مکان کو ہے مکین سے شرف اسد
 مجھوں جو مر گیا ہے تو جنگلِ ادا اس ہے

میری سنخوری پر بحث قیل و قال ہے طلب کو میرے پائے کوئی کیا مجال ہے
کہتا ہوں سب مجھ اور زبان میری مال ہے گر خامشی سے فائدہ اٹھائے حال ہے
نوشیوں کو یہ کیا بانی نہ مضمنی مجال ہے

اجہ جہ باہر سن کے دل کا رکھ زبان ہے برج ستار کا رکھ
سننا رکھ کر مار دے مار کہہ کر سننا رکھ کر مار دے مار
دار و رومہ حریف زبان کے مال ہے

وارہ کو پست سے رکھ کہیں مری ہوئی کا شش کبھی جلوہ آفتاب
مشاق سے کیا کرنا پائے روہ میں ہے آہ پڑا اسے غدا
رجا کو یہ کرنا پائے یہ سیران ہے

پرہیز اس کی کی بچاؤ ہر شے ہو کر سے اسے ہم بہار
رہنے سے بچاؤ سب سے بچاؤ اسے وہ اور دشمن
سب سے بچاؤ یہ بچاؤ ہے

خوشی سے بچنا ہے یہ دور و دہی ہے تہہ میں نس و نسا
انسان کے ہاں ہے شب و روز کہیں کہاں کہیں علم کے قدم سے

ناف زلیں سب ذلہ وہ غزال ہے
یہ رشہ ہے

گردش کا میری اور ہی کچھ رنگ تنگ ہے گردوں بھی دیکھ کر مری حالت کو تنگ ہے
جوشِ جنوں میں یتنگ و دو کی انگ ہے وحشت پہ میری عرصہ آفاق تنگ ہے

دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

مرزا کی طرح نفس کو سمجھا آئیو اتسد اس خواب پر نہ بھول کر اتر آئیو اتسد

دھوکہ نہ دوا ہر سے کہیں کھا آئیو اتسد ہستی کے مت فریب تیں آجا آئیو اتسد

عالم تمام حلقہ دایم خیال ہے

غیر سے تجھ کو محبت ہی سہی تجھ سے دنیا کو الفت ہی سہی

مجھ پر انھیار کو سبقت ہی سہی عشق پر تجھ پر وحشت ہی سہی

میری وحشت تیری شہرت ہی سہی

کوئی ایسی خطا کی ہم نے جس سے لائق نہ رہے محفل کے

حاشیہ ۱۳۶ کا۔ مشکیں لاس کبہ کعبہ کو سیاہ فرسید، ارغوانی، زعفران، ایک خاص قسم کا
ہل حس کی ماف سے مشک نکلتا ہے اسے نافوغرال کہتے ہیں۔

ناف میں۔ زمین کا مرکز حضرت علیؑ کے واسطے تھا۔ او۔ ان کے خلیفہ بھی۔ عاتق حضرت علیؑ کی
تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں یہ مات تمہور ہے کہ کعبہ وسط میں ہے یعنی زمین کا مرکز ہے لیکن یہ بات نہیں کہ
وہ ناف عرل بھی ہے۔ حضرت علیؑ کی ہر پانی سے کعبہ کے فضل کی توصیف تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔

سلسلہ کچھ تو لگائے رکھئے قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے

کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

ہے کہاں کی یہ بھلا دانائی کیوں ہے مرغوب تمہیں تنہائی

نہ جنونی ہوں نہ میں سودائی میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی

اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

عالم کن کو دبستاں سمجھو اس سے ملتا ہے سبق انساں کو

بھول کر غیر کا احساں نہ لو اگلی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو

آگہی مگر نہیں غفلت ہی سہی

ہے کہاں مثل شرر اسکو قیام گرم رفتار یہ رہتی ہے مدام

نہ توقف ہے نہ دم بھر آرام عمر ہر چند کہ ہے برق خرام

دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

رات دن عشق کا دم بھرتے ہیں رنج و ایذا سے نہیں ڈلتے ہیں

ان پر مرت کے لئے مرتے ہیں ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں

نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

۱۔ ایک حدیث ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا یعنی اپنی ہستی ہی سے خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

حضرت غائب فرماتے ہیں جو کچھ حاصل ہوا اپنی ہی ہستی سے ہونا چاہیئے۔ اگر اپنی ہستی سے معرفت حاصل نہیں ہو سکتی تو اپنی ہستی سے غفلت ہی حاصل کرنا چاہیئے۔ خودی مٹی جب مٹی خدائی۔ حاصل کلام پر کہ دوسرے کا احسان نہیں اٹھانا چاہیئے۔

شاد ہیں دور میں تیرے اہلاف اور ناشاد و حزیں ہیں انحراف
 اس قدر دین نہ ہوگی اہراف کچھ تو دے اے فلک نا انصاف
 آہ و فریاد کی فرصت ہی سہی

بحر میں غم کو ترے پالیں گے داد بھی اس کی کبھی پالیں گے
 جس طرح ہو گا یہ دن ٹالیں گے ہم بھی تسلیم کی خود ڈالیں گے

بے نیازی تری عادت ہی سہی
 کیا عجب ہے کہ وہ شرمائے اسد کچھ کرے رحم ترس کھائے اسد
 یہی مزا کی بھی ہے رائے اسد یار سے چھڑ چلی جائے اسد
 گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

۸۳

آوازے رات غیر سحر تک کسائے دل کھول کر مذاق برابر کیا کئے
 پاکر خموش مجھ کو جو چاہا کہا کئے اس بزم میں مجھے نہیں بنتی جیا کئے
 بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے

بن کر فقیر میں ترے در پر اگر گیا در بان مجھ کو دیچے کے غصے میں بھر گیا
 چپ چاپ میں جو تیری گلی سے گزر گیا دل ہی تو ہے سیاستِ دہاں سے ڈر گیا
 میں اور جاؤں در سے ترے بے صدا کئے

آئی ہے پھر چن میں بہارِ نخستہ پے
قسمہ ہوا ہے زبردِ ریائی کا آج طے
اس میہان کی بجے خاطر عزیز ہے
رکھتا پھروں ہوں خرقہ و بجا دہ رہن

مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کئے

ہو دستیاب آدمی کو گرہِ عمرِ خضر
دانا کبھی نہ لے اسے دو گرہِ عمرِ خضر
لاکھوں ہی پائیں ایک نہ دو گرہِ عمرِ خضر
بٹے صرف ہی گزرتی ہے ہو گرہِ عمرِ خضر

حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کئے

سپا امین اس کو سمجھتے رہے فہیم
اب وہ جوابات کہیں ہیں نہ زردِ نسیم
سب مال اس نے ہضم کئے بے ہراس و بیم
مق و رہو تو خاک سے پوچھوں کہ لے لیم

توبہ وہ گہجائے گدراں مایہ کیا سکے

اے ات بے ہمایہ اے کئی بستجو
بہتان اٹھاتے رہتے ہیں ہنگامِ گھٹنگو
پھرتے ہیں مائے مائے تحسین میں کو بکو
کسی ریز تہمتیں نہ تراشائے عدو

کس دن ہمارے سر پہ نہ آئے چلا کئے

آخر بڑی کہاں سے اسے بمنشینِ خو
ہر گز کسی حسین کو زیبا نہیں یہ خو

لے حرد و سجادہ یعنی گودری و ستے ادووں کو رہیں رکھتے پھرتے میں دوسرے موم ہارگی پس نظر ہے
گوناواری ہے پھر دونوں حیزوں سے نہ کام لیتے ہیں۔ خوب شوخی دکھلائی ہے۔

سے حضرت خضر عرِاوداں رکھتے ہی طر کیا گا کہ وہ بھی قیامت کے روز یہی کہیں گے کہ ہم نے کچھ نہ کیا بھفر
عمر گزار دی۔ عمر کے متعلق ایک اور شعر بھی کہا ہے یہ

وہ زندہ ہم ہیں کہیں روساں خلق لے حاضر
نہ تم کہ چور سے عمرِ جاوداں کے لئے

رکھنا تھا پیشتر تو نہ وہ مر جیں یہ خو صحبت میں غیری نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
 دینے لگا ہے بوسے بغیر التجا کئے
 انکھوں میں یوں تو اور کئی دنیا میں نازیں لیکن نہیں ہے سادہ دل ایسا کوئی جس میں
 پرہیز میں تو اس کو کہوں گا نہ ہم نشیں خسر کی ہے اور بات مگر خوبری نہیں
 بھولے سے اس نے سیکڑوں عسے وفا کئے

مہر نے عرض حال کا پایا جواب کیا لوگے تم اپنی بات کا اچھا جواب کیا
 چاہو نہ تم جواب تو اس کا جواب کیا غائب تمھیں کہو کہ ملے گا جواب کیا
 مانا کہ تم کہا کئے اور وہ سنا کئے

۸۴

وحشت اثر حیاتِ جہانِ شراب ہے مثل شر قیام کی یہاں کس کو تاب ہے
 اس رہ گزریں جو ہے وہ پادِ در کا ہے رفتارِ عمر قطع رہ اضطراب ہے
 اس سال کے سب کو برقِ آفتاب ہے
 یں بزمِ سنہیں رنگِ نرالیے بہار کے ہر جامِ پُر شراب گل تر ہے دیکھ لے
 مرغِ چمن کا ہے بطّے پر گلاں مجھے مینائے ہے سروِ نشاطِ بہار سے
 بالِ نذر و جلوہ موجِ شراب ہے
 تھا دل کو شوق اک نگہِ التفات کا معلوم تھا نہ حال ان آنکھوں کی گھات کا

طے ایک نیر میں ہوا قصہ حیات کا زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا
نے بھل گئے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے

دہر خراب میں ہے خرابات کی صفت مژدہ ہوئے نشوں کو تو مستونکو تہنیت
جاگیر یہ وہ ہے کہ انھیں کو ہے تولیت بادا و بادا نوشی زنداں ہے شمش بہت
غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

تارِ نظر کو کرتی ہے اس کی چمک فنا اس پر نگاہ ڈالے کسی کو ہے تاب کیا
آساں نہیں ہے ہر درختاں کو دیکھنا نظارہ کیا حریف ہو اس برق حسن کا
جوش بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے

پہلے ہی کچھ تو شوق میں تھا حالِ لبوں دیدار سے تو اور بھی اس کا بڑھا جنوں
اب اور ہی کچھ اس کو تمنابے کیا کہوں میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں
مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے

جھڑتے ہیں پھول یوں تو لبِ زدا سے مرزا یہ گل مرے لئے کیا کم ہیں خار سے
یہ اور بات چیت کرے اس نگار سے گزرا اسد مسرت پیغام یار سے
قاصد یہ مجھ کو رشک سوال و جواب ہے

وہ اگر میری تمنا پر ترس کھا جائے ہے سامنے آنکھوں کے برق حسن بچکا جائے ہے

خود بخود آنکھوں کے آگے خیرگی چھا جائے ہے دیکھنا قسمت کراپ اپنے پر رشک لگائے ہے

میں سے دیکھوں بھلا اک مجھ سے دیکھا جائے ہے

لا نہیں سکتی ہے ہرگز تاب آتش کوئی شے ہوتے ہی دوا آتش تیزاب ہو جاتی ہے

سوزِ بہناں بڑھکے قصہ خود بخود کر دیگا ہاتھ دھو دل سے ہی گرمی گرا نہ بیٹھے میں ہے

آہیگنہ تندئی صہبا سے بگھلا جائے ہے

تھا مناسب کوئی تدبیر ایسی دشمن کی کسے گفتگو میں تانا وہ ہر بار بے باکی کرے

کیوں دل اسکا بڑھے جب گزرتی کرے غیر کو کیونکر وہ یارب منع گستاخی کرے

گر چیا بھی اس کو آتی ہے تو شرم اچائے ہے

صبر کب تک کیجئے اور کب تنگ غم کھائیے تاب کے حال دل پر درد سے دکھ پائیے

دل کو ضبطِ نالہ کی تدبیر کیا بتلائیے شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے

دل کی وہ حالت کرم لینے سے گھبرا جائے ہے

کیا مسرت خیز ہے اے دوست تیری بزمِ گاہ تو جہاں ہو پھر وہاں غم پانہی سکتا ہر راہ

واہ ہوتی ہے وہاں جا کر اگر کرتا ہوں ہ دورِ چشم بد تری بزمِ طرب سے واہ واہ

لغہ ہو جاتا ہے واں گزنا لہ میرا جائے ہے

۱۔ حضرت غالب نے یہ ایک نیا مضمون باندھا ہے وہ غیروں کے بجائے اپنے آپ سے بھی رشک کر رہے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ جب میں اپنے محبوب کو دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے آپ پر بھی رشک آ جاتا ہے لہذا میں اس رسک کی وجہ سے اس کو اچھی طرح دیکھ نہیں سکتا ہوں۔

ابک اور شرا ہی مضمون کا ہے ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے چہرے میں ملے انکی تمنا نہیں کرتے۔

ہم یکب کہتے ہیں ظاہر ہو کوئی انداز عشق
یا ہمیں دنیا کہے وارفتہ و جانبا ز عشق
کیا کریں جب بدحواسی اپنی ہو غماز عشق
گرچہ ہے طرز تغافل پردہ دار از عشق
پرہیزم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

دشمنوں کے حال پر وہ آج کل ہے ہر یال
کچھ ہماری بھی نے اتنی اسے فرصت کہاں
وہ ہے اور اٹھوں پہر اغیار کی دلداریاں
اسکی ہزم آرا یاں سکر دل زنجوریاں
مثل نقش مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

اک تو قدر نہ ہی لے اسکو ناز میں پیدا کیا
اور اس میں تھا ہی کیا ناز و نراکت کے سدا
اور سیر نے بہ سہاگ عشق کا آنا ہوا
ہو کے عاشق وہ پیری رخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلنا جائے ہے بہت کہ اڑتا جائے ہے

دیکھیے تصویر کی سبکبیدی بھی اف - سازیب
اور عقیق لب میں ظاہر جو ہر اجمار ہیں
اللہ اللہ اکب کہنے میں ہی سوا انداز ہیں
نفس کو اس کے مصو پر ہی کیا کیا ناز ہیں
کہینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کہینچتا جائے ہے

رکھتے ہیں سر سے احباب طن بغض و حسد
دیکھتے اس بلیسی کی بھی کہیں ہوتی ہر حد
تیرہ نختی لائی ہے کیا رنگ اللہ الصمد
سایہ میرا مجھ سے مثل دور جھلکے ہر اسد
پاس مجھ تڑش بجاں کے کس سے ٹھہر جائے ہے

جاں نثاری کی تمنائے آب گل میں ہے کچھ تمنا اور ہی لیکن دل بسمل میں ہے
کیا کروں تدبیر بارب جان اک منگل میں ہے سادگی پر اس کی مہربانی کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کف قاتل میں ہے

دل سے دل کورا ہے مجھ کو یقیں ہرگز نہ نفا گفتگو کی آج کچھ اس نے تو عقدہ کھل گیا
کوئی میرے جی سے پوچھے اسکی باتوں کا مزا دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

قطع مجھ سے کر چکے وہ دوستی کا سلسلہ ان کی بزم عیش کے قابل کہاں ہیں غمزدہ
پھر بھی ہر دم کچھ نہ کچھ رہتا ہے میرا تذکرہ گریہ ہے کس کس برائی سے لے بائیں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

تو اگر چہا جائے گی ہم پر نصیبت ڈھائیگی جب نہ ہوگا شغل دل پر اک قیامت آئیگی
زندگانی بے مزہ کر کے مزا کیا پائے گی بس ہجوم ناامیدی خاک میں مل جائیگی
یہ جو اک لذت ہماری سعی بے حاصل میں ہے

ہم تو کرتے سر کے بل چل کر رہ مقصود طے بیٹھنے کا ضعف کرتا ہے تقاضا پے پے
پاؤں نے پکڑی زمین زنجیر پائے کوئی نشے رنج رہ کیوں کھینچے واما ندگی کو عشق ہے
اٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

دلِ رقیبِ روسیہ کا پیش کی منزل سہی ہم نے لوماناکہ ہم جلتے ہی کے قابل سہی
 سوزِ غمِ رگہائے تن میں خون کے قابل سہی جلوہ زارِ آتشِ دوزخ، ہمارا دل سہی
 فتنہٴ شورِ قیامت کس کے آب و گل میں ہے
 غفلتِ نزدیکِ مرزا قابلِ قہر و عتاب پھر کیا اک بے گنہ کو کیوں گرفتارِ عذاب
 اُن مصیبتِ نکالِ اسکو کہ حالتِ ہر خواب ہے دلِ شوریدہٴ غالب طلسمِ پیچ و تاب
 رحم کر اپنی تنہا پر کہ کس مشکل میں ہے



خالی نہ تیری چشمِ کرم کی نظر گئی چمکی مثالِ برقِ ادھر آئی اُدھر گئی
 سینے ہی تک نہ صرف یہ آکر گزر گئی دل سے تری نگاہِ جگر تک اُنز گئی
 دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی
 وہ دورِ جام ہے نہ وہ ہے پرستیاں وہ ہزمِ دلِ رہا ہے نہ ساقیِ دستان
 سرخوش کہاں نہ خا سے ہیں اتوں مگر کہاں وہ بادۂ شہانہ کی سرمستیاں کہاں
 اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی
 مدت سے آرزو تھی دل بے قرار میں پر ہوں تو اڑ کے جایئے ہزمِ نگار میں
 مرکزِ پہنچ گیا ہوں میں اس رہ گزاریں اُڑتی پھرے ہے خاکِ مری کوئے یار میں
 بارے اب اے ہوا۔ ہو بس بال و پر گئی

کیوں کر بھائے ہم کو نہ پرواز نقش پا گھر کر رہا ہے دل میں ہر اک باز نقش پا
دلکش ہے کتنی طرزِ فسوں ساز نقش پا دیکھو تو دل فریبی اندازِ نقش پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کستر گئی

تھی خاص یہ روش کبھی مردانِ کار کی یہ وضع ہر وضع ہے اب اختیار کی
جاتی رہی تمیز ہی اغیار و یار کی ہر بوا الہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شبیوہ اہلِ نظر گئی

عالم ہی اور ہے ترے حسنِ شباب کا مشکل ہے دیکھنا رخ پر آبِ تاب کا
بے سود و رائیگاں ہوا اٹھنا حجاب کا نظارہ نے بھی کام کیا وہاں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

بانا وہ مجھ سے ہاتھ چھڑا کر غضب ہوا ہر چہز تم نے وعدہ فردا کیا تو کیا
دشوار ہو گیا دلِ مضطر کا تمامنا فرد و دنی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

مرزا کی طرح دیکھتے تھے شاداں تمہیں پیری میں بھی جہان نے پایا جوان تمہیں
لیکن غمِ عالم نے کیا خستہ جاں تمہیں مارا زمانے نے اسدا لشرفاں تمہیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

رہنے کو کیا برباد جو جنت میں گھرے پھر تو جہاں جہاں ہے وہاں تو اگر طے
آرام دل کو جھوٹے رنج و بیکھ کرے تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر طے
تو رانِ خلد میں تری صورت نگرے

اس طرح کہ چہا کے خنجر دفن بعدِ قتل ظاہر نہ ہو ہوا ہے کدھر دفن بعدِ قتل
فاتلہ آگے نہ ترانہ دفن بعدِ قتل اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل
مید پتہ سے خلق کو کیوں تیرا گھرے

بہو اس پیکر تو وفا داری قدیم ایسا گیا کہ جا کے وہیں ہو گیا معیم
نہیں رہیں سے تالی دل معیم تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر طے

شہور ہمارا ہے، اتنے بے عشق کا صحرا میں گھنچ کے راتہ لپیٹ چلا گیا

۱۔ میرزا، کواثر مددگار کے معلق کیا خوب تر فرما رہے ملاحظہ ہو۔
۲۔ دیکھو ۶۱۔ یہ معنیوں چھ آمار جاہتا ہے یعنی سناؤ کہ ایک قاصد کی ضرورت ہوئی مگر یہ کہ
قاصد کس سے؟ تو یہی مرعاش ہے جو معنی ایک عاشق کا ایک شعر کو لایا اور اس نے عاشق سے کہا کہ
”میرزا، تم غلط ہے۔“ صاف ہوں کہ یہ اسی طرح نہ کرے گا بڑے کے پاس خط بھی لکھا قاصدا عاشق کا کار
ماہیاد۔ یہ تو بہت کہ کو دیکھ کر دشمنی نہ ہو کہ کیا جواب دیو نہ بنے کہ بڑے پناہ جنگی کو جلد یا اب نہ تو
اور ”قبول“ کے بعد مدد سے کہا ہے کہ عین دل لوتار ہے کسی کے باطن کی کسی کو کیا جرتے یہ مجھے کچھ کلام نہیں
آکر نامہ کر۔ عین تو اسکو مرسل نام کہیو کہ کیوں صاف نام کیا دعوے عاشق نہ ہونے کے کر مئے عین اور ایسا کار کا بہرہ

اُس جذب کا ہمیں نہیں بے وجہ ادعا تم کو بھی ہم دکھائیں کہ جنوں نے کیا کیا
 فرصت کشا کش غم پنہاں سے گرے
 طے کی ہیں ان کے ساتھ بہت سے مغزلیں لیکن نہ پیشتر و کبھی مانیں گے ہم انہیں
 اس رہ میں راہبر کی ضرورت نہیں ہمیں لازم نہیں کہ حضر کی ہم پیروی کریں
 مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

نام خدا تم آج ہو ساقی باجم اغیار اور حریف ہیں اس بزم میں ہم
 دیتے ہو ہم کو بے تو نہ دیں کسی سو کم ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم
 ریشہ پیا پیا کرتے ہیں بے حسد رملے

دلتا ہوئی ہمیں نہیں مبرا کچھ جتنا اس آستان کے خاک نشینوں میں وہ بھی تھا
 وہ بھی وہیں ملے گا جہاں ہو کر رہتا اے ساکنانِ کوچہ دلدار دیکھنا
 آج کہ کہیں ہو غالبِ آشفہ سر ملے

اُس طرف کچھ ناقدانی اور ہے اُس طرف زخمِ جوانی اور ہے
 گر یہی نامہ ربانی اور ہے کوئی دن گر زندگانِ اور ہے
 اپنے ذہن ہم نے محسّاتی اور ہے

ملے جنوں مرثوی کو اس شعر کا مطلب یوں لکھا ہے: ہمیں کوئی اسکاں نہیں محفوظ ہے وہی ہمیں ہے، راہِ امانا ہر کسوت
 تاتے کہیں کیا کرونگا، ہم کہہ رہے ہیں کہ وہ کھڑا ہے نہر میں یا لواجِ شہر میں، نگہِ ساگرِ فقیر ہو کر بیٹھ رہے، بادیں چھوڑ کر

میرے سینے پر بے گلِ خن کا گساں ہے زبانِ شمع کی صورت زباں
کیا بتاؤں اپنے دل کی گرمیاں آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

ہم نشیں ان سے سفارش کیا کریں حکم یہ ہے نام بھی میرا نہ لیں
کیجئے اب کس طرح راضی انھیں بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں
پر کچھ اب کے سرگرائی اور ہے

اپنی کو کیا زواں اور کیا خطر صاف کہہ دے گالیاں دی ہوں اگر
ہو رہا ہے کیوں تامل اس قدر دے کے خط منہ دیکھتا ہر نامہ برد

کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

دور میں ہیں چرخِ گرداں پر نجوم رات دن ہیں دائرِ محور نجوم
دہریں ہیں وجہِ خیر و شر نجوم قاطعِ اعمار ہیں اکشر نجوم

وہ بلائے آسمانی اور ہے

آچکا ہے غمِ قریب اختتام ٹوٹنے والا ہے کوئی دم میں ام
منظرِ ہنسا ہے مرزا صبح و شام ہو چکیں غالبِ بلا میں سب تمام

ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

اے نوابِ ناز و دلہا و دلہا کو لکھتے ہیں یہ دن مجھ پر گزرتے ہیں گرمی میں میرا حال بعینہ وہ ہوتا ہے جیسا زبانِ گہائی
پینے والے جانور کا۔ خصوصاً اس توڑ میں کہ غم و ہوا کا جو ہے آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں لے میری ہدیٰ قور
کو لکھتے ہیں وہاں کو کیا پوچھتے ہو؟ قدرِ اندازِ فضل کے ترکش میں یہی ایک تیر باقی تھا قتل ایسا عام۔ بوٹا ہے دانی خدا

کچھ وہاں کی خبر نہیں آتی کیوں صبا راہ پر نہیں آتی
کوئی تدبیر کر نہیں آتی کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

چرخ آزار کے ہے کیوں در پہ چین دیتا نہیں مجھے ہے
ہوتی ہے اپنے وقت پر ہر شے موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

دل ہی جب گم ہے دل لگی کیسی پاس تھا جب تو کچھ انگ بھی تھی
کچھ ہمیں اب تو ہو گئے مٹی آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

حسن بندوں کا ہے ریاضتِ زہد بسندگی اور نیک سیرتِ زہد
زیورِ عبد ہے عبادتِ زہد جانتا ہوں ثوابِ طاعتِ زہد
پر طبیعتِ ادھر نہیں آتی

بقیہ جلد ۱ - سخت کال ایسا پڑا وہاں کیوں ہو؟ "لسان الغیب" نے دس برس پہلے فرمایا ہے

ہو چکیں قاتل بلائیں ستیام ایک مرگ ناگہانی اور ہے

میاں شہزاد کی بات غلط نہ تھی مگر میں نے وہاں عام میں مرزا پہنچے لائقِ مذمعا۔ واقعی اس میں میسری
کسرِ شان تھی بعدِ رنجِ فساد ہوا بھو لیا جائے گا۔

ہونے دو حسرتوں کا دلیں خوں وہ بگڑ جائیں گے اگر کہدوں
اپنے دل میں ہے اور ہی مضموں ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ مضموں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

میرے نالے کہیں ٹھہرتے ہیں جا کے روزان کے کان بھرتے ہیں
خوش تو ہیں وہ مگر مکتے ہیں کیوں نہ چیخوں کر یاد کرتے ہیں
میری آواز گر نہیں آتی

دکھ سے فست جو میں ذرا پاتا چیر کر سینہ تجھ کو دکھلاتا
مقل ہوتی تو خود سمجھ جاتا داغ دل گر نظر نہیں آتا
بو بھی اسے چارہ گر نہیں آتی

ہے شکایت عبت تغافل کی کیا کہیں کچھ خبر نہ اس نے لی
جب ہمیں خود خبر نہیں اپنی ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

روز کے غم سے جان پر ہے بنی یا رب اس سے نجات کب ہوگی
ہو گیا سیر زندگی سے جی مٹتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

۱۔ غالب صاحب لطیف نگار کی کو لکھا ہے "میرا بکا دو کونین" مولانا فضل حق ایسا دوست مرحلئے عتاب
نیمہ روہ نیم جاں رہ طالع مرے ہیں آرزو میں مرنے کی آگے آتی تھی حال دل یہ سنسی الم اگر جوان ہوتا اور میرا رہ
آپ سے دعا ہے خیریت جاہتا اسی برس کا ملنا ہوئے آیا ہوں دعا کے نصرت کا امیدوار ہوں (ماقی ص ۱۲۱)

ہوش میں تم جو آؤ گے غالب ہند مڑا سے پاؤ گے غالب
 حق کو کیا منہ دکھاؤ گے غالب کبھے کس منہ سے جاؤ گے غالب
 شرم تم کو مگر نہیں آتی

۹۱

نالہ و آہ میں دھرا کیا ہے حاصل گریہ و بُکا کیا ہے
 اس ترپنے سے مدعا کیا ہے دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
 آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہے یہاں دل کو شوقِ جلوہ یار اور وہاں پر وہ مانعِ دیدار
 ان کو ہے بات بات پر انکار ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
 یا الہی یہ ماجرا کیا ہے

غیر کب تک کہے گا حالِ دروں آپ کب تک سنیں گے یہ مضموں
 ہو چکی انتہائے ضبط و سکون میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
 کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

باقی ص ۱۶۴ :- شراب کجخت اب بھی چھوٹی نہیں۔ غار کا اب بھی عادی ہوتا نہیں۔ "عانتا ہوں نوا طاعتِ زہرا
 کبھے کس منہ سے جاؤ گے غالب ۱۶۴

۱۶۵ میر بھری کو ایک خط میں لکھتے ہیں "میر بھری و میر فرراز حسین مجھ سے ناخوش اور گورکھ مند ہوں گے اور کہنے
 ہوں گے کہ دیکھو میں خط نہیں لکھا سہ میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں۔ کاش پوچھو کہ ماجرا کیا ہے
 ماجرا یہ ہے کہ میرا بھی تو کوئی خط نہیں آیا جس کا جواب لکھتا ہے"

کہتے ہیں واقفانِ غیب و خہود ایک ہیں عبد و عابد و معبود
آخر ان کا ہے اس سے کیا مقصود جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود

پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

جنگٹے کیسے عاشقوں کے ہیں اور معشوق کس کو کہتے ہیں
حسن کے پھر یہ کیسے جلوے ہیں یہ ہری چہرہ لوگ کیسے ہیں
عشوہ و غمزہ واد کیا ہے

ایک سے ایک نازیں کیوں ہے دام بردوش ہر حسیں کیوں ہے
فکر صیدِ دلِ حزیں کیوں ہے شکن زلفِ عنبریں کیوں ہے
نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے

کس لئے پھول رنگ لاتے ہیں کیوں یہ لالے نے داغ کھائے ہیں
کس نے یہ تازہ گل کھلائے ہیں بھڑہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

ہیں محبت کے بھی نرالے بھید آہ نغمہ ہے اس میں نار نشید
یاس کو مزدہ اور اجل کو نوید ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

دکھ کسی کو دیا تو کیا ہوگا تیرے حق میں بہت بُرا ہوگا
بد نتیجہ بُرائی کا ہوگا ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا
اور درویش کی صدا کیا ہے

کب یہ مکر اختیار کرتا ہوں کب دعا بار بار کرتا ہوں
 طرز دشمن سے عار کرتا ہوں جان تم پر نثار کرتا ہوں
 میں نہیں جانتا دعا کیا ہے
 مثل مرزا ہے گود میں غالب شعر کہتا ہے دل نشیں غالب
 ہے مگر رند بالیقین غالب میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
 مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

اے چارہ گرو تم انھیں سمجھ کے تو ہو آئے اور ساتھ لے مرزدہ اندھی ہو گو آئے
 اظہارِ تمنا سے مگر بات ہی کھو آئے کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالب ہو لے
 اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وو آئے
 اسانِ اجل ہے جو ذرا بے مجھے ہلت ہے اس کے نظارے کی تمنا دمِ رعلت
 وہ دیکھ تو لے آنکھ سے اپنی مری حالت ہوں کش مکشِ نزع میں ہاں جذبِ محبت
 کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے دیکھنے کو آئے
 اگر مرے گھر بھی وہی وحشت ہے وہی رم آئے ہی اجازت کے تقاضے ہوئے یہ رم
 مشکل ہے قیام ایک جگہ کا انھیں ک دم ہے صاعقہ و شعلہ و سیلاب کا عالم
 آنا ہی سمجھ میں میری آتا نہیں گو آئے

تربت میں مری آکے نہ بھاگیں گے نیکرین
 مردہ بھی مجھے پاکے نہ بھاگیں گے نیکر
 پریش سے بھی اکٹاکے نہ بھاگیں گے نیکرین
 ظاہر ہے کہ گھر کے نہ بھاگیں گے نیکر
 ہاں منہ سے مگر بادہ دوشینہ کی بو آئے

ہیں تیغ بکف کون جو پھرتے ہیں اکڑتے
 یہ کون ہیں جو وعظ میں دنیا سی ہیں لڑتے
 درپردہ کوئی اوہ ہے ہم کس سے بگڑتے
 جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھکڑتے
 ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

ہم ہوں تو ہر انسان ہیں طعنے نایافت
 ہاں اہل طلب کون سنے طعنے نایافت
 ہم گم ہوئے اور ختم ہوئے طعنے نایافت
 ہاں اہل طلب کون سنے طعنے نایافت
 دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

ہم وہ نہیں ناکالیوں کے نام سے بیٹھیں
 اندیشہ مایوسی انجام سے بیٹھیں
 رنج سفر و سختی احرام سے بیٹھیں
 اپنا نہیں وہ شیوہ کرام سے بیٹھیں
 اس درپہ نہیں یار تو کبھی ہی کو ہو آئے

اس شوخ کے لانے کی تو کرنے گئے تدبیر
 اور واں ترے رنے کی لگے کھینچنے تصور
 ڈوبی ہوئی تقدیر سے الٹی ہوئی تاثیر
 کی ہم نفسوں نے اثر گر یہ میں تقریر
 اچھے رہے آپ اس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے

لے بادہ دوشینہ سے مراد رات کی پی ہوئی شراب ہے اہل اسلام کا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد قبر میں دوشینہ نیکرین
 سوال و جواب کیلئے آئے ہیں۔ غالب صاحب غنی کے انداز میں فرماتے ہیں نیکرین کے سوال و جواب بچے کی ہی صورت
 ہے کہ مرنے سے پہلے مجھے شراب پلا دو فرشتے قبر میں شراب کی بوتل بھاگ جائیں گے اور میں سوال و جواب کی رحمت سے
 بچ جاؤں گا۔ (ذکیا فوب انداز بیان ہے)

اک لطف وہاں عید کا دن رات ہر غالب کیا جلسہ یارانِ خوش اوقات ہر غالب
 مہرِ آس کے لئے وہ درِ حاجات ہر غالب اس انجنِ ناز کی کیا بات ہے غالب
 ہم بھی گئے وال اور تری تقدیر کی رو آئے

(۹۳)

جب سے رنگِ بہار طاری ہے کچھ عجب کیفیت ہماری ہے
 پھر لہو چشمِ تر سے جاری ہے پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے

سینہ جو یائے زخمِ کاری ہے

پہلے بے کارِ محض تھا ناخن اب مگر کام دے گیا ناخن
 داغِ دل کی طرف بڑھا ناخن پھر جگر کھودنے لگا ناخن

آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

پھر عبادت کا ہے نبیٰ انداز اور ہی سمتِ رخ ہے وقتِ نماز
 سن کے ناتقے کی دل ربا آواز قبلہ مقصدِ نگاہِ نیاز

پھر وہی پردہِ عماری ہے

ہو کے گاہک بنے ہیں سودائی دیدہ و دل کو کچھ نہ سدھائی
 رہ گئی ان کی ساری دانائی چشمِ دلالِ جنسِ رسوائی

دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے

مل کے دونوں نے یہ ٹھہرائی ایک عالم بنے تماشا
دونوں ذلت کے ہیں تمنائی وہ ہی صدرنگ نالہ فرسائی
وہ ہی صد گونہ اشکباری ہے

تنگ ہوں ہجر جاں گزار سے پھر عشق ہے اس قدر دراز سے پھر
مست ہوں چشم نیماز سے پھر دل ہوا ہے خرام ناز سے پھر
محترستان بے قراری ہے

حسن پھر ترک ساز کرتا ہے پھر دیرِ فتنہ باز کرتا ہے
خونِ اہل نیاز کرتا ہے جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے
روز بازارِ جاں سپاری ہے

لاکھ صدے نئے گزرتے ہیں جان اس پر نثار کرتے ہیں
پھر دم اس پر دغا کا بھرتے ہیں پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

ق

آئے ہیں داد خواہ اہل نیاز ہیں جفا پیشہ گوشِ براواز
ظاہر اب ہوں گے حسنِ عشق کے راز پھر کھلا ہے دیرِ عدالت ناز
گرم بازارِ فوجداری ہے

ہرز بردست ہو گیا ہے شیر زیر دستوں کو کر رہا ہے زیر

عدل وانصاف میں نہ کیوں ہو دیر ہو رہا ہے جہان میں اندھیر

زلف کی پھر سرشتہ داری ہے

پھر کیا دل نے یوں بیاں احوال رو دیئے سن کے حاکم و عمال

سر اجلاس پھر ہے قال و مقال پھر دیا پارہ جگر نے سوال

ایک فریاد و آہ وزاری ہے

ابھی ثابت نہیں جفا کا سبب نہ ابھی ہے ثبوت قہر و غضب

دیکھئے ہو معاملہ طے کب پھر ہوئے ہیں گواہ عشق طلب

اشکباری کا حکم جاری ہے

عشق انصاف پر اگر آیا بال کی کھال ہی نکالے گا

دیکھئے اس کا ہو نتیجہ کیا دل و خرگاہ کا جو مقدمہ تھا

آج پھر اس کی رو بکاری ہے

ہے یہ مرزا کو تو یقیں غالب ہوئے مغلوب تم کہیں غالب

مل گیا ہے کوئی حسین غالب بے خودی بے سبب نہیں غالب

کچھ تو ہے جسکی پردہ داری ہے

کی کرشمی تو فرطِ زحمت سے خم ہوئے اپنی تعلیوں سے نخل دم بدم ہوئے

گھر گھر نشاط و عیش کا جوش و خروش ہے بزمِ طرب کہیں ہے کہیں ناؤ نوش ہے
اور یہاں و فورِ غم سے پرگندہ ہوش ہے ظلمتِ کدہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

ہے چونکہ دریا بحر میں دونوں کا ایک حال ممکن نہیں کہ ایک سے ہو ایک کو ملال
باہم نہیں ہے رشکِ حسد کا کوئی خیال نے فردہ وصال نہ نظارہ جمال
مدت ہوئی کہ اشتیاقِ چشم و گوش ہے

کم کر دیا ہے نشہ ساقی کا اجتناب سر کا ہے آج رخ سے ذرا گوشہ نقاب
دیدار سے ہے دیدہ مشتاق کا میاب نے کیا ہے حسنِ خود آرا کو بے حجاب
اے شوق ہاں اجازتِ تسلیم ہوش ہے

اس کے گلے کا ہار جو در نہیں ہوا گویا صدف کا اختر قسمت چمک گیا
اک رشک اور بھی ہے صدف کا تو ذکر کیا گوہر کو عقد گردنِ خوباں میں دیکھنا
کیا اوج پر ستارہ گوہر فروش ہے

اے غالب صاحبِ شاعر کو اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے: "اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے" یہ خبر ہے پہلا مصرعہ "ظلمتِ کدہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے" یہ خبر ہے "شبِ غم کا جوش" یعنی اندھیرا ہی اندھیرا ظلمتِ غلطہ گھرنا پیدا کرنا غلطی ہی نہیں ہوئی۔ ہاں ایک دلیلِ سحر جو در ہے یعنی بھی ہوئی شمع۔ اس راہ سے کہ شمع و چراغ صبح کو کچھ جایا کرتے ہیں۔ لطف اس معنوں کا یہ ہے کہ جس شے کو دلیلِ سحر کہہ لیا ہے وہ خود ایک سببِ بخلا سببِ تاریکی کے۔ پس دیکھا چاہیے جس گھر میں علامتِ صبح مؤید ظلمت ہوگی وہ گھر کتنا تاریک ہوگا۔

ہے شکر کی جگہ کہ نہیں ہم وہ ہے پرست دو گھونٹ میں جنہیں نہ ہے ہوش پاؤ دست
اچھا کیا تمہارے تصور نے نذر و بست دیدار بادہ حوصلہ ساقی نگاہ مست
بزم خیال میکدہ بے خروش ہے

ق

کرتی تھی مجھ کو قلتِ ے یا تو مضمحل یا اب خیال بادہ کشتی بھی ہے ہاں گسل
کردار سے ہوں اپنی پشیمان و منفعل اسے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زہار اگر تمہیں ہوس ناؤ و نوش ہے

سمجھو کچھ آپ اپنے اگر خیر خواہ ہو سنبھلو ذرا جو طالبِ امن و پناہ ہو
تم بھی کہیں نہ میری طرح سے تباہ ہو دیکھو مجھے جو دیدہٴ عبرت نگاہ ہو
میری سنبو جو گوشِ حقیقتِ نبوش ہے

اس بزم میں نہ پاؤ گے کچھ غیر گم رہی جاتی رہے گی عقل سرا سر رہی سہی
مجھ پر گزر چکی ہے جو میں نے تمہیں کہی ساقی بجلوۂ دشمنِ ایمان و آگہی
مطلب بہ نغمہ رہن تمکین و ہوش ہے

کہتے ہیں جس کو اہل جہاں محفلِ نشاط اک خوابِ خوش سے بڑھکے نہیں بساط
رونق کو اس کی لحظہ بہ لحظہ انحطاط یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گونہ بساط
دامانِ باغبان و کفنِ گل فروش ہے

چاروں طرف نشاطِ جاک بوج ہے رنگ بجتا ہے شورِ قلقلِ مینا سے جل ترنگ

ہے دل میں اہل بزم کے اک جوش و رنگ لطفِ خرام ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
 یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے
 ہے انبساط و عیش کا منظر تو بزم میں پیدا ہے لطفِ گردش ساغر تو بزم میں
 کچھ زلیست کا مزہ ہے میسر تو بزم میں یا صبح دم جو دیکھے آکر تو بزم میں
 نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
 حالت ہی اور کچھ نظر آتی ہے بزم کی رونق ہی اس جگہ کبھی گویا ہوئی نہ تھی
 محفل جو تھی بھری ہوئی سنسان ہو گئی داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
 اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خاموش ہے
 مریزا نے کی نہ کوئی کمی مرضِ حال میں تا ہو نہ مستانِ کوئی نے کے وبال میں
 اک درد ہے بھرا ہوا اسکے مقال میں آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
 خائبِ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

گر نہیں ان کو یقین چاہ کا میری نہ بھی جاں لیکر بھی اگر قدر نہ کچھ کی نہ بھی
 وہ یہ کہتے ہیں جان نہیں میری نہ بھی نہ ہوئی گھر سے مرنے سے تسلی نہ بھی
 امثال اور بھی باقی ہے تو یہ بھی نہ بھی
 میرے حلقے میں نہیں گل نہ بھی خار تو ہے دل میں اک صورتِ یادِ گل و گلزار تو ہے

گو مسرت سے ہوں محروم غم یار تو ہے خارِ عالمِ حسرت دیدار تو ہے

شوقِ گلِ چینِ گلستانِ تسلی نہ سہی

بیا کوئی فرض ہے ہر روز اسے اے ہی بنے اپنے ہاتھوں سے ہیں جامِ پلائے ہی بنے

یہ نہیں ہے نہ ہوئے آج اڑائے ہی بنے بے پرستارِ خمِ مہ سے لگائے ہی بنے

ایک دن گرنے ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

بے دیوانے کی گواہی نہ کی قدر تو کیا جوشِ وحشت نے دیا اس کا ستارہ چکا

ہنی آنکھوں کا بیاباں نے بنایا تارا نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا

گر نہیں شمعِ سیدہ خانہ بلی نہ سہی

رکتے ہیں مجھے احبابِ فضاں کو تاحق ہر گھڑی جب مجھے گھوٹیں تو نہ کیونکر ہو قلق

زِ عشرت ہی نہیں باعثِ ولقِ مطلق ایک ہنگامہ پر موقوف ہے گھر کی رونق

نودِ غم ہی سہی نغمہ شادی نہ سہی

یہ سقل پہ حاسد کے پڑا ہے پردا کر دیا ہے مرضِ رشکِ حسد نے اندھا

لبا پنا اسے سمجھاؤں ہی تو حاصل کیا نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

سے مرزا جو کہیں اس کو نصیحت سمجھو ہیں جو ہمدرد تو یہ ان کی عنایت سمجھو

ما جو آئی ہے بہتر یہی حالت سمجھو فرصتِ صحبتِ خواباں ہی غنیمت سمجھو

نہ ہوئی غالب اگر عمرِ طبعی نہ سہی

کبھی کیا تھا ظالم نے اس طرح کرم آگے
 نہ کی تھی تیغ سرِ قتل گاہ یوں علم آگے
 ہمارے سائے سے پہلے تو کرتا تھا وہ آگے
 عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
 کر اپنے سایہ سے سرِ پاؤں سجھے دو قدم آگے
 مر رہی جسے میرا نے زینے کے غم و کلفت
 خرابیوں سے زینے کی ہے کہاں مجھے فرصت
 مر رہی واسطے بیدار ہوئے ہیں ماتم و حسرت
 قضا نے تمہارے چاہا خراب بادہ الفت
 فقط خراب نکھا بس نہ چل سکا قلم آگے
 ہمارے دل کی شادی غمِ فراق نے ہستی
 کچھ اب تو بہت طاقت میں قہر کی ہوئی بستی
 بے بسائی ہوئی حسرتوں کی اجڑی ہے بستی
 غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عیش کی بستی
 و مگر نہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے
 بتائیں کیا کرتا ہمارے دل کی برباد کیا
 دیا ہے نامہ مگر دل کا ہے کچھ اور ہی سودا
 لگی ہے دھن کہ سنیں خود جواب کچھ نہ کچھ اسکا
 خدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا
 کہ اس کے در پر پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے
 تمہارے چھوٹے سے سرخے میل گئے ہیں بلا کے
 تمہارے بچنے کی ہے جینے کی بھی چھوٹ
 ہمارے دل کی کچھ لکھا ہوا تھا کیا کہیں ہم سے
 یہ بکھر جو پریشانیاں اٹھانی ہیں ہم نے
 تمہارے آنسو اے طرہ ہائے خم بہ خم آگے

بہت دنوں تو ہم اسی مرگ بہت ہے دپے ہم اشکِ نثر بہائیں کہ قصہ ہی کہیں ہوٹ
اب اپنی ہستی کا عقدہ کھلا کر یہیے کیا شے دل و جگر میں پر افشاں جو ایک موہِ نوں ہے

ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے
وہ اشکِ نامِ مرزا میں کب بہاتے ہیں غالب غصہ بے مرنے کی میرے خوشی مٹاتے ہیں غالب
ملنے خاک میں مجھ کو کہاں وہ آتشی غالب قسمِ جنازہ پر آنے کی میرے کھاتے ہیں غالب
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

آہ کرنے سے غصہ بس کا سوا ہوتا ہے ناکرتا ہوں تو سرگرم جفا ہوتا ہے
لب ہلانا سببِ ترک و فنا ہوتا ہے شکوے کے نام سے بے ہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ کہ جو کہئے تو گلا ہوتا ہے

تنگ ہوں کب تک اٹھایا کروں میں جو جفا کونسا ظلم ہے جو آپ نے مجھ پر نہ کیا
بے سبب تو نہیں شکوے کا مرنے تا رہا پرہوں میں شکوے سے یوں راگ کر جیسے باجا
اک ذرا چھوڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

دل غم دوست کی ہے عین تمنا یہ تو ہم جوشاکی ہوں تو وہ اور ستائے ہم کو
کاش آگاہ وہ اسرارِ شکایت سے نہ ہو گو سمجھتا نہیں پر حسنِ تلافی دیکھو
شکوہِ جور سے سرگرم جفا ہوتا ہے

کمر دیا روز کی گردش نے اسے خستہ حال پاؤں بھی ابتواٹھا نا ہے اسے سخت محال
 ہو گیا خلق کو اندازہ رفتار محال عشق کی راہ میں ہر چرخ ملکوب کی کچھال
 سست رو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

ہم یہاں تک تو ہوئے تو گر بیدار و رستم دیر ہوتی ہے جفاؤں میں تو ہوتا ہے الم
 دل کو ہے تازہ جراحات کی خواہش ہم کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیلہ دکہ ہم
 آپ اٹھلاتے ہیں گریزِ خطا ہوتا ہے

غمتِ برگشتہ نے لینے ہی نہ دی ہم کو پناہ رکھتے اے کاش نہ ہم اپنی بھلائی پہ نگاہ
 کام سب سوئے تدریس ہوئے اپنے تباہ خوب تھا پہلے ہی سے ہوتے ہم اپنے بدخواہ
 کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے

ڈرے شکوہ نہیں کرتے ہیں کہ ہے تکرارِ دب ناتوانی کی ہے آخر کوئی حد بھی یارب
 زار نالی بھی ہے رُشوار دمِ رنج و تعب نالہ جاتا تھا پرے عشقِ بریں سے اور اب
 لب تک آنا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

طبعِ قدرت نے مجھے دی ہر عجبِ جادو فن میں جو چاہوں ہر قرطاس کھلا دوں گلشن
 راگِ لاسناب کیا مجھ سے کوئی مرغِ چمن خام میرا کہ وہ ہے بارِ بد بزمِ سخن
 شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

ذات کو تیری کیا حق نے پناہ عالم تیرا سایہ ہر مخلوق پہ ہے ابرِ کرم
 اہل دنیا کو ترسِ فیض سے ہے عیشِ ہم اور شہنشاہِ کواکب سپہ و مہرِ علم

تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے
 محض افسانہ ہیں شاہانِ سلف کے قصے
 پہنچ ہیں شوکت و اقبال میں تیرے آگے
 کچھ ٹھکانا ہے بھلا جاہ و شتم کا تیرے
 سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے
 تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے
 گر دیکھتے تیرے لئے فلک کا ہے یہ حال
 ذرہ ذرہ ترے دروائے کا خورشید مثال
 ماہِ کامل کو جبیں سائی میں حاصل ہو کمال
 ہر جہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال
 آستان پر ترے مناصب سا ہوتا ہے
 بند ہیں مرغِ چین مجھ سے خوش لگانی میں
 کچھ نہ کچھ نغمہ سراہوں جو پریشانی میں
 ہے ترا لطف ممد طبع کی جولانی میں
 میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزل خوانی میں
 یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فرا ہوتا ہے
 کہنے کیا چرخِ ستم کار کو ہی نا انصاف
 ذکر کیا غیر کا اپنے بھی مہر کے خلاف
 کوئی ہمدرد نہیں قاف سے لیکر تاقاف
 رکھو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
 آج کچھ دردِ دل میں سوا ہوتا ہے

بلائے دہرے بے ہاکیوں کی خو کیا ہے
 تھکائے سامنے انسان کی آبرو کیا ہے
 کلامِ ہتک یہ دشمن کے روبرو کیا ہے
 ہر ایک بات پر کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
 تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے
 سہ حاشیہ منہ پر

نگاہ گرم سے ظالم نے بس کو دیکھ لیا
جلا کر اس کو کیا خاک دم میں سہرتا پا
کمال یہ ہے کہ کرتا ہے آگ سے ٹھنڈا
نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برقی میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے

برائیوں کے ہماری سبق ہزار و دے
یقین ہے کہ نہ فقر و میں آؤ گے اس کے
خیال اس کا نہیں ہے کہ وہ جو چاہے
یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوف بداموزی عدو کیا ہے

نہ دے گا کام رفوگر یہاں نہ کچھ فتن
اٹھائے طاق میں رکھ اپنے رشتہ و سوزن
سرکش جسم کے تاروں سے سن چکا دامن
چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیرا ہن
ہماری جیب کو اب حاجت رفو کیا ہے

رہا نہ تن ہی تو دل کا کہاں پتا ہوگا
یقین ہے جسم سے پہلے ہی مٹ چکا ہوگا
سوائے خاک یہاں دستیاب کیا ہوگا
جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کر دیتے ہو جواب راگہ جستجو کیا ہے

حاشیہ ص ۹۱ کا :- غزل تہرے غالب صاحب آگے انھوں نے غزل بھی لکھی تھیں کہ لکھا اگر تم فقیر ہے یہاں اور اس غزل کا طالب کا ذوق تھا ہے تو یہ غزل اس خط سے پہلے ہی ہو گئی۔ نیز یہ غزل شیونرائن آرام کو بھیج کر فرمایا۔
یہ تمہارا قبائل ہے کہ کو شعر یاد آئے ایک غزل یہ اور دو عریس تو رہا جا سکتی ہیں تیس ہفتہ کا گودام تمہارے پاس درام ہو گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شعی سونرائن لیے ہفتہ وار اخبار میں غالب صاحب کا کلام شائع کرتے تھے۔
کہا جاتا ہے کہ کیرن ذوق پاداشی میں جا ہے تھے کہ غالب کی نظروں پر پڑ گئی چونکہ دونوں میں ہم عصر نہ چٹک گئی
ابنہ غالب نے فی البدیہہ یہ مصرع پڑھا ذوق سے سن لیا اور بادشاہ ظفر سے شکایت کی۔ غالب جب دربار میں گئے بادشاہ
نے پوچھا کہ آج آپ نے کونسی غزل کہی ہے۔ غالب صاحب نے پوری غزل سنائی اور مطلع کا یہ مصرع بدل دیا۔ ہولہ الخ

غلط کر رہتا ہے جویاے خنجر قاتل کہیں گے ہم تو کہے اس کی ڈر لا حاصل
ہے میں شک میں گھل گھل کے کیا جگر کیا دل رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قاتل

جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

جہے توفیق زہاد کو ہے اس کی تمیز کہ کس کو کہتے ہیں علماں حوی ہے کیا چیز
ہمیں غرض نہیں کوئی غلام ہو کہ کینز وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز

سوائے بادۂ گلہ نام و مشکبو کیا ہے

چڑھا کے ساغر و میناے نے نہ ہوں ہر شمار سہو بھی منہ سے لگا کر نہ سیر ہوں زہار
یقین کیجئے میں نام کا نہیں ے خوار پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار

یہ شیشہ و قدر و کوزہ و سبو کیا ہے

ہمارے حال پران کو کہیں نظر ہو بھی اور التفات مریض فراق پر ہو بھی
نتیجہ خاک نہ ہو گا اگر خبر ہو بھی رہی نہ طاقت گفتار اور اگر ہو بھی

تو کس امید پر کیجئے کہ آرزو کیا ہے

عروج طالع غالب اگر اسے بھاتا حسد کی آگ میں حاسد نہ یوں بھنکا جاتا
نہ پھر یہ شعروہ مرزا زبان پر لاتا ہوا ہے شہ کا مصاحب پھر کہے اتراتا

وگر نہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے



تابِ الم اب مجھے زہار نہیں ہے قابو میں مرے دل افکار نہیں ہے
 آہِ ذرا دل پر اختیار نہیں ہے آکر مری جان کو قرار نہیں ہے
 طاقتِ بیدار انتظار نہیں ہے

دل کو تو قابو میں اپنے لے لیا پہلا کرتے ہیں فرمائش جانِ جانِ ہم سے
 لطف ملے گا بھلا کب عیش سے اسکے دیتے ہیں جنتِ حیاتِ دہر کے میلے
 نشہ بہ اندازہٴ نغمہ ساز نہیں ہے

چھائی ہے کچھ اس طرح کی بیکسی اب تو روتے ہوں ہمارے کوئی نہ ہے دل جو
 شکوہِ رقیبوں کا کیا کیا تیرا گلہ ہو گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو
 ہائے کہ روئے پہ اختیار نہیں ہے

وہ بھی تو چاہیے کچھ رنج کی آہ کونسی شے میں ہے پایا عاجز و قاصر
 چاہو تو ہم جان بھی کر سکتے ہیں حاضر ہم سے بحث ہے گمانِ رنجشِ خاطر
 خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے

غلتِ دل سے بھلا کیا پائے معافی اسیں ہی مضمحل ہے سب دیکھو معافی
 اس کو سمجھ منزل و ماوا سے معافی دل سے اٹھا لطفِ جلوہ ہائے معافی
 غیر گلِ آئینہ بہار نہیں ہے

اس پہ کئے میں نے برسوں تک تقاضے سن کے ہمیشہ مگر کچھ ٹالا ہی اس نے
 طالع خفتہ مرے اب کچھ تو ہیں جاگے قتل کا میرے عہد تو کیا ہے بارے
 وائے اگر عہد استوار نہیں ہے
 تو نے یہ کیا زہد کی ٹھہرائی ہے غالب چال یہ مرزا نے تری پائی ہے غالب
 جام و سبو کا تو تو سودائی ہے غالب تو نے قسم نے کشی کی کھائی ہے غالب
 تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

(۱۰۱)

زمانے بھر کے رنج و غم ہیں اور تنہا ملول ہے تخیل مجھ سے اس کوہ گراں کا سخت مشکل ہے
 بڑھاپے بوجھ اتنا سوئے زانو سر بھی مائل ہے بھوم غم سے یاں تک رنگونی مجھ کو حاصل ہے
 کہ تابو امن و تازہ نظریں فرق مشکل ہے
 بچے لے چارہ گرد نظر راحت نہیں تن کی مرے لوں تو اگر کاٹے رگیں بھی میری گزین کی
 سیئے جائز خم دل پر آئے کر کچھ طعن دشمن کی رفوئے زخم سے مطلب کی لذت زخم سنون کی
 سمجھو موت کہ پاس رورے دیوانہ غافل ہے
 گلستاں میں گروہ و لعل افزائی کے غالب تو نور اس کا عطا نرس کو مینائی کے غالب
 عجیب بولے خوش مرزا کو سودائی کے غالب وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمایا کے غالب
 چنگنا غنچہ گل کا صدائے خندہ دل ہے

جس روز کہ تو سیر کو گلزار میں آوے گل تازہ کھلے نکلتے گل خار میں آوے
بالیدگی سوکھے ہوئے اشجار میں آوے جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے

ہاں کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے
گلِ گشت میں پیدا ہو عجب لطف کا منظر لے بڑھکے بلائیں تری ہر شاخِ گلِ تر
گلِ تیرے قدم لینے کو ہوشِ زہیں پر سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قیدِ دل کش سے جو گلزار میں آوے

مانا کہ غم و ہم سے دل زار کھلا ہے بر سادے مرقاں نے خود ریا بھی تو کیا ہے
آنکھیں بھی لہو روئیں تو کیا فخر ہوا ہے تب نازِ گرا نمانگی اشکِ بجا ہے
جب لختِ جگر دیدہ خونبار میں آوے

ہر چند ہوا جوشِ فرو مجھ کو ستا کر کچھ دل کو ہوئی راحت و تسکین بھی دم بھر
وہ بات بھی کر جس سے لے لطفِ مکر نے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ تم گر
کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے

اعجازِ کارنگ اپنے بخود کھلائے اشارہ بے جان کو جاندار بنا جائے اشارہ
جادو سے غضبِ یکے کیا دھائے اشارہ اس چشمِ فسون گر کا اگر پائے اشارہ
طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے

مصرف دعاؤں میں ہیں کس سے یارب تا برہنہ پا گزرے کوئی پاس سے یارب
تکتے ہیں پڑے راہ عجب یاس سے یارب کانٹوں کی زباں سو گدھے گئی پیاس سے یارب

اک آبلہ پا وادی پر خار میں آوے

آیا مرے آغوش میں کب وہ تن نازک کس دن ہو راحت کا سبب وہ تن نازک
پھندے میں ہو یوں غیر کے اب تن نازک چراؤں نہ کیوں رشک سے جب تن نازک
آغوشِ غم حلقہ زنا میں آوے

پھیلائے ہوئے دست طلب ہیں سراسر دیکھا ہے زمانے میں انہیں خوار ہی اکثر
انساں کیلئے حرص ہی دشمن ہے قوی تر غارت گردنا موس نہ ہو گھر ہو س ز ر
کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

مانا کہ جنوں کلمے تجھے جوش فراواں باقی ترے ہاتھوں سے رہی جنبہ اماں
یوں ٹکڑے اڑانا تو نہیں ہے تجھے شایاں تب چاک گردِ بیاں کا فرہے ل ناداں
جب اک نفس الجھا ہوا ہزار میں آوے

کیا حال تپ سوز دروں کہئے زباں سے لگ جائے کہیں آگ نہ گرمی کے بیاں سے
بہتر نہ کہ نہاں ہی رہے اہل جہاں سے آتش کدہ ہے سینہ مرا ز نہاں سے
اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے

مرزا کی طرح سحر کی قسم اس کو سمجھئے مغمضوں ہے اگر روح تو جسم اس کو سمجھئے
افسوں اسے ٹھہرائے ام اس کو سمجھئے گنبدِ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

ماند ہے نجم سحر یار کا خال اچھا ہے اس کے ابرو سے نہ خنجر نہ ہلال اچھا ہے
 مہر کچھ ہے نو ذرا قبل زوال اچھا ہے حسن مگر چہ بہنگام کمال اچھا ہے
 اس سے میرا مرہ خورشید جمال اچھا ہے

مفت کے مال کے اس رجب ہیں خواہاں کیا وہ اسی دالو اسی گھات میں ہیں شام و بگاہ
 چاہتے ہیں کہ رقم کوئی ملے خاطر خواہ بوسہ دیتے نہیں وردل پہ ہے ہرقت نگاہ
 جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

کب بیکر ہوا جیشید کو یہیمانہ نیا دور میں تادم آخرو ہی اک جام رہا
 دل سے اترا جو یہاں دور کیا پھینک دیا اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
 ساغرِ دم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

کر دیا ہے غم، بجزاں نے مرا سیدہ شوق نام ہی نام برب جان کا باقی ہے رفق
 رنگ رہتا ہے مرا یوں تو غم و درد سے فراق انکے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر و فراق
 وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

انکے ہاتھوں سے سی کو بھی نہیں پہنچا فیض دین و ایمان کے یہ دشمن ہیں تو کچھ کس فیض
 بندگی کیسے بھی دیکھا تو نہ پایا با فیض دیکھئے پاتے ہیں عشاق بتو س کیا فیض
 اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

فن ہے وہ چیز کہ فرہاد کی دی بات بنا ورنہ شیریں سے کہے بات یہ اسکا مذاق تھا
جس ہنریں غمی اسے مشق وہ کام آئی گیا ہم سخن پیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

وصل محبوب اے کاش ہمارا ہو جائے دور جلدی کہیں یہ پڑہ دووی کا ہو جائے
جزو ہو وصل کل ایک ہی نقشہ ہو جائے قطرہ دریا میں جوں جائے تو دیا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کمال اچھا ہے

کس کے دروازے سے جو چاہے گدا ملتا ہے اور جو ملتا ہے تو باچون و چرا ملتا ہے
در بدر بھیجک اگر مانگے کیا ملتا ہے بے طلبے ہیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

تا ابد اس کو خدا رکھے سراسر سربلندر اس چین میں ہے یہ رشکِ صنوبر سربلندر
ہو سدا اس کا چین زارِ مقدر سربلندر خضر سلطان کو رکھے خالقِ اکبر سربلندر
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

کٹ لے ہیں اسی امید میں مزا کے بھجن صرف اسی آسری پہمے دل مضطرب ساکن
یہ تصور جو نہ ہو کب ہے تسلی ممکن! ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ہم ہیں شاکی ساقی گلفام کے اہل مخمل ہوں مُحق انعام کے
 حوصلے پورے ہوں خاص و عام کے غیر ہیں مخمل میں بوسے جام کے
 ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

ظلم سے خالی ہے کوئی کِر نہ مر درپئے ایذا ہیں اہل شہر و درہ
 تم سے کیوں پڑتی مرے دل میں گرہ خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ
 ہنسنڈے ہیں چسرخ نیلی فام کے

دل میں اس ناوک فگن کے ہے گرہ یہ کمان اپنی کئے رہتا ہے زہ
 تاکہ میں سب کی ہے کہ ہو یا کہ مر خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ
 ہنسنڈے ہیں چسرخ نیلی فام ہے

تم جواب خط ہمیں دو یا نہ دو ہم کو حاصل ہے غرض ہے دل کی جو
 اس بہانے نام لکھا جائے تو خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
 ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

جوشِ مستی میں کیا طوفِ حرم خستِ خم پر کی ادا رسمِ سلم
 زہد میں رندی سے بھی چوکے نہ ہم راتِ پی زمرم پرے اور صبح دم
 دھوئے دھتے جامہٴ احرام کے

تھی بلا اپنے لئے اپنی نظر ہتکنڈوں کی اس کے تھی کس کو خبر
 اپنے ہاتھوں خود میں پہنچا ضرر دل کو آنکھوں نے پھنسا یا کیا مگر
 یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے

ہو چکا ظاہر دعاؤں کا اثر سب تھے مصروف دعا شام و سحر
 شاد پھرتے ہیں طبیب اور چارہ گر شاہ کے ہے غسل صحت کی خبر
 دیکھئے کب دن پھریں حمام کے

پوچھ لو مزار سے اپنا مشغلا شغل ہو سکتا ہے کیا بے کار کا
 روگ ہی کچھ دل کو بیڑھ بگ گیا عشق نے غائب نکما کر دیا
 ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

سے مرزا لکھتا ہے ”بھائی محمد بن اب کچھ باقی نہیں ہے۔ برسات کی معیبت گزر گئی لیکن بڑھا پے کی
 شدت بڑھ گئی تمام دن پڑا رہتا ہوں بیڑھ نہیں سکتا ج ضعف نے غائب نکما کر دیا۔“

اسی طرح دہلی سوسائٹی کے جلسے میں اپنا ایک مضمون پڑھا۔ فرماتے ہیں: ”لوڑھا ہوں نا توں ہوں
 راج اکر پوچھئے تو نیم جاں ہوں“ ضعف نے غائب نکما کر دیا۔ ”ربا ص الدین امجد نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میں
 نے یہ شعر ان کے سامنے پڑھا ”عشق نے غائب نکما کر دیا“ تو فرمایا ”بھائی پیپ رہو۔ یوں کہو ضعف نے
 غائب نکما کر دیا۔ یاد ہرنے غائب نکما کر دیا۔ عشق کیسا عاشقی کا وہ زمانہ نہ رہا۔“

مولوی احمد حسن قنوجی کو لکھا ”یہ درویش گوشہ نشین تمہارا دوست اور تمہارا دعا گو ہے ام عشق
 نے غالب..... ہینسٹہ برس کی عمر ہوئی۔ اضمحلال قوی، ضعف دماغ، فکر مرگ، غم عینی جو مجھے
 آپ دیکھ گئے ہیں میں اب وہ نہیں ہوں۔“

ہر شجر نے نئی قبا پائی بوئے گل کو صبا اڑا لائی
گلِ نرگس نے پائی رعنائی پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے ہر وہ تماشا

ہے صفائی سمک سے تار سماک نظر آتے نہیں خس و فاشاک
ہر چمن ہے غبار و گرد سے پاک دیکھو اے ساکنانِ خطہ خاک
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

اوس کی ہے بہار سبزے پر گل چمکتے ہیں صورتِ اختر
کہتے بے ساختہ نہ پھر کیوں کر کہ زمیں ہو گئی ہے سترِ اسر
روکشِ سطحِ چرخِ مینائی

ابرِ باران سے آبِ باری کی قوتِ نامیہ کو حرکت دی
نظر آتی ہے شاخ شاخ ہری سبز کو جب کہیں جگہ نہ ملی
ہو گیا روئے آب پر کائی

سبز مخمل بچھائی سبزے نے کھل کھلاتے ہیں ہر طرف غنچے
پھول کئی شاخ شاخ پر بھولے سبزۂ وگل کے دیکھنے کے لئے
چشمِ نرگس ہوئی تماشا

بزمِ عالم ہے مے کرے کی نظیر جھوم کر چھا گیا ہے ابرِ مطہر
مست پھرتے ہیں سب صغیر و کبیر ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے بادِ پیمائی

شاد مرزا ہے ہر گھڑی غالب کہ دعا کارگر ہوئی غالب
عام ہے عیش و خرمی غالب کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب
شاہِ دیندار نے شفا پائی

۱۰۶

نہ چلی سحرِ بیانی میری ہیچ نکلی ہم سے دانی میری
بھول کر بات نہ مانی میری کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

دردِ دل اے ستمِ انگیر نہ پوچھ حالِ چشمِ غضبِ آمیز نہ پوچھ
زخمِ نوکِ مژدہ تیز نہ پوچھ غلشِ غمرہٴ خونریز نہ پوچھ
دیکھ خوں نابہِ فستانی میری

مجھ کو اپنا ہی نہیں ہائے خیال دوستوں تک تو کہاں جائے خیال
کس طرح ان کا مجھ اے خیال ہوں زِ خود رفتہ بہیر اے خیال
بھول جانا ہے نشانی میری

ہے حریف اپنا بھی کتنا بودا مجھ کو جس بزم میں پایا نہ جا
میری ہر بات میں ضد ہے گویا مشتابل ہے مقابل میرا
رک گیا دیکھ روانی میری

جبکہ نظروں میں سبک ٹھہرا ہوں کیوں ترسول پگراں اتنا ہوں
کیا حقیقت ہے مری میں کیا ہوں قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں
سخت اریاں ہے گرائی میری

کیوں نہ بے سائنتہ چکر کھاؤں گردشِ دہر سے ہے حالِ زبوں
غیر ممکن ہے کہ ٹھہروں دم لوں رگِ دبا دِ رہ بے تابِی ہوں
مصرِ شوق ہے بانی میری

موثر گافی کا مجھے دعویٰ تھا عقدہٴ مویں کمر ہی نہ کھلا
تھا غلط زعمِ ہمہ دانی کا دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا
کھل گئی پہنچِ مدانی میری

خط جو لکھتا ہوں تو خاص طور مار بات کرتا ہوں تو دیوانہ وار
کیا مجھے یاد کریں گے غمِ خوار کیا بیاں کر کے مرا رویں گے یار
مگر آشفتمہ بیانی میری

اے عبدالرزاق شاکر کے ایک خط میں تشریح کی ہے "تقابل و تضاد کو کون دہانے کا نور و ظلمت شادی و غم راح
رجح و جور و عدم لفظ مقابل اس معنی میں مراد ہے جیسے حریف کہ معنی دوست بھی مستعمل ہے غم و شغور
ہم اور دوست نہ رہنے کے خلاف و عادت ضد ہند گریہی وہ میری طبع کی روانی کو دیکھ کر رک گیا۔"

مثل مرزا ہوئی طاقت غائب قلب قابو میں نہ بس میں قالب
 خاک ہوں زلیست کا اپنی طالب کر دیا ضعف نے عاجز غالب
 تنگ پیری ہے جوانی میری

رگ رگ ہے مری نشترِ فساد کی بھوکی ہو جلد رواں تیغ یہ حسرت ہے گلو کی
 راحت ہے جراثیم کو روانی سولہو کی جس زخم کی ہو سکتی ہو تند بیر فرو کی
 لکھد بھو یارب اسے قسمت میں عدو کی
 وہ دن گئے تھیں خون کی جب اپنی گیس پُر اور آنکھ سے تھا خون کے اشکوں کا قاطر
 خونِ جگر و دل تو ہوا رزقِ نفسِ کر اچھا ہے ہر انگشتِ حسائی کا تصور
 دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی
 ناحق ہے قیامت کا تھیں خوف ابھی سے کچھ ظلم بھی کرتے ہو تو سہمے ہوئے جی سے
 کرنے دو اگر کرتے ہیں شکوہ یہ کسی سے کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے
 یاں تو کوئی سنتا نہیں فریادِ کسو کی
 جب نہ کیا ہو ترے تیروں نے ادھر کو کاٹا نہ ہو شمشیر نے سودا بھرے سر کو
 کیا لطف ملے زلیست کا پھر ایسے بشر کو دشمن نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو
 خیر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

مرزا غم دنیا سے رہا موت کا طالب چاہا کہ کرے ترک کہیں جان یہ قالب
حاصل ہوا مطلوب نہ بڑے مطالب صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب
حسرت میں رہے ایک بتِ عربہ جو کی

(۱۰۸)

حسن ہی کا دل کو سودا چاہیے اشتیاقِ روئے زیبا چاہیے
رات دن شوقِ تمنا چاہیے چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے
نشم ہوتا ہے کب ان کو اس قدر کچھ نہ ساقی کے سوا اے نظر
لاکھ یہ پیتے رہیں اٹھوں پہر صحبتِ زنداں سے واجبِ حذر
جائے اپنے کو کھینچا چاہیے
پاکے ٹرہ چاد کا دل ہے خجل ہو گیا ہے درد و غم سے مضحل
اب تو یہ ہے اور دردِ جاں گسل چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے
مجرموں سے پردہ ہے دیوانگی یہ تنہا فراور یہ ہم خانگی
ہم سے چھپنا ہے کوئی فرزانگی دوستی کا پردہ ہے بے گانگی
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

موت کا پاتا ہوں جو یا غیر کو رشک نے میرے ڈھویا غیر کو
رات دن کا غم ہے گویا غیر کو دشمنی نے میسری کھویا غیر کو
کس قدر دشمن ہو دیکھا چاہیئے

پند میں نا صبح نے بھی کر لی ہے سعی قید سے یاروں نے کیا کم کی ہے سعی
بار بار ہم نے بھی کر دیکھی ہے سعی اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی
یار ہی ہنگامہ آرا چاہیئے

کب ہے مایوسوں کو امید نوید گوش زد ہوان کے کیونکر یہ نشید
کچھ نہ پوچھو حسرتوں کا اپنی بھید منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا امیدی اس کی دیکھا چاہیئے

ہیر زن نادم نئی اپنے قصہ سے منہ نہ تھا کیا اس کا کروہ یوسف کو لے

۱۷ فاطمہ صاحبہ نے منشی بی بخش حقیر کو ۱۸ جنوری ۱۸۵۷ء کے خط میں لکھا: ”کیا کروں؟ مفت غمزہ اور
ملول رہتا ہوں۔ مجھ کو اب اس شہر کی اقامت ناگوار ہے اور موانع و حوائق ایسے فراہم ہوئے ہیں کہ نکل نہیں سکتا
خلاصہ میرے رنج و الم کا یہ ہے کہ میں صرف مرنے کی توقع پر جینا ہوں۔“

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید نا امیدی اس کی دیکھا چاہیئے
یہ شعر مرزا یوسف کو بھی ایک خط میں لکھا ہے: ”ہاواہ ازمیں چودھری عبدالغفور کے خط میں ضاع الم بارہوی
کو غائب کر تے ہوئے لکھا ہے: ”حضرت پرچ تو یوں ہے کٹم ہائے روز گار نے مجھ کو گھبرایا ہے سانس نہیں لے سکتا
اٹانگ کر دیئے ہر باب کو طرح سے خیال میں آئی پزل نے کسی طرح تسلی نہ پائی۔ اب باتیں سوچتا ہوں ایک تیر کہ
جب تک جیتا ہوں یوں ہی رویا کروں گا دوسری یہ کہ آخر ایک نہ ایک دن مرنے لگا یہ صغریٰ و کبریٰ دل نشیں ہے تیرا سکا
سکھن ہے، یہ بات۔“ منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید: نا امیدی اس کی دیکھا چاہیئے۔“

آ رہی تھی یہ صدائے غیب اسے غافل ان مرہ طلعتوں کے واسطے
 چاہنے والا بھی اچھا چاہیے
 یہ ضعیفی اور تلاشِ خال و خد جستجوئے نازنینِ سرو قد
 اس جنوں کی بھی ہے مژا کوئی حد چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد
 آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

کس طرح طے ہو رہے عالمِ امکان مجھ سے میں تھکا ماندہ ہوں اور دوسرے جاناں مجھ سے
 ذرہ ذرہ دم و حشر ہر گریزاں مجھ سے ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے
 میری رقتا سے بھاگ ہے بابا بل مجھ سے
 جبکہ دیباچہ سے کھلتے ہیں مضامین بیکہ پکار رہے فرصت ہے کسے بیٹھ کے دیکھے دفتر
 اور ہی دھام میں الجھی ہوئی ہے اپنی نظر درجہ عنوانِ تماشا بہ تغافل خوشتر
 ہے نگہ رشتہ شہیدانہ شرکاں مجھ سے
 کیا کہوں کیسے بسر ہوتی ہیں غم کی راتیں میرے سامنے بیاں کی مجھے تکلیف نہ دیں
 بیکسی کا مری اندازہ اسی سے کر لیں وحشتِ آتش دل سے شب تنہائی میں
 دود کی طرح رہا سایہ گریزاں مجھ سے
 میرے نام میں وہ جب ٹھہرے گریاں پھر خود آرائی و زینت کا وہ سامان کہاں

مٹ گئی سرم کی تخی پر کہ میں شک وں غم عشاق نہ ہو سادگی آموز بتاں
کس قدر فائدہ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

چونکہ ہے درخت مے پاؤں سے آغوشہ نخل ڈسے ڈسے کو یہ دعویٰ ہے کہ میں فخر ہوں
کیوں چمکتے ہوئے چھالوں کو جو اہر نہ کہوں اثر ابلہ سے جاوہ مصرائے جنوں
صورتِ رشیدہ گو ہر ہے چراغاں مجھ سے

کاش ہر اک شب غم میں یہی بے ہوشی ہو تاکچہ آرام سے یہ ہوش باگز لے تو
اس نے تو خوب ہی پہنچائی ہے راحت دلکو بے خودی بستر تمہیدِ فراغت ہو جو
پڑ ہے سایہ کی طرح میرا شبستان مجھ سے

منہم قتل پہ ہیں آنکھ کے ارماں سارے کٹے ستریز نظر ہو تو کروں نظائے
تبع گل گیر سے کم مجھ کو نہیں ہے پیاسے شوق دیدار میں گرتو مجھے گزن مالے
ہونگے مثل گل شمع پریشناں مجھ سے

کیا شبِ تانے ڈھائی ہے قیامت ہے چھوڑ دی سایہ نے بھی میری رفاقت ہو
کتنی پر خوف ہے منزل کہہ فرقت ہے بیکی ہائے شبِ ہجر کی وحشت ہے
سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

بادِ حسن سے غیروں کو تو یوں مست کرے تشنہ لبہ رہی دیدار کے جو طالب تھے
خوب انصاف کیا ساقی مہوش تو نے گردشِ ساغرِ صدفِ جلوہ رنگیں تجھ سے

آئینہ داری یک دیدہ حیراں مجھ سے
 آگ وہ سید نہ زائیں بھڑکتی ہے آئندہ
 دل میں بھی آتش جاں سوز دہکتی ہے آئندہ
 دیکھ کر برق جسے دور کر گئی ہے آئندہ
 نگہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے آئندہ
 ہے چراغاں خس و خاشاک گلستاں مجھ سے

۱۱۰

دل میں وہ درد کو اسکو دکھائے نہ بنے
 حال اپنا وہ زبوں جسکو چھپائے نہ بنے
 بار غم میں وہ گرانی کا اٹھائے نہ بنے
 نکتہ چیں ہے غم دل اسکو سنائے نہ بنے

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

گو بظاہر نہیں کچھ اس کا بلانا مشکل
 ڈر مگر یہ ہے کہ ہٹ میں ہے وہ اپنی کامل
 کہیں ہونا نہ پڑے اسکے نہ آنے سے خجل
 میں بلاتا تو ہوں اسکو مگر اسے جذبہ دل
 اس پر بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

لذت تیرے روجھا کو کہیں وہ شوخ نہ پائے
 ضد نہ چڑھ جائے کہیں ایسی کہ بھر دل دکھائے
 ہاتھ دانستہ کہیں ظلم سے ظالم نہ اٹھائے
 کھیل سمجھا کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے

کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

خود تو رسولے جہاں ہر ہی یہ بد ذات مگر
 نیک نامی کو کہیں تیری نہ پہنچائے ضرر
 راز داری کے کہتے ہیں اسے کیا خبر
 غیر بھڑتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے
 « شاخ ہی تنگ ہے گل تر کا شکفتہ رہنا ہاتھ نکلی چلیں کا پڑا اور وہ پڑ مردہ ہوا
 چشم بد دور وہ نازک میں کہیں گل سے سوا اس نزاکت کا بُرا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا
 ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے
 نور یہ مہر میں یہ مہ میں ضیا کیسی ہے کس کی بو ہر گلِ نو خاستہ میں مخفی ہے
 ہر طرف طرف تماشاے نظر بندی ہے کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
 پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے
 غم سے گھل کر جگر دِل کے اشکوں میں ہے میں نے اب تک تو ستم وعدہ خلا فی کے ہو
 منتظر کیوں ہوں تمہارا کوئی اب لاکھ کہے موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بنائے نہ ہے
 تم کو چاہا ہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

۱۔ اس شعر کی تشریح غالب صاحب نے نثر نبی بخش حقیر کو اس طرح لکھی ہے ”بھائی مجھ کو تم سے بڑا تعجب ہے کہ اس
 بیت کے معنی میں تم کو تامل رہا اس میں دو استقامت آئے ہیں کہ وہ بطریق طعن و تعریف معشوق سے کہے گئے ہیں
 موت کی راہ نہ دیکھوں۔ کیوں نہ دیکھوں؟ میں تو دیکھوں ہی گا کہ بنائے نہ ہے کیونکہ موت کی شاخ میں سے یہ
 بات ہے ایک دن آئے ہی جی انتظار ضائع نہ جائے گا۔“

تم کو چاہوں، کیا خوب کیوں چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے یعنی اگر تم آپ سے آئے تو آئے اور اگر نہ
 آئے تو پھر کیا حال کہ کوئی تم کو بلائے گا یا یہ عاجز معشوق سے کہتا ہے کہ اب میں تم کو چھوڑ کر اپنی موت کا عاشق
 ہوا ہوں۔ اس میں خوبی یہ ہے کہ بن بلائے بغیر آئے نہیں رہتی تم کو کیوں چاہوں کہ اگر نہ آؤ تو تم کو بلا نہ سکوں۔“
 یہ غزل غالب صاحب نے غنشی نبی بخش حقیر کو اس غزل کے ساتھ جس کا مطلع ہے
 کہتے تو ہو تم سب کہ بہت غالب تو آئے اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ ”وہ آئے“

اس سال کی تھی۔

ہیں برے بیچ میں تقدیر سے ہم آگے ہوئے بات بنتی نظر آتی نہیں تدبیروں سے
کر دیا ہے ہمیں مجبور بہت قسمت نے بوجھ وہ سر سے گرے کہ اٹھائے نہ اٹھے

کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے
عشق کی خاک کرے کوئی ستائش غالب الاماں قہر ہے اس برق کی تابش غالب
بارہا کی ہے یہ منزل گزاریں غالب عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

آیا مرزا کو جسے دیکھتے ہی غش غالب تم نے دیکھا نہیں وہ شعلہ کمرش غالب
بابا الفت میں عبت تم ہو مشغوش غالب عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے



شبِ فراق میں اجت وہ بے حساب دے لگی ہر آگ جو سینہ میں اس کو آب تو دے
نجات غم سے وہ پڑھ نہیں شتاب تو دے وہ آگے خواب میں تسکین اضطراب تو دے
وہ مجھے تپشِ دلِ مجالِ خواب تو دے

جوابِ غیظ و غضب سے ہر ایک کو دینا ہر ایک کو ہیں دونوں جہاں سو کھود دینا
وہ بھر کے سانس جگر میں چھری چھود دینا کرے ہے قتلِ رگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

لے حاشیہ ص ۲ پر

لنگے منہ سے عطا کوئی جام کریم کو امیدوار نہ یوں صبح و شام کریم کو
جواب تلخ ہی سے شاد کام کریم کو دکھائے جنبش لب ہی تمام کریم کو
نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

خیال چھوٹ سے بچنے کا ہے نہ عادت ہے نہ اجتناب کسی سے نہ کچھ عداوت ہے
ہمیں سے اک تجھے پرہیز اور کراہت ہے پلائے اوک سے ساقی جو ہم ک نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

شب اسکی بزم سے اغیار یوں ملول گئے کہ پاؤں ٹھگئے اور چو کڑی وہ بھول گئے
قبول خدمت مزا ہوئی وہ غول گئے اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے مے ہاتھ پاؤں داب تو دے

حاشیہ ص ۱۲۱۔ اس غزل کے بارے میں مرزا علاؤ الدین کوثر نے فلق کے ساتھ لکھا ہے پچاس برس کی بات ہے کہ انہی بخش خاں مرحوم نے ایک زمین نئی نکالی میں نے حسب انکم غزل لکھی۔ بیب الغزل یہ ہے پلائے لوگ سے اسد خوشی ... ۱۰۶ اب میں دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے نکھ کر اس مطلع اور اس بیت الغزل کو شامل ان اشعار کے کر کے غزل بنالی ہے اور اسکو لوگ گاتے پھرتے ہیں مقطع اور ایک شعر میرا اور پانچ شعری اتوکے جب شاعری زندگی میں گائے والے شاعر کے کلام کو مستخرج کر دیں تو کیا بعید ہے کہ وہ شاعر متوفی کے کلام میں مطربوں نے غلط کر دیا ہو۔

اس مقطع سے متعلق ایک لطیفہ بھی ہو سکتا ہے غالب صاحب ایک مرتبہ پٹنک پر پڑے ہوئے کو کہہ رہے تھے۔ مہر مہری پاؤں دباے لگے غالب صاحب نے کہا بھئی تو سید زادہ ہے مجھے کیوں گناہ گار کرتا ہے۔ انھوں نے مانا اور کہا ”آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو میرا بے کی اجرت دے دیجئے“ غالب صاحب نے کہا ”ہاں اس کا مضائقہ نہیں“ جب وہ پیراب چلے تو اجرت طلب کی۔ غالب نے کہا ”بھئی کیسی اجرت تم نے میرے پاؤں دباے میں نے تمہارے پیسے دباے“

ادھر نہ گفتہ بہ حال ہوں و خوارِ بستر ہے ادھر مجھے تن خود میسے حق میں خارِ بستر ہے
دل بیتابِ مضطرب باعثِ آزارِ بستر ہے تپشِ گمیری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے

مرامِ رنجِ بالش ہے مرا تن بارِ بستر ہے

حقیقتِ اشکِ اورل کی تم سہ کیا کہیں ہے مگر ہاں مختصرن لو کہ وہ کیا شے ہے یہ کیا شے
ہمائے نازِ پردوں میں ہیں و نونِ راک ہے سرکشِ سرِ بحرِ دادہ نورِ العینِ امن ہے

دلِ بے دستِ پُراقتادہ بر خوارِ بستر ہے

نہے قسمتِ کرمِ یوں بے بلائے میسے گھر آؤ مے بیتِ لُحزن کے جاگ اٹھے نہ نصیبِ ابتو
مرضِ کا اپنے بڑھ جانا مبارک ہو گیا مجھ کو خوشا اقبالِ بخوری عیادت کو تم آئے تو

فروغِ شمعِ بالیس طالعِ بیدارِ بستر ہے

ہوا اندھیر گھر میں کیا بلا وقت کی رات آئی در و دیوار پر ہے کس غضب کی تیرگی چھائی
مگر ہاں گھر: بستر کی بدلت روشنی پائی بہ طوفانِ گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی

شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

خدا کا شکر ہے تقدیر ہے جاگی ہوئی اپنی پھر اسکے خواب میں آنی کی حسرتِ یوں بین ہوئی
بتائیں کیا ابھی کل ہی تو وصلِ یار کی شب تھی ابھی آتی ہو بالمش سے سکی زلفِ مشکیں کی

ہماری دیدہ کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

ہوا ہے مبتلا مرزا عجب آزار میں غالب رہا کچھ بھی نہ باقی اسکی جانِ ناز میں غالب
 نہیں ٹھٹھنے کی بھی طاقت اکنِ باریں غالب کہوں کیا دیکھی کیا حالت ہر بحرِ یار میں غالب
 کہ بے ثباتی سے ہر اک تارِ بسترِ خارِ بستر ہے

۱۱۳

بہی ہر بات اہنگ تو کہیں اُن یں نہ ہو جائے محبت کی جگہ نفرت تجھے پُرفن نہ ہو جائے
 رہا غرہ تو میرِ نفس ہی رہن نہ ہو جائے خطر ہے رشتہ الفتِ رگِ گردن نہ ہو جائے
 غرورِ دوستی آفت ہے تو دشمن نہ ہو جائے
 کمالِ فصلِ گل کہتے ہیں سکو مرزا غالب کہ ہو ہر ہر شجر پہنے ہوئے گل کی قبا غالب
 سرگلبن کھلیں دو چار گل تو کیا مرزا غالب سمجھ اس فصل میں کوتاہی نشوونما غالب
 اگر گل سرو کے قامت پہ پیرا یں نہ ہو جائے

۱۱۴

کیا جانے اصول ہے نہیں ہے آہنگ بھی کوئی طے نہیں ہے
 باقاعدہ کوئی شے نہیں ہے فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
 نالہ یا بندِ لے نہیں ہے
 گلشن کو غرض نہیں جو سے کیا معنی ہیں پھر کہنے کے

کشکول کا کام کیا نہ لیں گے کیوں بوتے ہیں باغباں تو بنے
گر باغ گدائے میں نہیں ہے

جود تیرا ہی چار سو ہے ہر ایک کو تیری جستجو ہے
تجھ سے ہی گلوں میں رنگ و بو ہے ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے
پر تجھ کی تو کوئی شے نہیں ہے

بے جا بے خودی و خود پرستی ایک وہم و خیال ہے یہ بستی
لاشے ہے یہ اوج اور پستی ہاں کھا میو مست فریب ہستی
ہر چند کہیں کہے نہیں ہے

پیوستہ ہر ایک شے بے ضد ہے ہوتی ہے نشاط بعد غم کے
خواہاں بے اگرالم سے چھوٹے شادی سے گزر کہ غم نہ ہووے
ار دی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے

کچھ وہم مگر تجھے ہے زاہد انکار شراب سے ہے زاہد
ملتی یہ شے کسے ہے زاہد کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد
مے ہے یہ نگس کی قے نہیں ہے

مرزا ترا ہم قدم ہے غالب دھیان اس کو یہ دمدم پر غالب
دم کہتے ہیں جس کو دم ہے غالب ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب
آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

کچھ رشک قیبوں ہی سے تنہا نہیں کرتے اپنی بھی نظر سے انھیں دیکھا نہیں کرتے
جان لے جو لب پر کھٹی تو پروا نہیں کرتے ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں ولے ان کی تمنا نہیں کرتے

وہ غیر جو کہتے ہیں یہ کہنا ہے زبانی لیکن ہے رقیبوں سے رکاوٹ کی نشانی
ہم سے کوئی آسان ہویوں بات بنانی درپردہ انھیں غیر سے ہے ربطِ نہانی
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پروا نہیں کرتے
قابو نہ کسی شخص کا تم پر ہے نہ بس ہے مانو تو یہ مہر کی نصیحت تمھیں بس ہے
باز آؤ اگر مہر و وفا سے تمھیں مس ہے یہ باعثِ نومیدی اربابِ ہوس ہے
غائب کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

مرے سببِ یخستہ فلک ہے کیا کیئے غریب کشتہ تیغِ نظر ہے کیا کیئے
فریبِ حسن سے یہ بے خبر ہے کیا کیئے دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کیئے
ہو ارقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کیئے

اے غالب صاحبِ منشی ہی بخش حق کو گدھا کر بھائی یہاں بادشاہ نے قلم میں مشاعرہ مقرر کیا ہے ہر مہینے میں دو بار
مشاعرہ ہوتا ہے پندرہویں کو اور انیسویں کو حضورِ فارسی کا ایک مصرع اور ریحی کا ایک مصرع (باقی ص ۱۱۷ پر)

بدن سے جان کی طرح جائے بن نہ رہے فراق جسم کا صدمہ اٹھائے بن نہ رہے
مگر ہیں تو یہ پھر بھی ستائے بن نہ رہے یہ ضد کہ آج نہ آئے اور آئے بن نہ رہے
قضا سے شکوہ ہیں کس قدر ہے کیا کہیے

ضرور ہے کوئی موجودگی کا اسکی سبب اسی کو گشت میں پایا وہاں گئے ہم جب
کچھ اور نقل ہی اس کو نہیں ہے روز و شب ہے ہر یوں گروہیگہ کہ کوئے دوست کو اب
اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہیے

ہم آئے سر پہ تھا جنک شباب کا اسیدب نہ راہ عشق کا سو جہا کہی فراز و نشیب
اس اک گمان سے حاصل نکل کو شکر و کسب نے کرشمہ کہ بوں نے رکھا ہے ہم کو فریب
کہ بن کہے ہی انھیں سب خبر ہے کیا کہیے

ہم آئے درد و الم کا ہوا کہ ان کو خیال بلا کے گھر کبھی پوچھی نہ وہ رنج و ملال
وہ بے کچھ نہیں یہ ہے ایک ان کی چال سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پریش حال
کہ یہ کہے کہ سر رہ گزر ہے کیا کہیے

تمھارے انس و محبت کا عجوب احوال کہ بات بات میں ہر دو مستوں رنج و ملال
تھیں سے ہم کی اگر ہوں تو ہونا ہال تمھیں نہیں ہے سر رشتہ وفا کا خیال

بقیہ ص ۲۰ کا مطلق کرنے ہے۔ ایک تادی اتالی کی تیسویں کو جو مشاعرہ ہوا کہیں مصرع فارسی یہ تھا کہ
زیں تماشا گاہ گرماں فارود۔ یہی مصرع یہ تھا کہ خمار عشق ہوں کہ نہ دے کیا کہیے۔ نظر ہے کیا کہیے خبر کیا کہیے۔
میں نے ایک غزل ندر کی اور ایہ۔ یہی وہ موافق طرح کے اور دو سوار غزل ای طرح میں سے ایک اور صورت
ذکاں کرئید وہ تینوں غزل میں تم کو کھنا ہوں یہ طرح لینا اور میاں تفتہ کو بھی دکھالینا۔

ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا کیئے
 کبھی کیا بھی جو کچھ عرض حالِ دل ہم نے
 تو مسکرا کے کہا کیوں ہونے ہو دیوانے
 فضول ہو جائے ہر وقت دو بدوان سے
 انہیں سوال پر زعم جنوں ہے کیوں لڑیئے
 ہمیں جواب سے قطع نظر ہے کیا کیئے
 کسی کو ہم سے اگر رشکِ فن ہے کیا کیئے
 حسد کی آگ اگر شعلہ زن ہے کیا کیئے
 جہان کی یہی رسم کہن ہے کیا کیئے
 حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیئے
 تم بہا لے متارِ ہنر ہے کیا کیئے
 کٹے جہان میں مرزا بہ مشکل اس کے دن
 نہزار عیب لگاتے ہیں اس کو بد باطن
 بُرا بُرا اسے کہتے ہیں سب جوان و مُسن
 کہا ہے کس نے کہ غالب بُرا نہیں لیکن
 سوائے اس کے کہ آشفۃ سر ہے کیا کیئے

جب تلک آزاد تھا کب تھی پریشانی مجھے
 کچھ نہ کر زنداں میں لائی میری جولانی مجھے
 تخی عدم میں ہر طرح حاصل تن آسانی مجھے
 دیکھ کر در پردہ گرم دامنِ انشانی مجھے
 کر گئی وابستہ تن میری عربانی مجھے
 یوں مرا سینہ دہائے وہ مری قسمت کہاں
 اور کیا اسکے سوا ہے خوش نصیبی کا نشان
 اور گلے پر اس کے ہاتھوں سے ہولیوں خجرواں
 بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں

مرحبا میں۔ کیا مبارک ہے گراں جانی مجھے

رات دن اتنے اسکا تصور پہلے پہلے مجھ کو عرض حال میں مانع نہیں بھر کوئی شے
ہوں سی دھن میں ہی مجھ کو لگی رہتی ہے کیوں نہ ہو بے التفاتی اس کی خاطر جمع ہے

جانتا ہے جو پرستہاے پہنانی مجھے

میری بربادی تو قدرت نے تقدیر کی ہی تھی اس پر طرہ یہ ہوا گھر کی بلا سر پڑ گئی
یہ ہوئی اچھی عنایت کاتب تقدیر کی میرے غم خانے کی قسمت جب تم ہونے لگی

لکھ دیا منجملہ اسباب ویرانی مجھے

ملتی جلتی ہے فغاں اسکی مری فریاد سے شوق سے سنتا ہوں اپنا ہم نوا پا کر اسے
ڈال رکھا ہے پریشانی میں اسکے دم نے بدگماں ہوتا ہے وہ کافر نہ ہوتا کاشکے

اس قدر ذوق نوائے مرغِ بستانی مجھے

چرخ کے ہاتھوں پہ پایا چین میں جہنگ حیا داؤں جب اس کا چال کچھ مہی مجھ پر کیا
تنگ آکر زسیت سے جامِ اہلِ آخر پیا ولے واں بھی شورِ مٹرنے نہ دم لینے دیا

لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

برِ رقیبِ روسیہ لیوں ہی اگر دمسائے جھوٹ پر رغبت دلائیگا کہ تو دُعا مبارک ہے
منتظر رکھنا کسی کو یہ بھی کوئی ناز ہے وعدہ آئے کا وفا کیجئے یہ کیا انداز ہے

تم نے کیوں سوچی ہے میرے گھر کی دہانی مجھے

چاہئے بھائی سے یوں بھائی کو مرزا دوستی ہو جو اس کو خیر تھی تو خیر تھی ہو اس کو بھی

جس طرح غالبؔ کی اس شعر میں ظاہر خوشی دی مرے بھائی کو حق نے از سر نو زندگی
میرزا یوسف ہے غالبؔ یوسف ثانی مجھے

۱۱۸

خود فراموشی ہوئی وقتِ مسرت کب مجھے دل ہی جنال ہو پھر فرحت کیا مطلب مجھے
لب پر اس کا نام تھا کچھ درد پہنچا جب مجھے یاد ہے شادی میں بھی ہنگامہ یارب مجھے
بسوزِ زاہد ہوا ہے خندہ زیر لب مجھے

کہہ گیا دل رفعِ دل سے ہو گیا رنج و عن کر رہا ہے پرسشِ احوال ہر غمچہ دہن
باتِ بنجائی پر ہوتا ہے جو کوئی حرفِ زن ہے کشادِ خاطر والستہ در رہن سخن
تھا طلسمِ قفلِ ابجد خانہ مکتب مجھے

اک طرف چپکا پڑا تھا کیا نے ننداں میں تھے کیوں نہ آئیں یادِ رہ کر وہ ن آرام کے
دہلت اب ام بھر نہیں آوارگیِ دشت سے یارب اس استغنیٰ کی داؤد کس سے چاہیے
رنگِ اسایش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

راتِ بستی بڑا نکسوں وال ک جوئے خوں حال دل بھی ہو گیا ہے کثرتِ غم سے زبوں
غمگیزی پر کمرِ اس ذوق کا خاکِ رہ ہوں طبع ہے مشتاقِ لذتِ ہائے حسرت کیا کرو
آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

جھوٹے فرماتے تھے طنز کیوں تم ایسے ہو گئے کیا ہوا مژدہ تمہیں دیوانے کس کو ہو گئے

اب تو صرت کیلئے موزوں فقرے ہو گئے دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہو گئے
عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

کمالِ علم اہلِ انجن کی آزمائش ہے ہنر کا امتحاں ہے اہل فن کی آزمائش ہے
ہراکِ نو مشق و مشتاق کہن کی آزمائش ہے حضورِ شاہ میں اہل سخن کی آزمائش ہے

چمن میں خوشنویاں چمن کی آزمائش ہے
معن میں ہر گرفتارِ معن کی آزمائش ہے گداز و سوز میں شمعِ لگن کی آزمائش ہے
قفس کی قید میں رخِ چمن کی آزمائش ہے قد و گیسو میں قیس و کوہن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

کہیں ایسا نہ ہو محنت ہو اسکی رائیگاںِ آخر نہ جوئے خوں ہو جوئے شیر کے بلے رواںِ آخر
غمِ شیریں ہے گا کس طرح وہ نیم جاںِ آخر کریں گے کوہن کے حوصلے کا امتحاںِ آخر
ہنر اس خستہ کے نیرے تن کی آزمائش ہے

سنا ہے اس نے کب یعقوب کی آہ بھر گاہی سنگھا کر بوئے یوسف اس نے کب اسکی خوشی چاہی
ہوئی چراہی مطلب کے کنگال کی نظرِ آہی نسیم مصر کو کیا پیر کنگال کی ہوا خواہی
اسے یوسف کی بوئے پیر بن کی آزمائش ہے

یہ کیا کرتے ہو تم ضبط و تحمل کے غلط دعوے یقیں جاؤ کہ ہوشِ ڈھانسیں جب اسکو دکھو گے

جسے دعویٰ ہوا اہل بزم میں بے سنبھل بیٹھے وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کرا غافل تھے

شکیب و صبر اہل انجن کی آزمائش ہے

نشانے دو ہیں جسکو بھی اڑا دے اسکا تیرا کر تو پھر شک و راندازی میں اسکی کیجئے کیونکر
کماں کو کھینچنا ہی اسکا اک احسان ہر دم پر ہے دل ہی میں تیرا چھاجر کے پار ہو بہتر

غرض شست بہت ناوک فلن کی آزمائش ہے

بظاہر تو یہ دونوں ایک ہی بت کہیں دانی مگر رسم پرستش مختلف دونوں ٹھہرائی
عبث گردن ہر اک زشتہ الفت میں ٹھہرائی نہیں کچھ سحر و زنا رکے پھندے میں گیرائی

وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

نتیجہ نا شکیبائی کا آخر کیا ہے لے غافل تر پنے سے کہیں آسان ہو سکتی ہے یہ مشکل
نہ ہو جائے کہیں تجھ پر کوئی تازہ بلانا زل بڑا رہ لے دل البستہ بیتابی کو کیا حاصل

مگر پھر ناب زلف پر شکن کی آزمائش ہے

ہمارا قصہ تھا پکھیں کسی نہ بھی اس دم کو مزہ لینے نہ پائے خود بخود گھٹنے لگے ہم تو
زباں کا ذکر کیا اسکا اثر آگے تو بڑھنے دو رگ و پے میں جیا تنے رہم تب دیکھئے کیا ہو

ابھی تو تلخی کام و دہن کی آزمائش ہے

سنا تو ہے انھوں نے ارادہ کر لیا غالب کہ وہ مرزا سربانندھیں عہد ہیمان فاغاب
مگر اب دیکھئے یہ چرخ لائے رنگ کیا غالب وہ آئینے مے گمر، وعدہ کیسا، کھینا غالب

نئے فتنوں میں اب جہر خ کہن کی آزمائش ہے

اگر وہ روٹھنا ہو کب مٹایا جائے ہر مجھ سے
سرمہ مل بھی جانتا ہے تو کنیا جائے ہر مجھ سے
غرض جتنا بنا تا ہوں بگڑتا جائے ہر مجھ سے
کبھی نیکی بھی اسکے جی میں گر جائے ہر مجھ سے
جفا میں کر کے اپنی یاد تیرا جائے ہر مجھ سے

نظر آتا ہے خواب وصل تو تعبیر لٹی ہے
بگڑتا ہے بنگر کام کیا تقدیر لٹی ہے
مرے سب کام لٹے ہیں مری تدبیر لٹی ہے
خدا یا جذبہ دل کی مرے تاثیر لٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں وہ کھینچتا جائے ہر مجھ سے

اسے کیونکر سناؤں حال دل پر سخت حیرانی
پریشانی کا مضمون وریاں میں پریشانی
کھلائے دیکھئے کیا گل میسے قاصد کی ندوانی
وہ بدخوا اور میری داستان عشق طولانی
عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہر مجھ سے

یہ میری سرگزشت ان کیلئے جھوٹی کہانی ہے
انہیں سننے کو نفرت پر یہاں طلی سانی ہے
مجھے دشوار اپنے دل کی کیفیت سنانی ہے
ادھر وہ بدگمانی ہے ادھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہر ان سے نہ بولا جائے ہر مجھ سے

ہماری زلیست امید تصور کی بدولت ہے
قضا کا سامنا ہو کیا بلا ضعف و نقاہت ہے
خیالی زندگی پرور نہ کیا جینے کی صورت ہے
سنبھلنے دے مجھے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ داماں خیالی یا رچھوٹا جائے ہر مجھ سے

گوارا دل کو یک پر کر دیکھیں سکو انس جن تقاضا رنگ کا یہ ہے وہ آنکھوں میں ہو سکن
 وہ جب جلوہ نما ہو گا تو ہو گا حشر کا وہ دن تکلف بر طرف نظارگی میں بھی بھی نہیں
 وہ دیکھا جائے کب ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

بمچہ کھاتھ میں نے عشق کو اک لگی دل کی کہاں کی دل لگی یہ تو مصیبت پڑ گئی ابھی
 خبر کیا مجھ کو اس کی معرکہ آرائیوں کی منتی بھٹے ہیں پاؤں ہی پہلے برد عشق میں زخمی
 نہ بھاگا جائے ہر مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

مجھے آتا ہے یہ خواب پریشاں کیا نظر غالب بنے گی دیکھئے کیسی دل بیتاب غالب
 نہ کیوں اس شکستہ ہونوں مرزا کا بلکہ غالب قیامت ہر کہ ہوئے مدعی کا ہم سفر غالب
 وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہر مجھ سے

گردش میں جو ہے گنبدِ خرامے آگے فانوسِ خیالی کا ہے نقشِ خرامے آگے
 ہے ارض کو اک گیند کا رتبہ آگے بازیچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے
 ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک بلب ہے گنبدِ گرداں مرے نزدیک دُکے سے بھی کتر ہے بیاباں کے نزدیک
 ہے شعبہ نیرنگیِ دوراں مرے نزدیک اک کھیل ہے اورنگِ سلجاں کے نزدیک
 اک بات ہے اعجازِ مسحارے آگے

عواض ہیں اوہام تو اجسام ہیں مستور
جز نام ہی نام انکا حقیقت کو ہیں سب دور
ہر رنگ میں موجود ہے صرف ایک وہی نور
جز وہم نہیں ہستی اشیاء کے آگے

اڑتا ہے بیابان کا خاک مارے ہوتے
اٹھتا ہے بگولے پہ بگولہ مارے ہوتے
اشکوں سے ہر سیلاب کا نقشہ مارے ہوتے
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرے مارے ہوتے
گھستتا ہے جہیں خاک پہ دریا مارے آگے

دیکھ تو کوئی دل کا ٹرنا ترے پیچھے
کیا کیئے گزر جاتی ہے کیا کیا ترے پیچھے
جینا مجھے دشوار ہے گویا ترے پیچھے
منت پوچھ کہ کیا حال ہر میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مارے آگے

حاشیہ ص ۲۱۳ کا :- اور ایک سلیمان حضرت سلیمانؑ کا تخت حضرت سلیمانؑ ایک بیگز گزے ہیں۔ انکی بادشاہت
بنی نوع انسان برہی نہ تھی مگر جبرئیل اور حوین پر بھی انکی فکر مس مٹی اور حوین کی مدد سے انکا تخت ہوا میل اڑتا تھا۔
اعجاز کیا۔ عیسیٰؑ کے معجزے صحرے مٹی بھی ایک۔ عیسیٰؑ کے معجزے انکے معجزے اور کمالات بہت تھیں۔ انکا ایک
معجزہ یہ بھی تھا کہ وہ اپنی بیوی کو سے مردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے

سلیمانؑ کا تخت میرے نزدیک ایک کھیل کی حیثیت رکھتا ہے اور حضرت عیسیٰؑ کا معجزہ میرے آگے ایک
معمولی کی باس ہے یعنی شاہانہ توکس اور پیغمبرانہ معجزے میری نظر میں کچھ بھی نہیں ہیں۔

اس غزل کے متعلق منشی ثانی محسن حسیہ کو لکھتے ہیں در بامہ آگے، صحرے آگے اس پر بھی ایک سال گزر چکا ہے
قلعہ مبارک کے مشاعرے کی غزل ہے یہ دہلی اردو اخبار میں اس تمہید کے ساتھ بھیجی ہے۔

منگل کے دن صبح کو شہر کے قلعہ مبارک اور شہر کے دیوان خاص میں مجتمع ہوئے حضور اقدس اعلیٰ برآمد اور
جلوہ فرمائے تخت ہوئے۔ جناب حضرت ولی عہد بہادر زبیر افراٹے کرسی اور مرزا مغل بہادر اور مرزا خضر سلطان
بہادر اور مرزا حواں تخت بہادر اور شہزادگان والا تبار بعد باریابی بحر حسب حکم قصاؤام شریف مشتمل (باقی ص ۲۱۵)

ہوتا ہوں میں جس وقت سے نابشر شمار
اٹھے ہیں حجابات عیاں ہوتے ہیں اسرار
ہے نشہ سے وابستہ گہر ریزی افکار
پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیِ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانہ و صہبامے آگے

رہتا تھا شب و روز اسی بات پر جھگڑا
ذکر اس کا کرے کوئی مجھے کب تھا گوارا
اب لاکھ کوئی ذکر کرے کچھ نہ کہوں گا
نفرت کا گماں گزیرے ہمیں رشک سے گزرا
کیوں کر کہوں لو نام نہ اس کا مرے آگے

اسلام ہو مانع جو مجھے دوڑ کے لے کفر
ہر چیز عقیدت سے جگہ اٹھو میں نے کفر
حاضر ہے خدمت کو کرماندہ ہوئے کفر
ایمان مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسامرے آگے

میں وہ ہوں کہ جس کام کو چاہا نہ رکا کام
اس شوخ کے آگے نہ چلا پر نہ چلا کام
حیرت ہو کہ کیوں اپنی تمنائیں ہوں نا کام
عاشق ہوں پر معشوق فوجی ہوں مرا کام
مجنوں کو بُرا کہتی ہے یلی مرے آگے

وقت میں گزرتے تھے جو سو طرح کے صدرے
کرتا تھا دھار و روح کہیں جسم سے نکلے
اب ان سے جو ملنا ہوا دی جان خوشی سے
خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں نہیں جانتے
آئی شب ہجران کی تمنامرے آگے

موجود ہے جو سوزِ دروں کا شب بھی ہو
جے جعفر اب جوشِ جنوں کا شہر بھی ہو

بقیہ صفحہ ۲۱۶ کا ۱۸۔ حسب مراتب مقام معزز و مکرم ہوئے۔ بارہ ہر ایک بچے تک حضور اقدس جلوہ فرما ہے۔

اب تک ہے جو کچھ مال زبوں کاش ہی ہو ہے معجزن اک قلزمِ خوں کاش ہی ہو

آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

نظارہ نے نزع میں بھی دافعِ غم ہے اٹھواتے ہو کیوں پاس کی کیا یہ کوئی کم ہے

ٹھہرو کہ یہ برتاؤ دمِ مرگِ ستم ہے گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے

رہنے دو ابھی ساغ و مینا مرے آگے

وابستہ ہے اس ذات سے جو نا ہے میرا اس امر میں مرزا بھی تم آواز ہے میرا

ہم کار ہے اور ہمد او دمساز ہے میرا ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمارا ہے میرا

غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

۲۲۲

امید کیا ہے جو کچھ اپنا ماترا کیئے ہماری بات کو کب آپ نے سنا کیئے

کروں جو شکوہ تو پھر کیا مری خطا کیئے کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کیئے

تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کیئے

اگرچہ حسن کے جو رجو جفا ہی زلیور ہیں حسین انھیں سے تو آراستہ سرا امر ہیں

خدا خواستہ کب یہ تمہارے جو ہر ہیں نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ ہم ستم گر ہیں

مجھے تو خوب ہے کہ جو کچھ کہو بجا کیئے

جو آشنا ہو وہی آشنا کے گھر جائے نہ بڑھکے کا قدم کوئی غیر اگر جائے

جسے جو جس سے تعلق وہ بے خطر جائے وہ بیشتر سہی پردل میں جب اتر جائے

نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کیئے

ہزار سینے کو چھلنی بنائے زخمِ سناں کشادِ دل میں مگر تیر کو بے دخل کہاں

کھلا ہوا ہو جرات تو ہے وہ راجستھاں نہیں ذریعہ راحۃ جراحۃ پریکاں

وہ ازخِ تم تیغ ہے جس کو کہ دل کشا کیئے

بشر کو چاہیے ہو صاف سید کیئے سے بُرا ہے ظلم و ستم گو ہو ظلم کے بدلے

مزا تو یہ ہے کہ بن جاؤ دوست دشمن کے جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنیئے

جو ناسزا کہے اس کو نہ ناسزا کیئے

کبھی جو بیٹھ بھی جاتے ہیں ہم غزل لکھنے تو بار بار تقاضے یہ ہوتے ہیں دل کے

کہ آج خوب ہی جی بھر کے رویئے دکھڑے کہیں حقیقتِ جاں کا ہتی مرض لکھئے

کہیں مصیبتِ ناسازی دوا کیئے

کبھی بیانِ ملالِ دلِ حزیں کیئے کبھی فغانِ جہاں سوز و آتشیں کیئے

کبھی روایتِ ہجرتِ حسین کیئے کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیئے

کبھی حکایتِ صبرِ گریزِ پا کیئے

نجاتِ غم سے جوئے اس کو اور کیا دیئے نثار کیئے دل کو یہی صلا دیئے

جو سراٹائے تو جلا د کو دعا دیئے رہے نہ جان تو قاتل کو نوں بہا دیئے

کئے زبان تو بخیر کو مرحبا کیئے

جو یار پاس نہیں ہے خیال یار تو ہے تصور اس کا شبِ غم میں غلگسار تو ہے
یہ اک ذریعہ تسکینِ جانِ زار تو ہے نہیں نگار کو الفت نہ ہونگار تو ہے
روانی روش و مستی ادا کیے

جو فرش گل نہیں حاصل تو سبزہ زار تو ہے چمن نہیں تو مرا سینہ داغدار تو ہے
جو گل نصیب میں اپنے نہیں ہزار تو ہے نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بیمار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبی ہوا کیے
نجاتِ غم سے نہ ہوگی یقین تھا غالب مقامِ شکر ہے سر سے ٹلی بلا غالب
یہی ہوسلک مرزا بھی میرزا غالب سفینہ جب کہ کنارے پر آگیا غالب
خدا سے کیا قسم و جوہرِ نا خدا کیے

۱۲۳

با آبرو تو خلق میں کیا خاک ہو گئے تھے غرقِ بحرِ شرم کہ پیر اک ہو گئے
مشہور اک زمانہ کے چالاک ہو گئے رونے سے اور عشق میں بیدار ہو گئے
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

تھی کشتی کی چاٹ جو بیٹھ بگی ہوئی پینے میں ہم نے آٹھ پہر کچھ کمی نہ کی
آخر کو رنگ لاکے رہی اپنی مفلسی صرف بہائے ہوئے آلاتِ کشتی
تھے یہی دو حساب سولیوں پاک ہو گئے

پلٹے نہیں ہو اب تو ذرا بھی کسی سے تم ہر اک سے پیش آنے لگے دل لگی سے تم
 جا جا کے اب تو ملنے ہو ہر آدمی سے تم رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم
 بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

جن کو نہیں ہے عاشقی و عشق کی خبر ہوتے ہیں معترض وہی تاثیرِ آہ پر
 گلشن میں دیکھیے اثرِ آہِ الحذر کہتا ہے کون نالہ بلبیل کو بے اثر
 پرے میں گلی کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

دل میں وہ آگ تھی کہ سراپا جلا دیا ہستی کو عاشقوں نے دیا خاک میں ملا
 پایا انھوں نے زندگی شمع کا مزا پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہل شوق کا
 آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

کرتے تھے جی ہی جی میں دم رنج و غم گلہ تھا عالم خیال ہی میں دم بدم گلہ
 جرات جو پھر بڑھی تو ہوا ہم کو سم گلہ کرنے گئے تھے اس کے تغافل کا ہم گلہ
 کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

مزارِ جود تھا اس کے لئے بے بود و باش کرتے ہی قتل اس کو کیا پہلے پاش پاش
 ظالم نے خود ہی کر دیا پردہ ستم کا فاش اس رنگ سے اٹھائی کلی اسنے اسد کی لاش
 دشمن ملی جس کو دیکھ کے غم ناک ہو گئے

۲۲۲

مجھ کو غم سے رہا کرے کوئی غم گساری ذرا کرے کوئی
 لاکھ دعویٰ کیا کرے کوئی ابن مریم ہوا کرے کوئی
 میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

حلقہ زلف حلقہ زنجیر دونوں ابرو ہیں خنجر و شمشیر
 جلوہ حسن وہ کہ برق نظیر چال جیسی کڑی کمان کا تیر
 دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

میرا قاتل وہی نگار سہی دو جہاں میں قصور وار سہی
 خوں بہا اس کے سر ہزار سہی شرع و آئین پر مدار سہی
 ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

اس کی محفل تمام گونگی ہے کچھ کہے کس کو تاب اتنی ہے
 لب ہلائے مجال کس کی ہے بات پرواں زبان کشتی ہے
 وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

ذکر ہوتا ہے جا بجا کیا کچھ غور کرتے ہیں آشنا کیا کچھ
 کہہ گیا دل کا مدعا کیا کچھ بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
 کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

جوڑے اس سے تم لڑو نہ کبھی رکھو آزاد زندگی اپنی
کیا ضرورت جواب دینے کی نہ سنا کر بُرا کہے کوئی
نہ کہو گر بُرا کرے کوئی

کوئی تم کو جوڑے اذیت بھی درپے انتقام ہونہ کبھی
رہنمائیِ خلق ہے اچھی روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

جو بظاہر ہیں خرم و خورسند وہ ہیں ناشاد تم سے بھی دہ چند
ہے درِ احتیاج کس پر بند کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیوں نہ شکوہ کریں مقدر سے کھینچ لایا ہے دشت میں گھر سے
رکھئے امید خاک رہبر سے گیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

ان سے جب تک امید تھی غالب شکوہ سخی کی خور ہی غالب
حق ہے مرزا کی خامشی غالب جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیا کسی سے گلا کرے کوئی

اے خضر و سکندر راقعہ مشہور ہے خضر و سکندر بادشاہ کو آپ حیات کے چشمے پر لگئے۔ خود تو آپ حیات پتی لیا
اور سکندر کو ان لوگوں کے سامنے لگئے جو آپ حیات پر فکر ہو جو طولِ عمری ضعیف و ناتواں ہو کر ڈھلے بغیر
لگے تھے سکندر نے عالم دیکھ کر آپ حیات پینے سے انکار کر دیا یہی نتیجہ اس شعر میں ہے۔ (باقی ص ۳۲۳)

فلک کے جوئے غم کیا ہے اور ہم کیا ہے یہ میری تاک میں اور در پہ ستم کیا ہے
 جوئے کدہ ہے سلامت تو پھر الم کیا ہے بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے
 غلام ساقی کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

تمہارے قول ہیں کیا چیز اور قسم کیا ہے مال اس کا ستم ہے تو یہ کرم کیا ہے
 ذلیل ہو گا کسی دن اسے بھرم کیا ہے تمہاری طرز و روش جانتے ہیں ہم کیا ہے
 رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے

نجومیوں کے خیالات فام ہیں بے سود نہ سعد و حس نہ انکے شگون کا ہے وجود
 کسی پہ کھل نہیں سکتی مشیت معبود لکھا کرے کوئی احکام طالع مولود
 کسے خبر ہے کہ واں جنبش قلم کیا ہے

کرے حلف سے بھی وہ بت جو ترکِ روجفا مجھے یقین نہ آیا نہ آئے گا اصلا
 خلا سے مخرف اور منکر جزا و سزا نہ حشر و نشر کا قائل نہ کیش و ملت کا
 خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہے

ہوئی ہے مہرِ سلیمان کی عدل سے حکم دکھائی دیتا تھا عالم یہ جام پر تھا بھرم
 انھیں صفات سے دونوں کا ہے وجود عدم وہ داد و دید گرا نما یہ شرط ہے ہمد

بقیہ صفحہ ۲۲۱ کا ۱۔ فرماتے ہیں حضرت سکندر نے کیا کیا؟ یعنی کچھ نہیں کیا۔ گویا حضرت کی رہنمائی سے بھی سکندر کو کچھ حاصل نہیں ہوا کوئی اب کسے رہنا بنانا۔

وگر نہ ہر سلیمان وجام جم کیا ہے
 بلا کسی نے کہا ہے کسی نے دام اسے کسی نے دی اسے تشبیہ میں عجب سے
 کھلے نہ جب تو مہما سے نہ کیوں کہیے کے تورات جو کالے تو سانپ کھلائے
 کوئی بتائے کہ وہ زلفِ خم، خم کیا ہے
 جدید طرز کا اردو زبان میں بانی وہ فارسی کہ جسے سن کے دنگ ایرانی
 سخن وروں میں ہے مرزا وہ فردو لسانی سخن میں خاتمہ غالب کی آتش افشانی
 یقین ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

۱۲۶

کہوں کیونکر خوشی نکلی نہ دل پر کج و غم نکلیے یہ سب نکلیے مگر افسوس کیونکر یہ الم نکلیے
 نہ پوری حسرتیں نکلیں نہ ارماں یک قلم نکلیے ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر الم نکلیے
 بہت نکلیے مے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلیے
 ہوا جلا دگو کیا وہم رو کا کس نے خنجر ہے جب تکے خوں قاتل کے سر پر خون ہا کیونکر
 نہیں اتنا لہو باقی کہ خنجر اب ہی کرے تر ڈکے کیوں میں قاتل کیا رہے گا اسکی گروں پر
 وہ خوں جو تہم تر سے عمر پھر یوں دم بدم نکلیے
 کبھی ہم بھی تھے تیسے سائبہ دیوا میں ساکن رسائی پر بیماری رشک کہتے تھے سائبہ و جن

لے اس غزل کے زائد شعر غالب نے مرزا صاحب ہاتھ لکھے تھے اردو کے پہلے حصہ اول میں خواہ اول مضمون مرزا
 علاء الدین انصاف صاحب بہادر میں درج ہیں۔

ہمیں جب نے اٹھو یا عدو سے یاد ہو وہ نکلنا اخلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن

بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

ترے گیسوئے پیانے کے مقابل کتب قد تھا زمانہ نے مگر اک فتنہ محشر سے سمجھا

غنیمت ہے کہ اس بچی بیگی ذکر رکھ لیا ہوا بھر کھل جانے ظالم نے قیامت کی دازی کا

اگر اس طرف ہر بیچ و خم کا بیچ و خم نکلے

عجب کیا ہے ہمارا خطا اگر اسکو پسند آئے پھر ک جانے عبارت دیکھ کر اور قدر فرمائے

نہ پہونچیں ہم تو کیا تحریر ہی اپنی بیچ جانے مگر لکھوئے کوئی اسکو خط تو ہم سے لکھوئے

ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

ہوئی ہر رنگ میں جب پیر نہ نما نہ کونا کافی نہ دور جام سے حاصل ہوا کچھ غیر بدنامی

نظر جیسا فی میکشون کے ظرف میں خامی ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بلاہ اشرا

پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جام جم نکلے

کریں کیا فلکات حال مرد و غم سنانے کی کہاں نوبت کسی کو اپنے زخم دل دکھانے کی

کریں کیا شکوہ کچھ حالت ہی تجھے زمانے کی ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی

وہ ہم سے بھی زیادہ خستہ تیغ الم نکلے

اگر ہم شمع سوزن ہیں تو وہ آتش کا پر کالا جلا نا خاتمہ اس کا ہماری زندگی جلنا

اسی کا پر توہ ہے اپنا سامان بھاگوا محبت میں نہیں ہے فرق بیٹنے اور مرنے کا

اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کا فرہ دم نکلے

سرِ منبر کیا کرتا تو ہے مے کا بیاں واعظ بیانِ حرمت دوسیں پر مشہور جہاں واعظ
 یہی حیرت ہم مرزا کو بھی کیوں نہی اوہاں واعظ کہاں مینا نہ کا دروازہ غالب رکھاں واعظ
 پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

۱۲۷

ساقی سیاہ مست ہے تو لطفِ خاک ہے قصہ ہی پھر تو پینے پلانے کا پاک ہے
 ساقی کی آنکھ پر ربطِ صہبائی تاک ہے مستی بہ ذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے
 موجِ شراب یک مژدہ خوابناک ہے
 رہتی ہے اس کو خنجر و پیکان کی جستجو آنکھوں پہرے ذوقِ براحت کی گفتگو
 ہر دم سنان و تیر کا نقشہ ہے روبرو جز زخمِ تیغِ ناز نہیں دل میں آرزو
 جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے
 وادیِ تنگ اب ہمیں بھاتا نہیں اسد نظروں میں اپنی دشت سماتا نہیں اسد
 مرزا بھی راہِ چارہ بتاتا نہیں اسد جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسد
 صحرایِ آنکھ میں اک مشیتِ خاک ہے

۱۲۸

اس کی ہوا میں ہر گلِ تر دلِ فگار ہے رخ کا پسینہ روکشِ عطر ہمار ہے

بوئے بدن سے بادِ صبا مشکبا ہے جس ہانسیم شانہ کش زلفِ یار ہے
نافہ دماغ آہوئے مشکبِ تیار ہے

دل جیتے جی اٹھائے گیا سر پہ بارِ شوق ہم خاک میں ملے تو ہوا انتشارِ شوق
کیونکر فضلے دشت نہ ہوا بے شکارِ شوق ہے ذرہ ذرہ تنگی جا سے غبارِ شوق
گردام یہ ہے وسعتِ صحرا شکار ہے

آنکھوں سے کون پرندہ نشیں ہو چھپا ہوا کس کے خیالِ دید میں سکتے سا ہو گیا
کیوں اس طرح کیا ہے تہیہ تلاش کا کس کا سراغ جلوہ ہے حیرت کو یا خدا
آئینہ فرشِ شش جہت انتظار ہے

ہے بس کہ شلوخ چشم بڑا مدعا علیہ تسلیم کیوں کرے گا خطا مدعا علیہ
دے گا جواب دیکھئے کیا مدعا علیہ دلِ مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ
نظارہ کا مقدمہ پھر رو بکار ہے

تیارِ سفر میں ہے غنچوں کو پچ و تاب پادِ رکاب ہیں یہ گلوں کو ہے اضطراب
پتے اتر کے شاخ سے کرتے ہیں پاتراب چھڑکے ہے شبنم آئینہ برگ گل پر آب
اے عندلیب وقتِ و دارِ ہمار ہے

ہو کیوں نہ انتظار سے دل بستگی مجھے تسکین اس خیال ہی سے ہے بھری مجھے
ایفا کی گونہیں ہے کچھ امید بھی مجھے تنجِ آپڑی ہے وعدہ دلدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے یہ یاں انتظار ہے

اب تک تو میری بھی نہ تجھ پر پڑی نظر
فریاد کی آنکھیں دیکھ کہیں ہوں پردہ در
یہی نہ پھرنا چاہیے بے باک اس قدر
بے پردہ سوئے ولادی مجنوں گزر نہ کر

ہر ذرہ کے نقاب میں دل بے قرار ہے

بے کار ہے مرقع دل واہ کیا کہی
آنکھیں کھلی ہوئی ہوں تو ہوس مڑا کہی
ہو پاس ایسا آئینہ اور پھر یہ مگر وہی
دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر رہی سہی

اے بیدار آئینہ تمثال دار ہے

اٹھنے کو ہے چمن سے عملداری خزاں
تہکا بھی پھر نہ آئے گا تجھ کو نظر یہاں
غافل یہ کثرتِ خس و خاشاک پھر کہاں
اے عندلیب یک کفِ خس پہر آشیاں

طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے

مرزا کی طرح کچھ بھی نہیں اس کو احتیاط
یہ غم کدہ اور اس میں یہ فرحت یہ انبساط
یہ جوشِ حرص اور قویٰ میں یہ انحطاط
غفلتِ کفیلِ عمرو اسدِ فاضلِ نشاط

اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

تو وہ حسین ہے کہ خود آرا کہیں جسے
شاہانِ حسن تاجِ سرا پہنا کہیں جسے
ہے اور کون حسن میں یکتا کہیں جسے
آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

چیراں ہے جو الفت حسن و جمال میں اک انقلاب ہے دلِ خستہ کے حال میں
 سکتے ہو تصورِ ذوق وصال میں حسرت نے لار کھاتری بزمِ خیال میں
 گلدستہ نگاہِ سویدا کہیں جسے
 دل کو کیا ہے عشق نے کس غم میں مبتلا کرتے ہیں اسکو ہم ورجاراتِ دنِ فنا
 آنکھوں کو کس نے شوقِ نظر کا لگا دیا پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں لٹھیرا
 افسینِ انتظارِ تمنا کہیں جسے
 کیونکر جنون و جوشِ حشمت کو لائے وحشی کو کس طرح دمِ غربت سنبھالے
 دل کا غبار اور تو کیونکر نکالے سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالے
 وہ ایک مشتبہ خاک کہ صحرَا کہیں جسے
 آنکھوں میں ہے سمایا ہوا بحرِ بیکراں اس زور کا ہے مد و تلاطم کہ الاماں
 دنیا کا حال کیا ہو اگر خشک ہوں واں ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں
 شوقِ عنانِ گینختہ دریا کہیں سے
 پھیلی ہوئی ہو چاندنی یا تیز ابر ہو دونوں ہیں بے طرح متقاضی کہے ہو
 نہوتی نہیں بسرِ جوشِ غمِ شرابِ دو درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو
 صبح بہارِ پسندِ مینا کہیں جسے
 جس کے برائی دل میں ہو اچھا وہ کیا ہو کچھ بھی نگہ نہیں ہے اگر ناسزا کہے
 مرزا سے صبرِ سیکھ کہ دنیا بھلا کہے غالبِ برانِ مان جو واعظِ بُرا کہے
 لے حاضرِ صبر

ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

۱۳۰

سامانِ مرگ پہلے جیا کرے کوئی پھر تجھ سے گفتگو کی تمنا کیے کوئی
بیٹھا خاموش یوں تجھے دیکھا کرے کوئی جب تنگ و بانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کرتجھ سے راہِ سخن واکرے کوئی

کیونکر ہو خاکِ عاشقِ جانبا ز سے مفر اس کو ہوائے ہوس پہ پھرتی ہر دوش پر
وادیِ نجد پر ہی نہیں صرف منحصر عالمِ غبار و حشرِ مجنوں ہے سر بسر
کب تک خیالِ طرہٴ لیلیٰ کرے کوئی

یہ مردہ دل میں تھی جو تمناۓ التفات آخر وہ آج کرتے ہوئے آئے التفات
لیکن یہ جان لیں جو ہے دعاۓ التفات افسردگی نہیں طرب افزائے التفات
ہاں دردِ دین کے دل میں مگر جا کرے کوئی

کہتے ہیں صبر و ضبط میں آنکھوں پہر مجھے دل کھول کر بہانے دے ابا شکِ تر مجھے
چھوڑاں نصیحتوں کو نہ گھونٹا سقد مجھے رونے سے اے ندیمِ ملامت نہ کر مجھے

حاشیہ صفحہ ۲۲۸ کا آغاز صاحبِ بیعت الحق سیاح کو ایک خط میں اس طرح لکھتے ہیں محالی سیف الحق تمہارا خط پہنچا
قاصی صاحبِ برودہ کو معاف کرکھو اگر کوئی وجہ اپنے پرانے عتاب کی پاتا تو ان سے عذر کرتا اور اپنا گناہ معاف
کر دیتا جب سببِ ملال کا ظہور نہیں تو میں کیا کروں تم برا نہ مانو کس واسطے کہ اگر میں برا ہوں تو اس نے سچ کہا اور
اگر میں اچھا ہوں اور اس نے برا کہا تو اس کو خدا کے حوالے کر دے

غالبِ برادمان جو دشمن بُرا کہیں ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

آخر کبھی تو عقدہ دل وا کرے کوئی

دل خستگی ہزار طرح رونما ہوئی با ایں ہمہ انھیں نہ توجہ ذرا ہوئی
میں نے قبا جو چاک نہ کی کیا خطا ہوئی چاک جگر سے جب رہ پریش نہ وا ہوئی

کیا فائدہ کہ حیب کو رسوا کرے کوئی

وادئ کے سامنے ہے چین کا چراغ گل بادِ بہار کا نفسِ سر دسے ہے غل
کیونکر نہ رشکِ گلشنِ جنت ہو دشت گل لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خارِ شاخِ گل

تا چند باغبانی صحرَا کرے کوئی

تیری شعاعِ حسن ہے اک تیرِ چشمِ دوز مطلق نہیں ہے آنکھ کو تاپِ نظرِ ہنوز
ہم دیکھیں کس طرح مجھے اسے ہریم روز ناکامی نگاہ ہے برقی نظارہ سوز

تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

دشتِ زردوں کو کیا خبرِ فرقِ دو پاؤں دشت اطفالِ گردِ مریں وہ ہیں بنیِ حصنِ مست
سر پہوٹنے کا مفت میں ہوتا ہے بندوبست ہر رنگِ دشت ہے صدفِ گوہرِ شکست

نقصان نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

ہم چاہتے ضرور کچھ اپنے خدا سے عمر بڑھ جاتی شاید اور دعا و دوا سے عمر
تنگ آگئی مگر ترے عہدِ وفا سے عمر سربر ہوئی نہ وعدہ صبرِ آرماسے عمر

فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

آوارگی دشت ہے دشتِ زلے کا شغل حسرت کشی ہے ضعف کے مارے ہوئے کا شغل

دامان و حبیب پھاڑنا بھی ہونے کا شغل بیکاری جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

بے کار ہے سخن سے طبیعت کا خیز و میز انشاؤں اختراع سے بے جا نہیں گریز
بے سود ہے نتیجہ افکار طبع تیز ہے وحشت طبیعت ایجاد یا س خیز
یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی

روشن کلام دہرے کا فور ہے آس گویا چراغ مردہ و بے نور ہے آس
مرزا بھی اب یہ کہنے پر مجبور ہے آس حسن فروغ شمع سخن دور ہے آس
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

۱۳۱

یہ داغ دکھا کر جو گلستاں میں ہنسا ہے عشاقِ دل افکار کے نزدیک خطا ہے
ناوم ہے کہ غرقِ عقی شرم ہوا ہے شبنم بہ گل لار نہ خالی زاد ا ہے

داغِ دل پر دردِ نظر گاہِ حیا ہے مطلق نہیں حالِ دلِ غمگین سے خبر داز
ہے بولے حنا سے یہ انھیں مستی بسیار دلِ خونشده کش مکشِ حسرت دیدار
فرست ہی نہیں ہاتھوں کے نظار سے زہا

آئینہ بدستِ بت بدستِ حنا ہے کم آتش سوزاں سے نہیں حسرتِ دل بھی
جلنا ہی اپنا ہے تو مٹ جائے گی ہستی

سینے میں تمنائے عجب آگ لگا دی شعلے سے نہ ہوتی ہو سی شعلے جو کی

جی کس قدر افسردگی دل پر چلا ہے

تصویر کی کیا قدر کریں بغیر ہیں بندوق ہم محو ہیں اس درجہ کہ رکھتا نہیں حد فوق

جاسکتا نہیں آئینہ سے تاباں بندوق تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بھد بندوق

آئینہ باندا زنگل آغوش کشا ہے

قری کی صداؤں سے ہے ہر ہڑی دنگ بلبیل کے اس انداز سے ہر غچہ ہے دل تنگ

دونوں میں ذرا سوزش پہاں کانہیں صنگ قمری کیف خاکسترو بلبیل نفس رنگ

اے نالہ نشان جگر سوختہ کیسا ہے

عادت نے تری پست کیا ہمت دل کو مجبور بدنا ہی پڑا حالت دل کو

بڑھنے نہ دیا ولولہ و جرات دل کو خونے تری افسردہ کیا وحشت دل کو

معتشوقی وبے حوصلگی طرفہ بلا ہے

وہ لاکھ جھائیں کرے دے لاکھ اذیت دشوار ہے آسان نہیں ترکِ محبت

کچھ پاس زباں ہے ہمیں کچھ پاس مروت مجبوری و دعوائے گرفتاری الفت

دستِ تہہ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

ہے قابلِ عشاق پریشان گزشتہ باقی ہے ابھی اس میں وہی شانِ گزشتہ

کرتی ہے عیاں قتل کے سامان گزشتہ معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ

تبیحِ ستم آئینہ تصویرِ نمسا ہے

نظروں میں شبِ تار سے بدتر ہے سحر بھی شائقِ ترے انوار کا دل بھی ہے جگر بھی
روشن ہیں ترے نور سے دیوار بھی در بھی اے پر تو خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی

سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

تقدیر ہی قدرت نے ہمیں ہی کچھ ایسی ہم پر نہ پڑی ہے نہ پڑے تیری تجلی
خروم بجز میرے نہیں جلوے سے کوئی اے پر تو خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی

سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

جاتا تو ہوں دنیا سے مگر بادلِ ناشاد کیا کیجئے بے وقت پڑی موت کی اقدار
ایمان بھرے دل کی بھی ہر تجھ سے ہی فریاد ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی تلوار

یارِ بآگرانِ کردہ گناہوں کی سزا ہے

تو اہلِ زمانہ پہ جو مایل نہ ہو غالب یہ حسرت و حیراں کبھی حاصل نہ ہو غالب
مرزا کے سوا غیر کا قائل نہ ہو غالب بے گانگیِ خلق سے بیدل نہ ہو غالب

کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

غلمان کی یہ شکل نہ صورت ہے حور کی مجھے گا اسکو کیا کوئی ہے باتِ دور کی
اک بہر امتحانِ حق ضیا کو وہ طور کی منظورِ حق یہ شکلِ تجلی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

بہرِ نظارہ اہلِ جہاں کے جساؤ ہیں اندازِ ہوا ہے کرشمے ہیں چاؤ ہیں
پھولوں کی بھیاں ہیں بدنِ چو گھاؤ ہیں اک خوشحال کفن میں ہزاروں بناؤ ہیں

بڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پر حور کی
وہ ہے کہاں کی جس سوزِ لذت اٹھا سکو
دیکھو نہ جس کو خود نہ کسی کو دکھا سکو
خود جا سکو جناں میں نہ گھر بیٹھے پاسکو
واعظ نہ تم پیونہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمھاری شرابِ طہور کی

پھر ہو رہا ہے مجھ کو قیامت کا سامنا ہے دغدغہ وہی جو کبھی زندگی میں تھا
یہ جان کر کہ آں ہے دنِ عدل و داد کا لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں بٹھا
گویا ابھی سنی نہیں آوازِ صورت کی

پھرتی ہے بے باغ نہ غم ہے نہ کوئی رنج گانے لگی ترائے نوبے رباب و صنج
گویا ہے گا اس کو زنگل سے کوئی گنج آمد بہار کی ہے جو بیل ہے نغمہ سنج
اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طہور کی

مانا کہ یہ نگاہ سے ڈالے ہوئے تو ہیں عزت کو لیکن اپنی سنبھالے ہوئے تو ہیں
اُمّ القریٰ کی گود کے پالے ہوئے تو ہیں گواہ نہیں پر وال کے نکالے ہوئے تو ہیں
کب سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

موسمی ہی تھے ملا ہے جنھیں یوں کھلا جوتا دیکھیں تو دیتے ہیں ہمیں پرے سے کیا جواب
خطرہ نہیں کسی کو اگر مل گیا جواب کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب

آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی
 مثلِ زبانِ شمعِ زباں میں ہے وہ اثر
 پھونکا اسے کسی سے ہوئے ہم نمنِ مگر
 پر کارِ آگ کا تمہیں کہتا ہے ہر بشر
 گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
 کی جس سے بات اس نے شکایتِ ضرور کی
 مرزا یہ شوقِ جج کا ہے جس طرح اب ہمیں
 اس وقت تمہیں بوہی دلِ غالبِ حسیں
 آخر یہ بات کہہ گیا وہ آگے جوش میں
 غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے اٹھیں
 جج کا ثواب نذر کروں کا حضور کی

۱۳۳

اس کو جو غمِ گردشِ ایام بہت ہے
 اس واسطے جو یائے و جام بہت ہے
 غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے
 غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے
 یہ رنج کہ کم ہے مئےِ گلِ جام بہت ہے
 یہ رنج کہ کم ہے مئےِ گلِ جام بہت ہے
 مجھ رندِ بلا نوش کو چپکا ہے یہے کا
 ہو بادہ سر جوش ہی اس کی نہیں پروا
 میں شوق سے لے لوں گا تو تلچھٹ بھی دے گا
 کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورثا
 ہے یوں کہ مجھے دُرِ دہرہ جام بہت ہے
 ہے یوں کہ مجھے دُرِ دہرہ جام بہت ہے

لے یہ غزل اس زمانہ میں لکھی گئی تھی جبکہ ظفر نے کیلئے جانے کا ارادہ کیا تھا جس کی رپورٹ رزیڈنٹ دہلی نے بھیجی تھی
 مرزا غالب نے براہِ جانے کی خواہش اس مقطع میں ظاہر کی ہے
 غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے اٹھیں : جج کا ثواب نذر کروں کا حضور کی

پنہاں نہیں اب دام گلستاں کی زمیں میں خطہ ہی نہیں کوئی دل گوشہ گزیں میں
چھتے نہیں اب غارِ عالمِ قلبِ خزیں میں نے تیر کہاں میں ہے نہ صیاد کس میں
گوشہ میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

لاپچ سے جو تکلیفِ عبادت کی اٹھائی اس عابدِ ناداں نے عبث عمر گنوائی
کیا فائدہ اعمال میں جب ہو نہ صفائی کیا زہد کو مانوں وہ نہ ہو گوچرِ بیائی
پادائشِ عمل کی طبعِ خام بہت ہے

آزادہ روی شیوہ بتاتے ہیں جوانساں معلوم نہیں سمجھے ہیں کیا جی میں وہ ناداں
آزاد تو ہو ہی نہیں سکتے کسی عنوان ہیں اہلِ فرد کس روشِ خاصِ پنازاں
پابستگی رسمِ ورہ عام بہت ہے

پینے میں لگے بادہِ گلفام کے دھبے ان سے ضلّ آجائے نہ ارکان میں حج کے
فرصت میں ذرا سیٹھ کے دھولوں نصیب ہے زمزم ہی پر چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے

آلودہ برے جائے احرام بہت ہے

تردید نہ کی اس کی کبھی میں نے کہا جو مجھ پر وہ عنایت کی نظر رکھتے ہیں اب تو
جنت ہے یہ بڑتاؤ ہوا اور وصلِ نہ پھر ہو ہے قہر گرا ب بھی نہ بنے بات کہ ان کو

انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے

میں یہ نہیں کہتا مجھے مرنا نہیں لے مرگ پنج جاؤں تو کچھ حرج بھی تیرا نہیں لے مرگ
حاشا کہ مجھے جان کی پروا نہیں لے مرگ خوں ہو کے ٹکراؤ مجھ سے نہ پکا نہیں لے مرگ

رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے
 کیا دل کش و دلچسپ ہیں مہرا کے ترانے بخشی ہے عجب طبع رسا اس کو خدا نے
 مانا ہے اسے راہِ نما سب شعرا نے ہو گا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے
 شاعر تو وہ اچھا ہے پر بدنام بہت ہے

۱۳۴

کیا کہیے کہ دل ہے پریشاں کئے ہوئے آئینہ دار ہے مجھے حیراں کئے ہوئے
 ہے انتظار آمدِ جاناں کئے ہوئے مدت ہوئی ہے یا کر کو جہاں کئے ہوئے
 جوشِ قدرح سے بزمِ چراغاں کئے ہوئے
 دل کو تو چشمِ تر نے دیا اشکِ خوں میں کھو کیا خاک مجھ سے کوئی نیا انتظام ہو
 کہ دو رنگا پسین کش وہی حاضر ہو گھر میں جو کرتا ہوں جمع پھر جگرِ سختِ لخت کو
 عرصہ ہوا ہے دعوتِ مہرگاں کئے ہوئے
 مدت کے بعد جوشِ جنوں نے کیا کرم تابِ سکون و صبر گئی دل سے یک قلم
 وحشت کی روک تھام نہ کی سکیں گے ہم پھر وضعِ احتیاط سے رکے لگا ہے دم
 برسوں ہوئے ہیں چاک گرِ بہاں کئے ہوئے
 سینے میں پھر وہ آگ بھڑکنے لگی کہ بس پھر جل کے خاک ہو گا تین زارِ مثلِ خس
 پھر ضبطِ آہ پر نہ رہا دل کو دسترس پھر گرم نا لہائے شر رہا رہے نفس

مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کئے ہوئے

کیا پوچھتے ہو کیا ہے غصہ بلا پر عشق سرے سے ملے گا نہ اب تک ملا ہے عشق

دل کیا کر اب تو دیئے جاں بر ملا پر عشق پھر پریش جراتِ دل کو چلا پر عشق

سامانِ صدر ہزار نمکدراں کئے ہوئے

پھر دل میں شوق دید سے ہو در و جانگسل پھر اشکِ خوں بہاؤں گا آنکھوں سے متصل

دکھلاؤں گا و درنگ کہ مانی ہو منفعل پھر بھر رہا ہوں خانہ خزاںِ خون دل

سازِ چمن طرازیِ داماں کئے ہوئے

پیش آ رہا ہے عشق میں اک قہرِ عیب بیٹھے بٹھائے بھیس گئے آفت میں و غریب

کیا دوسرے کہ دونوں میں چھڑ جائے غمِ قریب باہم و گر ہوئے ہیں لُ دیدہ پھر قریب

نظارہ و خیال کا سامان کئے ہوئے

وحشت میں ٹھہر رہی ہو سو اونیونکی لے ذلت کے مرچے کو کیا چاہتا ہے طے

کھل کھیلنے کے اب تو تقاضے ہیں بچے پے پھر دل طوافِ کوئے ملامت کو جائے بے

پنڈار کا صنم کردہ ویراں کئے ہوئے

پنچر ہے مریضِ عشق کو تیمار کی طلب پھر اس دل غمیں کو بے غمِ خوار کی طلب

الفن کو بھرے گرنی بازار کی طلب پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب

عقلمندی و عقل و دل و جاں کئے ہوئے

ہے رنگِ بوئے گل کا جو پیشِ نظر خیال گلشن میں جا کے مست ہو پھر بسیرِ خیال

دل گشت میں جا ہوا ہے پھر ادھر خیال دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا سماں کئے ہوئے

سزا مر اس کے خط کا ہے اس درجہ دل ربا جس کے ہر ایک حرف پہ ہیں جانِ دل فدا
مضمونِ شوق دیکھئے لاتا ہے رنگ کیا پھر چاہتا ہوں نامہ دلدار کھولنا
جان نذرِ دل فریبی عنوان کئے ہوئے

نسکین سیر باغ سے کیا ہوگی تم نفس بے یار ہیں نظر میں گل تر ہی خارِ خس
بے چین ہو رہا ہوں کہ دل نہیں بس مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس
زلف سیاہ رخ پر پریشاں کئے ہوئے

بے وجہ تو نہیں ہوں میں آوارہ کو بکو پھر تا ہوں تیغِ زن کے تجس میں چار سو
بنخ نگاہ کی ہے ان آنکھوں کو جستجو چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمہ سے تیز دشنہ مڑگاں کئے ہوئے

مردوب چشمِ شوق نہیں روئے ہر و ماہ اس گل کی بزمِ عیش کی دل دھونڈھتا رہا
کب سامنے ہو دیکھئے ساقی کی جلوہ گاہ اک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغ سے گلستاں کئے ہوئے

تا چند انتظار کا دکھ جھیلے رہیں کب تک رہیں چارہ احباب کے رہیں
تا چند یوں جہادِ دلدار سے رہیں پھر جی میں ہے کہ درپہ کسی کے پڑے رہیں
سر زمر بارِ منتِ درباں کئے ہوئے

طاقت نہ وہ خیال میں باقی دابہ رس
 وہ دن گئے کہ چین نہ بڑھتا تھا یار بن!
 رہتے تھے اس کی یاد میں ورنہ تھا مطمئن
 جی ڈھونڈتا ہر پھر وہی فرصت کے رات دن
 بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کے ہوئے
 کیا سہل بات تھی کہ یہ سیلاب رک سکے
 رو کا یہ جوش جس نے وہ مڑا ہمیں تو تھے
 اب بھی ہیں اپنی آنکھوں میں کیا بھوب ہوئے
 غالب ہمیں نہ چھوڑے کہ پھر جوشِ اشک سے
 بیٹھے ہیں ہم تہیہ طوفاں کے ہوئے

۱۳۵

جفاے یار تسلی ہے اک جہاں کے لئے
 خیرِ خوشی کی ہے آزادی و اماں کے لئے
 ہوئی ہے وجہ تسلی دلِ تپاں کے لئے
 نویدِ امن ہے بیدارِ دوست جاں کے لئے
 رہے نہ طرزِ رسم کوئی آسماں کے لئے
 غذائے غم نو دلِ بے قرار و غمخوہ ہے
 جگر کی تاک میں وہ دیدہ پر افسوس ہے
 پڑی وہ لوٹ کہ حالتِ مری درگاہ ہے
 بلا سے گزرتا یارِ تشنہ خوں ہے
 رکھوں کچھ اپنی مژگانِ خوشچاکاں کے لئے
 خطا معاف رہے اتنا اس خلقِ لے خضر
 تمہیں نہیں ہر ذرا بھی تو پاس خلقِ لے خضر
 چھپے ہو تم یہ تمہیں ہے ہر اس خلقِ لے خضر
 وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں ششائے خلقِ لے خضر
 نہ کم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

یہاں تک مے ملیں ہوئی ہے کثرتِ رشک کربات بات سے ظاہر ہے اب علامتِ رشک
کسی کو غیر کی راحت پر ہوگی عادتِ رشک رہا بلا میں بھی میں مبتلائے الفتِ رشک
بلائے جاں ہے ادائیری اک جہاں کے لئے

وہ کشتنی کہ جو قاتل سے رات دن جو قریں انھیں کو اس سے جلا کر کہ ہو مجھے تسکیں
کبھی تو دور سے ہو آرایشِ انکی کہیں فلکِ دور کہ اس سے مجھے کہیں ہی نہیں
دراز دستی و قاتل کے امتحاں کے لئے

پڑا ہوا تو ہوں زنداں میں بستہ زنجیر قہر نہ یہ تھا کہ کرتا نجبات کی تدبیر
مگر مجھے تو یہ دھن ہے کہ گھر کروں تعمیر مثال یہ مری کو شش کی ہے کہ مریغِ اسیر
کرے قفس میں فراہمِ خس اشیاں کے لئے

پڑا ہوا تھا میں دھونی اُلاستال پر رماے اہی آرزو میں کہ دربان کو نرس آجائے
اسے بھی کوئی خصوصیت نہ تھی کہ مجھ کو اٹھائے گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت لئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسبان کے لئے

۱۔ اس شعر کے متعلق مولانا غالب لکھتے ہیں: "اندو غزل میں ایسے بیخ اشعار شاید دو ہی جارا اور نکلیں گے۔ مولانا آرزوہ جو
غالب کی طرز کو نام رکھتے تھے وہ بھی اس شعر کے انداز بیان پر روانہ تھے۔ آغازِ مقدمہ میں بھی اسی شعر پر کچھ باریک کیا کہ
اس کی ایک اور خوبی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جو دھو غالب نے اس شعر میں بیان کیا ہے اس میں دو باتوں کی تصریح کرنی
ضروری تھی۔ ایک یہ کہ پاسبان نے قاتل کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ دوسرے یہ کہ قاتل پاسبان سے چاہتا کیا تھا سو یہ دونوں
باتیں بصورتِ بیان نہیں کی گئیں صرف کنڈیس ادا کی گئی ہیں مگر راحت سے زیادہ وضوح کے ساتھ فورا بھیجیں جاتی
ہیں پہلی بات پر لفظ شامت اور دوسری پر قہر یہ صاف دلالت کرتا ہے۔ اسے سوارِ آرزوہ کی نشست اور الفاظ کی بندش اور
ایک وسیع خیال کو دھو غزل میں یہ خوبی سے ادا کرنا شمس بھی اس طرح ادا کرنا مشکل ہے یہ سب باتیں نہایت تعریف کے قابل ہیں۔"

سختی میں چاہیے کوئی جدید طرز عمل
کہ طبع تیز کا کچھ حوصلہ تو جائے نکل
نہ کیوں ہر وعدہ تغزل میں رہ کئی بے کل
بقدر شوق نہیں ظرف تنگ سائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے

ملا ہے جو طرب و عیش اس کو قسمت سے
بھلا وہ اس کے سوا ہے نصیب اور کس
مٹا دیا حسد و رشک کو بھی قدرت نے
دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

یہ ذکر خیر مرے لب پر آگیا کس کا
بھرا سرور سے دل اور جگر ہوا ٹھنڈا
مجھے بیان پر اپنے ہے وجد کیوں اتنا
زباں پر بارِ خدا یا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

اسی کی نشان کے نمایاں ہر شانِ شوکتِ ملک
اسی کے واسطے مغزوں پر جواہرِ حُسنِ ملک
ہے ہمیشہ یوں ہی برقرار ثروت و ملک
نصیرِ ملت و دیں اور معینِ ملت و ملک
بنا ہے چرخِ بریں جس کے استار کے لئے

ہر اک بشر کے لئے عیش کی ہے افزائش
خدا کے فضل سے آیا ہے دورِ آسائش
مجھے طریق سے ہر شے کی ہو گی زیبائش
زمانہ عہد میں اس کے ہے جو آسائش
بہیں گے اور ستارے اب آسمان کے لئے

اکی تو مدح کی تمہید و ابتدا ہی ہے
نہ مدح نکھی گئی ہے نہ میں نے نکھی ہے
یہی کہاں مری طبع رسا نے بس کی ہے
ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے

سفینہ چاہئے اس نہ خربے کراں کے لئے
 عجیب ڈھنگ نکالا ہے مدح گوئی کا
 غزل سی نہیں دکھایا ہے اس نے رنگ نیا
 طبعیت اس کی ہے حدت پسند لے مرزا
 ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
 صلائے عام پر یارانِ نکتہ واں کے لئے

کم ہے غیروں سے اگر ہو وفا اور سہی
 میری ایذا سے جو دل خوش نہ ہوا اور سہی
 کوئی برتاؤ مروت کا نیا اور سہی
 میں ہوں مشتاقِ بجا چھوڑ بجا اور سہی
 تم ہو بیدار سے خوش اس سے سوا اور سہی
 راتِ دلِ گریبے اور آٹھ پہرِ نالہ و آہ
 مرہی جالے دو اگر مرہی گیا ہے گمراہ
 سوگِ تم نے تو کچھ اس درجہ منایا کہ بہا
 خیر کی مرگ کا غم کس لئے اے غرت ماہ
 ہیں ہوس پیشہ بہت وہ نہ ہوا اور سہی

کبر و نخوت کی زبانے میں دہائی کیوں ہے
 خود نما کیوں ہو خودی سر میں سمائی کیوں ہے
 دل میں ناحق ہوسِ حامِ پکائی کیوں ہے
 تم ہو بت پھر تمہیں ہندارِ ضلّی کیوں ہے
 تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی
 یہ تو مانا کہ حسینوں کی نہیں کوئی کمی
 آن بان ایسی کسی میں کمی دیکھی نہ سنی
 جس میں آپ سے بڑھ کر نہیں ہونی کمی
 منہ حسینانِ ارم آکے ملائیں تو سہی

حور کا شیوہ انداز و ادا اور سہی
 کیا قیام اور قعود اور ہے سجدہ کیسا سر مرا جھک نہیں سکتا ہے ترے ورے کے سوا
 تھا جو بے چین تو ہر جگہ کے ادھر ہی پہنچا تیرے کوپے کا ہے مائل دل مضطرب
 کعبہ اک اور سہی قبلہ نما اور سہی
 کیا انوکھا جن غلدریں ہے واعظ باغ دیکھے ہی نہیں تو نے یقیں ہے واعظ
 تیری باتوں کا ٹھکانہ بھی کہیں ہے واعظ کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ
 غلہ بھی باغ ہے خیر آب و ہوا اور سہی
 یاں تو دل کھول کے ارمان نکالیں رب تنگی دہر کی کچھ داد تو پالیں یارب
 سیر کا لطف تو جی بھر کے اٹھالیں یارب کہوں نہ فردوس میں دوزخ بھی ملا لیں رب
 سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی
 کر دیا ہے غم بھراں نے مرا حال زبوں بڑھتے بڑھتے خنقاں پہنچی ہے نوبت بڑبوں
 دیر مرنے میں لگے لگی جو کھلائی افیوں مجھ کو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں
 زہر کچھ اور سہی آپ بخت اور سہی
 طبع دیوان سے جو غالب نے فراغت پائی یار و احباب نے مرزا نی آفت ڈھائی
 کی غزل نظم تو یوں لب پر نکایت آئی مجھ سے غالب یہ علانی نے غزل لکھوائی
 ایک سیراد گیر رنج فزا اور سہی

سے غزل نمبر ۱۳۶۔ دیوان مطبوعہ میں نہیں ہے اردوئے معلیٰ حصار اول رقم مسموم نواب امین الدین احمد خان صاحب

شکوہ در دلی اک گو نہ خطابے تو سہی نالہ و آہ سے اظہارِ جفا ہے تو سہی
صبرِ بی آف بھی منافیِ رضا ہے تو سہی آپ نے مستحقِ التَّوَّابِ کہا ہے تو سہی

یہ بھی یا حضرت ایوب کلام ہے تو سہی

ہم نشینوں کو ہے کیا میری مصیبت کی خبر کرتے ہیں صبر کی نقلین مجھے آٹھ پہر
دل ہی تو ہے مرے سینے میں نہ کوئی بہتھر رنج طاقت سے سوا ہو تو نہ بیٹوں کیونکر
ذہن میں خوبی تسلیم و رضا ہے تو سہی

اُس باقی ہے تو برسوں ہیں بہلائے گی عمر سبز باغِ آٹھ پہر فکر میں دکھلائے گی عمر
داد ملنے کے لئے گویا نہی تڑپائے گی عمر ہے غنیمت کہ بہ امید گزر جائے گی عمر
نہ ملے داد مگر روزِ جزا ہے تو سہی

کس کا چارہ فقط الزام سے ہوتے ہیں بری کون اٹھاتا ہے مریضوں کے لئے دردِ دہری
منہ نہ کھلواؤ کہ احباب کی ہے پرہِ درمی دوست ہی کوئی نہیں ہے جو کرے چارہ گری

نہ سہی ایک تمنائے دوا ہے تو سہی

ہم سے بڑناؤ ہے جو کچھ اسی قابلِ ہم تھے کہتے بد عہد و جفا کار اسے کس منہ سے
بے فروت ہے وہ کیونکر کوئی انصاف کرے غیر سے دیکھئے کیا خوب نباہی اس نے

نہ سہی ہم سے ہر اس بت میں وفا ہے تو سہی

گو کہ واقف نہیں تقدیر کے احوال سے ہیں خط قسمت نہیں پڑھ سکتا کسی حال سے ہیں
یوں نگاتا ہوں پتہ اپنے ہی افعال سے ہیں نقل کرتا ہوں اسے نامہ اعمال سے ہیں
کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی
جس طرح صبر سے مزار نے گزاری غالب زندگی کا تو اسی طرح سے تم بھی غالب
جان دیتے ہی کسی روز بنے گی غالب کبھی چل جائے گی کیوں کہ تے ہو جلدی غالب
شہرہ تیزی شمشیرِ قضا ہے تو سہی

قطعة تاریخ تکمیل اوراق ہذا

کی شرحِ نظم غالب تضمین میں جو مزار ظاہر ہوئے معانی حل ہو گئے مطالب
جی میں خیال آیا تاریخ اس کی لکھئے بولا سروشِ غلیبی روحِ کلام غالب

نوٹ: ۱۔ یہ غزل ۱۳۷۱ء اب احمد سعید خاں صاحبِ طائب رئیسِ دہلی کا عطیہ ہے فرمانے تھے کہ میں ہر وقت
پہچان (غالب) کی خدمت میں حاضر باش تھا نیا کلام اپنی یادداشت میں لکھتا تھا اور مجلسِ یہ غزل ہے۔

تمام شد

ضمیمہ

تفہیم بر غزل فارسی مولانا جامیؒ

کیا شوق زیارت نے پریشان یارِ رسول اللہ ہوا رسول درِ جہ سے سخت حیراں یارِ رسول اللہ
خدا کی واسطے کچھ کیجئے دعاں یارِ رسول اللہ تنم فرسودہ جاں بآرا و بجاں یارِ رسول اللہ

ولم پردرد آوارہ ز عصیاں یارِ رسول اللہ
نہ دلیں صبر کی طاقت نہ جانیں ہر شکیبائی نہیں اب بارِ فوق کے اٹھانیکی توانائی
دکھاؤ شکلِ نورانی بناؤ مجھ کو سودائی شب و روز از شکیبائی ز حد گشتم تمنائی
بخلوت سوئے من آئی خراماں یارِ رسول اللہ

ہوئے قدرت سے چاروں یارِ رسول آپ کے ہمد محبت کے تھے چاروں حرف گویا متصل باہم
خدا نے انکو اسرارِ نبوت کا کہا محرم بصدیقت خریدارم عمرِ را دوست میدارم
بعثمان و علی آرم فدا جاں یارِ رسول اللہ

نہیں اسوقت بد میں کوئی میرا نموش ہدم سہا ہے تمہاری ذات کا یا سرورِ عالم
ندامت ہو درِ احتیادِ ناکارہ میں بہیم ز کردہ خوش حیرانم سیر شد زورِ عصیانم
پیشیمانم پیشیمانم پیشیاں یارِ رسول اللہ

غمِ فراق میں برسوں کی بے گنت گہری
 متاعِ مال و زر تھی جس قدر باد کی ساری
 نہیں کچھ پاس قربان کر سکی ہے سخت لاپرواہی
 چہ سوئے من گزر آری من مسکین زنداداری
 نثار نقشِ نعت کتب جاں یار رسول اللہ

چلا سوئے عدم مرزا نہایت بے سرو سامان
 نہیں ہر ساتھ توشہ آخرت کا کچھ مخر عیال
 ہے اتنی عرض یا مولامری جاں تمہی ہو قربان
 چوں بازوئے شفاعت را کشائی برگزین کاران
 مکن محروم جامی را دران آں یار رسول اللہ

تضمین بر غزل مولانا منشی حسین صاحب سورتی

دکھاؤ اور توجہ عالم آرا یا رسول اللہ
 بنا لو اپنا دیوانہ خدا را یا رسول اللہ
 عنایت کی نظر ہوں تمہارا یا رسول اللہ
 ہمیں ہے ذات اقدس کا سہارا یا رسول اللہ
 تمہارے بن نہیں کوئی ہمارا یا رسول اللہ

گہیں جلدی نقاب پر نچ پر نور سے الٹو
 کسی خواب میں اگر ہی مجھ کو شرف بخشو
 نہایت مضطرب شوق زیارت نے کیا مجھ کو
 کہوں میں تم سے کیا تم مرم راز الہی ہو
 تمہیں معلوم ہی احوال سارا یا رسول اللہ

قدیرِ سایہ نکر دی ہے توحیدِ خدا ثابت تمہاری شانِ بڑھتی ہو شانِ کبریا ثابت
اشاروں میں ہی دعوتِ نبوت کو کیا ثابت مجھے شوقِ اتم کے مجھ سے ہو گیا ثابت

بلندی پر تمہارا ہے ستارا یا رسول اللہ

تمہارا ذکرِ جاری بڑبا پیر میری صبح و شام یہ ہے وہ درجہ جس سے درجے ہیں غم و آلام
تمہارے نام ہے دلوں کو راحت جان کو آرام لیا کیجئے نہ کیونکر بیٹھتے اٹھتے تمہارا نام

تمہارا نام لگتا ہے پیارا یا رسول اللہ

بھروسے تمہارا خواجہ ہر دوسرا ہم کو قیامت میں گناہوں کا نہیں کٹکا ذرا ہم کو
شفاعت کر کے بیشک آپ لینگے بخشوا ہم کو اگرچہ کیسے ہی عاصی ہیں بخشے گا خطا ہم کو

ذرا بھی کیجئے گا گراشا یا رسول اللہ

زیارت سبزِ روضہ کی مشرف ہو گا یہ جب تک نہیں ممکن بنے علنا اس خیف و زار کا تنگ
گزارِ جس طرح گرمی پریشانی سمیلا تنگ دینے میں مجھے پاس اپنے اب بلوائے گنہگار

پھروں گا بند میں میں مارا مارا یا رسول اللہ

بھلائی پر نہ بھلو نفس نے ہوسنے دیا قادر بدی میں ہو گیا یکتا نکوئی میں رہا قاصر
طلبِ گارِ حمایت اب ہوا سرکار میں حاضر کرو اسوقت بد میں دستگیری تم کریں آخر

جرا ہوں یا بھلا ہوں ہوں تمہارا یا رسول اللہ

ہے گستاخی سرا سر شکوہ سوزِ نہاں کرنا ادب کے برخلاف آہ و بکا شور و فغاں کرنا
 فضول ایک ہے اظہارِ بے تابی جانی کرنا عیب ہے تم کو اب ہر وقت درِ دل بیاں کرنا
 غم پہناں ہے تم پر آشکارا یا رسول اللہ

ہمیشہ ذاتِ اقدس کا رہا سر پر مے سایہ قہیلی کی کبھی گریں بحوم غم سے گھبرایا
 جہاں نیم جاں پہنچا تمہیں موجوداں پایا تصدق آپ کے الطاف کے لبیک فرمایا
 کبھی گر روزِ غم میں نے پکارا یا رسول اللہ

زیارت کی محال اگر جذبِ الٰہی کوئی راہ کسی دن اگر ہوئے شوقِ ازلے چل بھونکا گاہ
 میں اوریوں نثرِ عالم کے دسے و رہوں لے آہ مجھے اور حکم بود و باش ملک ہند یا اللہ
 میں اوریوں زیرِ فرمان نصارا یا رسول اللہ

نہیں ہے آپ کے مزار میں باقی طاقتِ جہاں قرونِ ہر دمدم اس پر نجومِ حسرت و اراں
 مدین میں بلا لویا نبی اتنا کرو احساں دیارِ ہند ہے کیونکر گئے اسمیں دل سوزاں
 مدینہ ہے نہ مکہ نہ بحارِ ابرارِ رسول اللہ

تضمین بر سلام میر وحید صاحب مرقوم لکھنوی

نام ہو جس کا علی نام خدا ایسا تو ہو ہو جسے معراج دوشِ مصطفیٰ ایسا تو ہو
نام ہو جس کی نصیری ہیں خدا ایسا تو ہو خلق کے بیڑے کا حامی نا خدا ایسا تو ہو

جس پہ دھوکا ہو خدا کا نا خدا ایسا تو ہو

عاشقِ نام خدا اہلِ سخا ایسا تو ہو ہو گئے جس کے لپسِ حرق پر خدا ایسا تو ہو
جو کرے یوں بندگی حق کی ادا ایسا تو ہو گھر ٹٹایا شاہ نے وعدہ وفا ایسا تو ہو

دے دیا سجدہ میں سر عشقِ خدا ایسا تو ہو

جسم بھی ہو ہرے تھا حق نے بنایا آپ کا سایہ کی جا بڑتی تھی جسمِ منور سے ضیا
درحقیقت نور حق تھا سر سے لے کر تا پسا واہ رے یکتائی احمد کہ سایہ بھی نہ تھا

ہو نہ جس کا مثل محبوبِ خدا ایسا تو ہو

یوں تو دنیا میں ہوئے پیدا ہزاروں ابنیا پر ہوا اب تک نہ پھر ہوگا نظیرِ مصطفیٰ
نپ کو صانع نے بیشک ایک ہی پیدا کیا واہ رے یکتائی احمد کہ سایہ بھی نہ تھا

ہو نہ جس کا مثل محبوبِ خدا ایسا تو ہو

دوستوں کی داد کیا اور دوستوں کی کیا پسند کیا کہا ہم نے اگر دوس پانچ کو آیا پسند
 بات ہے وہ واقعی جسکو کرے دنیا پسند غل طرف از روز کا مجلس میں ہیں ہر ناپسند
 خود دشمن بھی ہو باتوں میں مزا ایسا تو ہو

میرے مولا میں علی مرتضیٰ شیر خدا جنگے در سے ہوتی ہر شاہوئی کی حاجت روا
 دو جہاں میں آپ ہیں ہر ایک کے مشکل کشا ہوں در حیدر کا سائل خربے مجھ کو بجا
 شاہ جس کی آرزو رکھیں گدا ایسا تو ہو

اہل دولت سے کہوں کیا اپنے دل کا مدعا توبہ توبہ ان سے کیا ہوگی مری حاجت روا
 دل غنی پر گرچہ میں ہوں ایک فقیر بے نوا ہوں در حیدر کا سائل خربے مجھ کو بجا
 شاہ جس کی آرزو رکھیں گدا ایسا تو ہو

ہر صد پر میری ہو کہوں کر نہ شور مچا جانتے ہو کون ہوں و کس کا ہوں محتبرا
 لیں نہ کیونکر اہل دنیا جھکو آنکھوں پر بٹھا ہوں در حیدر کا سائل خربے مجھ کو بجا
 شاہ جس کی آرزو رکھیں گدا ایسا تو ہو

ناہنجوی کہ ہمیشہ چاہیے انسان کو تنگ صبر وہ پیدا کرے جس سے ہوں خاص غامدنگ
 آفت نکلے منہ سے گوہیں کو بھی ہو جائے تنگ و پس ڈالے گوزمانہ پر نہ چھوڑے اپنا رنگ
 بر دباری میں بشر مثل حنا ایسا تو ہو

نہ اند شاہ کا صبر و تحمل وقت جنگ شکر ہی نکازبان سے جب کیا اٹھانے تنگ
ناہ فرماتے تھے بصری ہی ہو انسان کو ننگ بیس ڈالے گوزمانہ پر نہ چھوڑے اپنا رنگ

بردباری میں بشر مثلِ حنا یا تو ہو

رضی وہ ہے کہ جسکی شان میں یا ہل آئی علم کا ہو جسکے دروازہ علیؑ باہکا
ہسکے اشجار ہوں کی شاہدِ حدیثِ آفتا شیرِ حق دستِ خدا میرِ عربِ مشکلا

یہ لقب جسکے ہوں خویشِ مصطفیٰ ایسا تو ہو

بشمِ الفت جو ڈالی اک نظرِ شبیر نے کر دیا اسرارِ حق سے باخبرِ شبیر نے
پوچھتا پکڑ نہ ہوتا ہاتھ اگر شبیر نے جاچکا تھا خر سوئے دوزخ مگر شبیر نے

راہِ جنت کی بتا دی رہنما ایسا تو ہو

مشکلِ آسان جب کے نام سے ہو بالیقین اسکو کیا مشکل ہے جسکے علیؑ ہوں خود معین
وہ تمنو کی مشکلیں بھی آپ نے آسان کیں پیشِ حیدرؑ کے رہ جائے گرہ ممکن نہیں

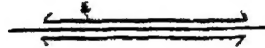
دستِ قاتل کھول دے مشکلا ایسا تو ہو

ٹھہرے مشکل جب علیؑ دائیں نظر ممکن نہیں کھل نہ جائے عقدہ پیچیدہ یہ ممکن نہیں
واں کریں مشکلائی جس جگہ ممکن نہیں پیشِ حیدرؑ کے رہ جائے گرہ ممکن نہیں

دستِ قاتل کھول دے مشکلا ایسا تو ہو

رن میں سرکھواتے تو جا بکے جب خوش تبار کہتے تھے حضرت کہ تیرے فکر ہے پروردگار
 پاچے جس دم شہادت خود امام باوقار بیڑیاں عابذے نہیں تا ہوا مت رستگار
 خلق میں پابند تسلیم و رضا ایسا تو ہو

دکنے کو چرخ و قیاب و حید زار کو سب یہ اے مرزا گوارا ہے و حید زار کو
 اپنے مٹ جانیکا کیا غم ہے و حید زار کو پس لے گردوں جو پیسا ہے و حید زار کو
 چشم بدین میں نہ کھٹکے سرمہ سا ایسا تو ہو



”روح کلام غالب“

اور دیگر ادبی، مذہبی، درسی غرض ہر قسم کی کتابیں
مناسب قیمت پر

طلب فرمائیں

تاجر حضرات کو معقول رعایت دی جائیگی

ملنے کا پتہ

نشریات ادب ایکڈمی

بازار نخاسہ سہارنپور یوپی

بین الاقوامی ادب کا ترجمان

نزدہی ادبی اور معلوماتی جریدہ

ماہنامہ ”دیرو حرم“ سہ ماہی

ہر ماہ اپنے قارئین کو نکھراستھر ادب مثلاً معیاری افسانے، مقالے
فیچر اور بیہودہ نظریں پیش کرتا ہے اور پابندی وقت کے ساتھ شائع ہوتا ہے

آپ بھی مطالعہ فرمائیں

قیمت سالانہ چھ روپے : ایک کاپی ساٹھ پیسے

نمونے کیلئے نشر پیسے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کرنے ضروری ہیں۔

ترسیل زر کا پتہ

منیجر ماہنامہ ”دیرو حرم“ بازار نخاسہ سہارنپور، یوپی

